U9594 P Date- 15-12-09

Title - ADABIYAAT FARSI MEIN HINDUON KA HISSA

Creator - Sayyed Abdullah.

Publisher - Anjuman Taraqqi Urdu (Delhi).

Date - 1942

Pages - 367.

Subjects - Farsi Adab - Tareekh - Hindu Musannefeen; Tazkira Mazameen - Hindu - Farsi Adab; Farsi Adab - Ahad Mughaliya.

[illegible]

[illegible] ([illegible]) ދިވެހިރާއްޖޭ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ([illegible]) ދިވެހިރާއްޖޭ [illegible]

بسلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) نمبر ۱۸۷

ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ

مرتّبہ

ڈاکٹر سیّد عبداللہ ایم ۔اے ڈی لٹ

لیکچرر پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج ۔ لاہور

شایع کردہ

انجمن ترقّی اُردو (ہند)، دہلی

سنہ ۱۹۴۲ء

طبع اول ۱۰۰۰ قیمت مجلد للعہ غیر مجلد سے ر

میں اس ناچیز کوشش

کو

"مغل تہذیب اور شائستگی"

کے نام

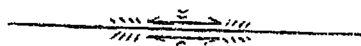
معنون کرتا ہوں

جس کے آثار و برکات کی شاندار داستان کا

ایک باب اس کتابچے

میں

بیان ہوا ہے





تعارُف

"ہندوؤں کا فارسی ادب" میرے اس مقالے کا موضوع تھا جو مَیں نے انگریزی میں ڈی لٹ کے لیے لکھا تھا۔ موجودہ کتاب اسی کا ملخّص ترجمہ ہے۔ ہندستان میں جو فارسی ادب پیدا ہوا اُس کی تاریخ ہنوز نہیں لکھی گئی۔ یہ کتاب جو اس وقت ناظرین کے سامنے پیش کی جارہی ہے۔ اُس وسیع تاریخ کا ایک پہلو ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تمام کوشش ہندستان کی فارسی ادبیات لکھنے والے کو اس مشکل اور طویل کام میں کچھ مدد دے سکے۔

یہ کتابچہ ہندوؤں کی ذہنی ترقیوں اور علمی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس سے مغلوں کی ترقی پذیر، رواداری طرزِ حکومت پر روشنی پڑتی ہے جس کے سایۂ عاطفت میں ہندوؤں کو اپنے دماغی جوہر دکھانے کا موقع ملا اور جس نے ان کے ذہن کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرتے ہوئے اُن میں نئی زندگی پیدا کی۔ اس سرگزشت سے ہمیں بعض تمدّنی اور معاشرتی مسائل کے حل کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ وہ ہندو قوم جسے علّامہ البیرونی بے حد "تنفر دلپسند" اور "خودپسند" کہتا ہے جس کے نزدیک وید مقدّس کے علاوہ کوئی کتاب الہامی اور آسمانی نہیں۔ اور جو اپنے علوم، اپنے کلچر اور اپنی روایات پر اس قدر نازاں ہوتی ہے کہ اپنے سوا سارے عالم کو "ناشایستہ" تصوّر کرتی ہے۔ اب اس کے افراد "مرزا" اور "میاں" کہلانے پر فخر کرتے ہیں شنکر اور کپیلا، تلسی داس اور

رامانج کے اقوال کی بجائے وہ سعدی اور حافظ، خیام اور رومی کے کلمات و اشعار کے ساتھ اپنے کلام کو آراستہ کرتے ہیں۔ تقریباً ہر ہندو مصنف اپنی تحریر کو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے شروع کرتا ہے اور طلبِ توفیق پر ختم کرتا ہے۔ اسلامی مہینوں کی تعظیم کرتا ہے اور مسلمانوں کے طریقوں اور رسموں کی عزت کرتا ہے۔ یہ حقیقت میں ایک محیرالعقول انقلاب تھا جس کی ذمے دار بہت حد تک فارسی زبان کی تعلیم تھی۔ جس کی بے نظیر سادگی، بے مثل رنگینی، دلآویز شیرینی اور حقائق سے لبریز بلاغت نے آہستہ آہستہ ان دماغوں کو متاثر کیا اور ہندستان میں "اسلامی ہندی کلچر" کا ایک ایسا "آمیزہ" تیار کیا جس کی نظیر دنیا میں کم ملتی ہے۔

ہندوؤں نے تین سو سال تک مساجد اور مکاتب میں مسلمان طالب علموں کے پہلو بہ پہلو بیٹھ کر علوم حاصل کیے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ یہ ہندو شائقینِ علم، مسلمان طالب علموں سے گوئے سبقت لے گئے۔ آج سے ایک صدی قبل آرنلڈ صاحب نے جب پنجاب کی تعلیمی حالت کی رپورٹ لکھی تو انھیں معلوم ہوا کہ "مکاتب قرآنیہ" میں مسلمانوں کی بہ نسبت ہندو طلبہ زیادہ شامل ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مستحکم رشتہ تھا جو دونوں قوموں کے درمیان رابطۂ اتصال کا کام دیتا تھا۔ جس نے انھیں باہم شیر و شکر بنا دیا تھا اور جس کی بدولت صدیوں تک ہندو مسلمان بھائیوں کی طرح رہتے سہتے رہے، ہمارے پرانے تعلقات کی یہ خوشگوار داستان شاید موجودہ دور کے ہندو مسلم اختلاف کو رفع کر سکے اور ہندستان کی مختلف اقوام اس "متحدہ کلچر" ہی کو اندرونی اتحاد و یگانگت کا ذریعہ بنا سکیں جس کی داغ بیل عہدِ مغلیہ میں پڑی۔

سر جادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ مغلوں کا راج "کاغذی راج" تھا۔ انھوں نے اس راج کے انتظام کے لیے ایک وسیع بیت الانشا قائم کیا۔

جس کے مختلف فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں ہندو اہلِ قلم اور ادبا مسلمانوں کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ ہندوؤں کے فارسی ادب کی سرگزشت حقیقت میں "مغلوں کے طرزِ حکومت" پر کچھ لکھنے کے لیے ایک مستند اور صحیح ماخذ کا کام دے گی۔

راقم السطور کو اس کتابچے کی ترتیب میں جامع اور بے عیب تحقیق کا دعویٰ نہیں۔ عاجزانہ طور پر صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس مضمون کو اس شکل میں استیعاب کے ساتھ پیش کرنے کی سعی اس سے پہلے نہیں کی گئی۔ جب ۱۹۲۶ء میں میرے مخدوم پرنسپل محمد شفیع صاحب اور اُستادِ محترم پروفیسر محمد اقبال صاحب نے "الفرڈ پٹیالہ اسکالر" کی حیثیت سے مجھ سے اس مضمون پر کچھ لکھنے کی فرمایش کی تو میں دیبی پرشاد سائل کی کتاب "آثارِ شعرائے ہنود" کے سوا کسی ماخذ سے واقف نہ تھا پھر جب اس سلسلے میں میں نے جستجو سے کام لیا تو معلوم ہوا کہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اس موضوع پر ایک طویل سلسلۂ مضامین "معارف" (۱۹۱۸ء) میں سپردِ قلم کر چکے ہیں جنھیں میں نے اپنے لیے ایک مستقل ماخذ کے طور پر استعمال کیا۔ اگرچہ مولانا کے ان مضامین میں مسئلے کے بعض اہم پہلو نظر انداز کر دیے گئے تھے اور تاریخوں اور سنوں کے ضبط و تحریر میں عدم پابندی کے علاوہ ان میں مغلوں سے پہلے کی حالت پر روشنی نہیں ڈالی گئی اور خود کتابوں کی فہرست بہت مختصر اور کتابوں پر تبصرہ و تنقید معمولی ہے۔ تاہم اس امر کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ میں نے ان مضامین سے بے حد مدد لی ہے جس کے لیے میں جناب سید صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان دو ضروری ماخذ کے علاوہ میں نے بعض اور مضامین سے بھی فائدہ

اُٹھایا۔ مثلاً ۱۸۷۱ء میں مسٹر بلوخمن نے کلکتہ ریویو میں "مغلوں کے ہندو ملازمین" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں مجملاً اس بحث کے متعلق بھی کچھ اشارات

ملتے ہیں۔

"ہندستان کی کہانی اپنے مورخوں کی زبانی" مرتبہ ایلیٹ و ڈاؤسن میں بھی ہندو مورخین کے عمدہ اور مفصل حالات لکھے ہیں جن سے پوری پوری مدد لی گئی ہے۔ میں نے اس کتابچے کی ترتیب میں جن جن قلمی اور مطبوعہ کتابوں سے مدد لی ہے اُن کی مفصل فہرست کتاب کے آخر میں شامل کر دی ہے تاکہ مفصل مطالعہ کرنے والوں کے لیے مفید ثابت ہو سکے۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جب میں اصل کتاب (جو انگریزی میں ہے) لکھ چکا اور اس کی بنا پر مجھے ۱۹۳۵ء میں "ڈاکٹر آف لٹریچر" (ڈی لٹ) کی ڈگری مل گئی تو اس کے بعد سید ابن حسن مرحوم کی مشہور تصنیف (CENTRAL STRUCTURE OF THE MUGHAL EMPIRE) بھی نظر سے گزری۔ میرا کتابچہ چھ[6] ابواب پر مشتمل ہے۔ لٹریچر کا ذکر تیسرے باب سے شروع ہوتا ہے۔ پہلے باب میں مغلوں سے پہلے کی حالت اور دوسرے باب میں اکبری عہد کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ ہر باب کی ابتدا میں ادب کے ذکر سے پہلے تاریخی تمہید لگا دی گئی ہے جس میں مختلف مغل بادشاہوں کی علمی سرپرستیوں اور ہندوؤں کے ساتھ اُن کے حسن سلوک کا ذکر ہے جو فہرست میں نے یہاں ہندو ادب کی پیش کی ہے اس کے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ دور افتادہ گوشوں کو ٹٹولنے یا گمنام کتب خانوں کو کھنگالنے سے مزید کتابیں بھی مل جائیں لیکن اب تک مجھے جو کچھ مل سکا میں نے اس کا ضروری حصہ شامل کر لیا ہے۔ ہر کتاب پر تنقید نہیں کی گئی صرف چیدہ اور اہم تصنیفات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ حوالے نہایت پابندی کے ساتھ دیے گئے ہیں تاکہ رجوع کرنے میں دقت نہ ہو۔ اس سے قبل اس کتاب کے بعض حصے اورنٹیل کالج میگزین اور بعض اور رسائل میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اب میں ان سب کو یکجا کرتے ہوئے

ایک نئی ترتیب کے ساتھ اہلِ ملک کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اُمید کہ میری غلطیوں سے درگزر کرتے ہوئے میری سعی اور کوشش کی داد دی جائے گی ؎

گر بہم بر زدہ بینی خط من عیب مکن　　　　که مرا محنت ایام بہم بر زدہ است

اس تمہید کے ختم کرنے سے پہلے میں اپنے مخدوم پرنسپل محمد شفیع صاحب ایم۔اے (کینٹب)، استاد محترم پروفیسر محمد اقبال صاحب ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی اور اُستاد مکرم حافظ محمود خاں صاحب شیرانی سابق پروفیسر پنجاب یونیورسٹی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی فرمایش سے میں نے اس کتاب کو شروع کیا اور اُن کی توجہ، افادہ اور رہنمائی سے تکمیل تک پہنچایا۔ نیز قبلہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس کتابچے کو انجمن کی مطبوعات میں شامل کرنے کی منظوری عطا فرمائی۔

سید محمد عبداللہ



مفصّل فہرستِ مضامین

تعارف

پہلا باب عہدِ مغلیہ سے قبل

دوسرا باب عہدِ اکبری

تیسرا باب　از جہاں گیر تا فرخ سیر

چوتھا باب　مغلوں کا انحطاط (۱۱۲۴ھ تا ۱۲۲۱ھ)

پانچواں باب از ۱۲۲۱ تا عہدِ حاضر

چھٹا باب ۲۳۱ — نظرِ بازگشت

تصویروں اور عکسوں کی فہرست

پہلا باب



مُغلوں سے پہلے

پہلا باب
عہدِ مغلیہ سے قبل

ہندستان اور ایران کے تعلقات سنہ ۵۰۰ قبل مسیح سے چلے آتے ہیں۔ ایرانی بادشاہوں میں سے دارا نے سب سے پہلے سندھ کو فتح کیا تھا۔ ایرانیوں کی حکومت سندھ پر ۳۲۵ ق م تک رہی۔ موریہ حکومت کے زمانے میں ایران کا ہندستان پر گہرا اثر پڑا۔ چنانچہ رسوم و رواج اور دیگر اوضاعِ زندگی میں زبردست مماثلت نظر آتی ہے۔ اسلام سے قبل عربوں کے بھی ہندستان کے ساحلی علاقوں کے ساتھ تجارتی تعلقات تھے لیکن عرب اور ہندستان کا سیاسی تعلق اسلام کے بعد قائم ہوا۔

سندھ پر عربوں کی حکومت

محمد بن قاسم نے ۱۲-۷۱۱ء میں ہندستان پر حملہ کیا۔ اس کے بعد تین صدیوں تک سندھ پر عربوں کی حکومت رہی اور یہ علاقہ مسلمانوں کی عظیم الشان حکومت کا جزو بنا رہا۔ جس کا مرکز پہلے دمشق اور پھر بغداد تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں سندھیوں اور عربوں کے درمیان زبردست سیاسی، تمدنی اور معاشرتی اختلاط ہوا۔

عباسیوں کے زمانے کی عربی کتابوں میں سندھ کے اہلِ علم و اربابِ قلم کے نام ملتے ہیں۔ مسلمان سندھیوں کے علاوہ ہندو علما، فضلا، حکما اور اطبّا دربارِ بغداد

---

[1] "عرب و ہند کے تعلقات" از سید سلیمان ندوی۔

میں اعلیٰ مناصب پر فائز تھے۔ جہاں وہ ترجمہ اور طب[1] کی خدمات انجام دیتے تھے۔ یہ علمی تعلقات اس وقت منقطع ہوئے جب ہندو فلسفہ و حکمت کی جگہ یونانی علوم نے لے لی اور سندھ پر خلافت کے اقتدار کے کم ہونے کی وجہ سے باہمی معاشرتی اور سیاسی روابط میں بھی کمی پیدا ہو گئی۔

صفاریوں کا حملہ

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں سندھ کا ملک بہت جلد خلافت سے منقطع ہو کر خود مختار ہو گیا۔ اگرچہ شمال کی طرف سے وقتاً فوقتاً حملے ہوتے رہتے تھے تاہم گیارھویں صدی عیسوی تک یہاں آزاد اسلامی حکومتیں اور ریاستیں قایم رہیں۔ تیسری صدی ہجری (۱۱ ص ع) میں صفاریوں نے سندھ کو فتح کر لیا۔ یہ ایرانی تھے۔ گویا ان کے حملے نے عہدِ اسلامی میں سب سے پہلے ہندوؤں کو ایک فارسی بولنے والی قوم سے میل جول کا موقع دیا۔ ابن حوقل[2] اور اصطخری کے قول کے مطابق صفاریوں کے زمانے میں ملتان اور منصورہ کے لوگ عربی اور سندھی زبان بولتے تھے اور مکرانی لوگ فارسی اور مکرانی زبان بولتے تھے۔

سندھ میں ۳۲۹ھ کے قریب ایک شاعر عورت پیدا ہوتی ہے۔ جس کا نام رابعہ بنت کعب القصداری ہے۔ قصدار یا قزدار، علاقہ توران[3] (جسے اب بلوچستان کہتے ہیں) کا دارالخلافہ تھا۔ یہ واقعہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اُس زمانے میں سندھ اور بلوچستان میں فارسی کا اچھا خاصا رواج تھا اور قیاس غالب

---

[1] سخاؤ۔ البیرونی "انڈیا" دیباچہ: ایلیٹ۔ تاریخ ہندستان۔ ج ۵۔ ص ۵۷۲۔

[2] ابن حوقل۔ ص ۲۳۲۔ اصطخری (ایلیٹ۔ ج ۱۔ ص ۲۹) ایلیٹ نے یوں ترجمہ کیا۔ "ملتان کے لوگ شلوار یں پہنتے ہیں اور فارسی اور سندھی بولتے ہیں" یہ صحیح نہیں۔

[3] لی سٹرینج۔ لینڈز آف دی ایسٹرن کیلیفیٹ۔ ص ۳۳۱۔ ۳۳۳۔

ہی کہ ہندو لوگ اس رواجِ عام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے ہوں گے۔ اگرچہ اس قیاس آرائی کے لیے ہمارے پاس کوئی ٹھوس شہادت موجود نہیں۔

محمود غزنوی سے لے کر اکبر کے زمانے تک

ہندستان میں بڑی اسلامی فتوحات کا سلسلہ درحقیقت محمود غزنوی کے حملوں کے ساتھ شروع ہوتا ہی۔ اس وقت سے لے کر اکبر کی دوٗر تک (یعنی تقریباً چھ سو سال) بجز چند مستثنیات کے ہندوؤں میں فارسی تعلیم کا عام رواج نہیں ہوا۔ ایک خاندان کے بعد دوسرا خاندان تختِ حکومت پر متمکن ہوتا چلا آتا ہی لیکن تاریخ کے اوراق اس اہم بحث پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں۔ اور یہ تمام دوٗر تاریکی اور عدم واقفیت کا دوٗر معلوم ہوتا ہی بعض دلائل کی بنا پر جن کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس طویل زمانے میں ہندوؤں نے فارسی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی۔ البتہ بعض حکومتوں نے اپنے اپنے عہد میں اس اہم سیاسی ضرورت کی جانب کچھ نہ کچھ التفات کیا اور ہندوؤں میں ایک قلیل سی جماعت ہر زمانے میں ایسی موجود رہی ہی جو فارسی سے واقف تھی۔ مثلاً اسلامی درباروں میں ہندو ملازمین اور منصبدار فارسی ضرور جانتے ہوں گے۔ اس عہد کے ہندی لٹریچر میں فارسی الفاظ اور محاورات کی کافی آمیزش ہی۔ خیال، ریختہ، جنگلہ (زنگولہ) وغیرہ اصطلاحات ہندی موسیقی میں اُسی زمانے میں شامل ہوئیں۔ بعض مسلمان بادشاہوں نے اپنے زمانے میں ہندوؤں میں فارسی کو رواج دینے کی خاص کوششیں کیں جن کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ کیا جاتا ہی۔

غزنوی عہد

اصل موضوع پر کچھ لکھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہی کہ محمود کے کیریکٹر اور اس کے طرزِ حکومت کے متعلق بعض امور کی

طرف اشارہ کیا جائے۔ محمود کو عموماً "بت شکنی" کے لیے بدنام کیا جاتا ہے لیکن اس کے عہد میں مذہبی بے تعصّبی اور رواداری کے بعض ایسے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں جن سے انکار کرنا مشکل ہے۔ محمود ایک فاضل شخص تھا اور اس کے دربار میں ہر فرقے اور ہر مشرب کے لوگ امن و احترام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ البیرونی کو لیجیے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی عمر کا معتدبہ حصّہ ہندوؤں کے علوم سیکھنے اور اُن کے بعض عقاید کی توضیح و تشریح میں بسر کیا۔ لیکن محمود اُن کی سرپرستی سے دریغ نہیں کرتا۔ ڈاکٹر سخاؤ[1] لکھتا ہے کہ "اگر سلطان متعصب ہوتا تو البیرونی کی سرپرستی اور قدر افزائی کبھی نہ کرتا۔"

محمود اور اس کے جانشینوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کے درباروں میں ایک زبردست ہندو عنصر نظر آتا ہے۔ فرشتہ[2] لکھتا ہے کہ اس زمانے میں غزنی ہندستان کا ایک حصّہ معلوم دیتی تھی اس لیے کہ ہندو وہاں بکثرت موجود تھے۔ بیہقی[3] اپنی تاریخ میں کئی جگہ ہندو افواج اور ہندو افسروں کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ غزنی کے وزیر نے ان ہندوؤں یا ہندستانیوں کے ساتھ معاملات کی آسانی کے لیے ایک ترجمان مقرر کیا[4]۔ محمود کی وفات پر مسعود اور محمد کے درمیان جو جنگ چھڑی اُس میں مسعود نے ناتھ نامی ایک ہندو افسر کو ایک باغی سردار کی سرکوبی کے لیے متعیّن[5] کیا۔

---

[1] بیرونی۔ انڈیا (سخاؤ) ص ۲۵۰، ۲۶۹

[2] فرشتہ۔ ص ۲۸۔

[3] بیہقی ص ۵۰۳

[4] بیہقی۔ ص ۵۰۴۔ فرشتہ ص ۴۴، بدایونی ج ۱ ص ۲۰ میں سندر نامی ایک جرنیل کا ذکر کیا ہے۔

[5] ایلیٹ۔ ج ۲ ص ۶۰

تلک بن جے سین حجّام غزنوی عہد کے ایک ہندو افسر کا خاص طور پر ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو بلحاظ علم و فضل اور بہ اعتبار شہرت و قابلیت اپنے سب ہم مذہبوں سے گوئے سبقت لے گیا تھا۔

تلک بن جے سین[1] دراصل حجّام تھا جو ذاتی خوبیوں کی وجہ سے خواجہ احمد حسن میمندی کا پرائیوٹ سکریٹری بن گیا۔ وہ حسین و جمیل آدمی تھا۔ خدا نے اُسے گفتگو کی استعداد بخشی تھی، لکھنے میں بہت مشّاق تھا۔ کہتے ہیں ہندی کے علاوہ فارسی بھی اچھی طرح لکھ لیتا تھا۔ امیر مسعود نے اُسے ہندی فوج کا سپہ سالار بنا دیا۔ اس کے دروازے پر نوبت بجتی تھی اور اُسے اعزاز کے طور پر "شاہی خرگاہ" حاصل تھی بیہقی[2] لکھتا ہے کہ تلک نے کشمیر میں سحر کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ بہت ذکی اور ہوشیار آدمی تھا اور اپنے فرائض دبیری و ترجمانی کو نہایت عمدگی سے انجام دیتا تھا۔

قیاس کہتا ہے کہ تلک فارسی سے بخوبی واقف ہو گا کیونکہ "دبیری" اور "ترجمانی" کے فرائض بجا لانے پڑتے تھے جس کے لیے زبان پر قدرت اور تحریر میں مہارت کی بیحد ضرورت تھی۔

اسی طرح غزنوی دربار کے اور ہندو منصبدار مثلاً سُندر، بجے رائے، ناتھ اور دیگر ہزارہا سپاہی اور ملازم بھی فارسی میں بول چال کی قدرت ضرور رکھتے ہوں گے۔

---

[1] طبقات اکبری میں اس کا نام ملک بن جے سین لکھا گیا ہے۔ نیز ایلیٹ۔ ج ۲۔ ص ۶۰ بعض کتابوں میں تو لک بن حسین لکھا ہے۔ نیز دیکھو لین پول، میڈیول انڈیا۔

[2] بیہقی ص ۵۰۳

شمالی ہند پر فارسی کے اثرات اس عام اختلاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزنوی عہد میں ہی شمالی ہندستان میں فارسی زبان کا اچھا خاصا چرچا ہوگیا اور اسی زمانے میں فارسی کے اچھے اچھے شاعر پیدا ہونے لگے۔ عوفی اپنے تذکرہ لباب الالباب[1] میں غزنی اور لاہور کے شعرا کے ذکر کے لیے ایک مستقل فصل مخصوص کرتا ہے۔ بلاشبہ شعرا کی اس فہرست میں ہمیں کسی ہندو شاعر کا تذکرہ نہیں ملتا۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حکمران قوم کی اس علمی زبان کا عوام پر ضرور اثر پڑا ہوگا۔ اسی زمانے میں ایک ایسی "زبان" پیدا ہوتی ہے جو آگے چل کر مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ زبان بنتی ہے۔ اس نئی زبان کی سرپرستی اور ترقی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نام دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں میں ہندی کا پہلا شاعر مسعود سعد سلمان[2] بھی غزنوی دور میں گزرا ہے جس نے ہندی، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں ایک ایک دیوان چھوڑا ہے۔

آج مسعود سعد سلمان کا ہندی دیوان موجود نہیں۔ اس لیے ہم اس "ہندی" کی صحیح کیفیت اور اس میں فارسی کی آمیزش کے متعلق بالیقین کچھ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ غوریوں کے عہد کی ایک تصنیف[3] بہت بگڑی ہوئی صورت میں اب تک محفوظ ہے۔ اس کا نام پرتھوی راج راسا ہے۔ بقول ٹاڈ صاحب یہ پرتھوی راج کی تاریخ ہے جس کا مصنف "چاند کوی" تھا۔

---

[1] لباب الالباب۔ ج ۲ باب ۱۰۔

[2] لباب الالباب ص ۲۴۷۔ خزانۂ عامرہ ص ۱۴، ۱۵۔ پنجاب میں اردو ص ۳۷۔

[3] گریرسن "لٹریچر آف ہندستان"۔ پروفیسر شیرانی اس کتاب کے اصلی ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ دیکھو پنجاب میں اردو ص ۱۲۔ نیز پروفیسر صاحب کے مضامین اورنٹیل کالج میگزین میں۔

محققین کے درمیان اس کتاب کی صحت کے متعلق زبردست اختلاف موجود ہے۔ فاضل اجل پروفیسر شیرانی صاحب نے اس کے جعلی ہونے کے بارے میں زبردست دلائل پیش کیے ہیں۔ جو کتاب ہمارے پاس موجود ہے اس کی زبان بیحد مشکل اور ناقابلِ فہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک اس کا کوئی صحیح اور مکمل ترجمہ نہیں ہو سکا۔ سر چارلس لائل[1] کے نزدیک (جو راسا کو جعلی نہیں مانتے) اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند کے آبا و اجداد لاہور کے رہنے والے تھے جو ایک سو ستر سال سے اسلامی حکومت کا مرکز چلا آتا تھا۔ چونکہ یہاں فارسی زبان کا عام رواج تھا۔ بنا بریں چاند کی ہندی میں فارسی کی اچھی خاصی آمیزش ہے چنانچہ فارسی سے ناواقف مترجمین کو اس کے سمجھنے میں دقتیں پیش آتی ہیں۔

سکندر لودھی کی کوششیں غزنوی عہد کے بعد ہم براہ راست سکندر لودھی کے زمانے میں آجاتے ہیں۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اس بادشاہ کے عہد میں ہندوؤں میں فارسی تعلیم کے پھیلانے کی پہلی مؤثر کوشش ہوئی۔ افسوس ہے کہ ہمیں اس اہم اور نتیجہ خیز واقعے کے مفصل حالات معلوم نہیں جو ہمارے موجودہ نقطۂ نگاہ سے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

مؤرخ فرشتہ[2] کا بیان ہے کہ "ہندوؤں نے اس عہد میں فارسی کی جانب توجہ منعطف کی۔ اس سے قبل انھوں نے اس کی طرف اقدام نہیں کیا تھا۔"

کاش فرشتہ یا کوئی اور مؤرخ اس انقلاب انگیز سانحے یا واقعے کے اسباب و اثرات پر کچھ بحث کرتا! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد ہندوؤں میں ایک فارسی داں طبقہ پیدا ہو گیا تھا جن میں سے بعض صحیح معنوں میں علم و فضل کے

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ ج ۱۳۔ ص ۴۸۲

[2] فرشتہ۔ ج ۱۔ ص ۱۸۷

مالک تھے۔ مثلاً بدایونی[۱] نے برہمن نام ایک ہندو شاعر کا ذکر کیا ہے جو اس عہد میں فارسی، عربی کتابوں کا درس دیا کرتا تھا اور فارسی زبان میں شعر کہا کرتا تھا۔ اس کا ذیل کا شعر اس کی سخنوری کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے:۔

دل خوں نشدے چشم تو خنجر نشدے گر　　رہ گم نشدے زلف تو ابتر نشدے گر

بعض اردو کتابوں میں سکندر لودھی کی اس اسکیم کے متعلق ایک کہانی بھی درج ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ سکندر لودھی کو کچھ ہندو ملازمین کے تقرر کا خیال پیدا ہوا۔ اس نے ہندوؤں کو اپنے حضور میں بلایا اور پوچھا تم میں سے کوئی فارسی جانتا ہے؟ سب نے نفی میں جواب دیا۔ اس نے برہمنوں کو حکم دیا کہ وہ فارسی زبان سیکھیں لیکن انھوں نے انکار کیا۔ پھر اس نے راجپوتوں کو یہی حکم دیا۔ انھوں نے بھی اس سے پہلو تہی کی۔ علیٰ ہٰذا القیاس ویش بھی آمادہ نہ ہوئے۔ ہندوؤں میں صرف کایستھ نکلے جنھوں نے سلطان کے ارشاد کی تعمیل کی اور فارسی میں مہارت حاصل کرتے ہوئے سرکاری مناصب پر فائز ہو گئے۔ معلوم نہیں یہ قصہ کس حد تک درست ہے لیکن یہ صحیح ہے کہ مغلوں کے زمانے میں شاہی ملازمتوں میں کایستھوں کا غلبہ تھا اور ہندو مصنفین میں بھی اس قوم کے لوگوں کی اکثریت تھی مگر یہ بات صحیح نہیں کہ سکندر لودھی سے پہلے ہندو سرکاری ملازمتوں میں موجود نہ تھے۔

سلطان زین العابدین اور برہمنانِ کشمیر کشمیر کی ہندو سلطنت رنچو شاہ کے عہد میں اختتام پذیر ہو گئی۔ جس نے بلبل شاہ کی تلقین سے اسلام قبول کر لیا تھا۔ سلطان سکندر کے زمانے

---

۵۱ ج ۲۔ ص ۳۲۳۔ کہتے ہیں کہ اس ہندو شاعر کا نام پنڈت ڈونگر مل تھا۔

۵۲ امرائے ہنود۔ ص ۱۳۵۔ تاریخ ذکاء اللہ۔ ج ۲۔ ص ۳۷۸۔ معارف ۱۹۱۸

میں ہندوؤں کو کچھ مصائب کا سامنا کرنا پڑا" سیاہ بٹ" نامی ایک ہندو وزیر کے ایما پر سکندر نے برہمنوں کو بہت ایذائیں دیں جس کی وجہ سے اس کا نام ہی "بت شکن" پڑ گیا۔ جب سکندر کے بجائے شاہی خان نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی (تو ہندوؤں کے حق میں ایک خوشگوار تبدیلی واقع ہوئی) یہی وہ عظیم الشان اور نامور بادشاہ تھا جو تاریخ میں سلطان زین العابدین[51] کے نام سے مشہور ہے (تخت نشینی ۸۲۶ھ ۔ ۱۴۲۲ء) وہ نیک دل، فیاض، صاحب علم اور اہلِ کمال کا قدردان تھا۔ اس کے دربار میں ہندو اور مسلمان علما کا ہجوم رہتا تھا جن سے اکثر علمی مضامین پر مبادلۂ خیال کیا کرتا تھا۔ اسے موسیقی کے ساتھ خاص دلبستگی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دربار میں ہندستان کے اطراف واکناف سے اچھے اچھے موسیقی داں جمع ہو گئے تھے۔ اس نے بہت سے تعمیری کام کیے اور علم وادب کی بہت سی خدمات انجام دیں۔ اس کے حکم سے بہت سی سنسکرت کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ اس کی رواداری اور بے تعصبی کا یہ عالم تھا کہ اس نے "سیاہ بٹ" کے ظلم وستم سے تکلیف اٹھائے ہوئے تمام ہندوؤں کی استمالت اور دلجوئی کی اور خارج از وطن ہندوؤں کو واپس بلایا۔ اس نے حکم دیا کہ کسی شخص کو بر بنائے مذہب تکلیف نہ دی جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل ہوئی۔

کشمیری برہمن اور فارسی

سلطان زین العابدین کے احکام اور واقعاتِ سلطنت میں یہ امر خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے کشمیر کے ہندوؤں میں فارسی زبان کو رائج کیا۔ پنڈت کاچرو کی کتاب مجمع التواریخ[52] میں ایک عجیب قصہ درج ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان

---

[51] طبقات اکبری ۔ ص ۶۰۳ ؛ فرشتہ ۔ ج ۲ ۔ ص ۳۴۲ تا ۳۴۴ ؛ آئین اکبری ۔ ص ۵۸۳

[52] مجمع التواریخ (قلمی پنجاب یونیورسٹی لائبریری) ق ۸۱

زین العابدین نے ایک ہندو فقیر کی کرامت سے متاثر ہو کر ہندوؤں کے ساتھ تمدّنی رشتہ مضبوط کرنا چاہا۔ جس کے لیے سلطان نے یہ تدبیر نکالی کہ ہندوؤں کو فارسی زبان سے روشناس کیا جائے تاکہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ایک مضبوط تعلق قایم ہو جائے۔ یہ تدبیر بہت کارگر ثابت ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں میں ہندو فارسی زبان سے واقف ہو گئے یہی مصنّف لکھتا ہے کہ اس عہد سے وہ ہندو جو اپنی درویشی اور مذہبی دیانت کے لیے مشہور تھے علوم فارسی میں طاق ہونے لگے۔ اس کے علاوہ فارسی کی ایک اور کتاب مہاتمنی کشمیرہ منڈل میں بھی اس قسم کا واقعہ درج ہے لیکن یہ سب قصّے تاریخ کے نقطۂ نگاہ سے لائقِ اعتنا نہیں۔

سپرؤ

یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ سب سے پہلے کشمیری ہندوؤں کی کس جماعت نے فارسی کی جانب توجہ کی۔ مہاتمنی کشمیرہ منڈل[1] کے بیان کے بموجب "سپرؤ" پنڈتوں نے پہلے پہل اس میدان میں قدم رکھا۔ سپرؤ دو الفاظ سے مرکب ہے "سب پرؤ" جس کے معنی ہیں "سبق پڑھنا" یعنی "فارسی کا سبق پڑھنا"۔ لارنس (مصنّف اقوامِ کشمیر) کے بیان کے مطابق سلطان پنڈتوں نے پہلے پہل "سلاطین" اسلام کے ساتھ تعلقات قائم کیے جس کی وجہ سے ان کا نام "سلطان" پڑ گیا۔ یہ دلیل وزنی نہیں کیونکہ بعض اور ذاتیں بھی ایسی ہیں جن کے نام اسلامی اثرات کے حامل ہیں۔ مثلاً کارکن، رازداں، منشی، فوطہ دار وغیرہ۔ بہرحال یہ مسلّم ہے کہ سلطان زین العابدین (بڈشاہ) کے زمانے میں کشمیر کے ہندوؤں میں فارسی تعلیم کا آغاز ہوا۔

کشمیر کے بعض اہلِ علم

قرینِ قیاس ہے کہ کشمیری پنڈتوں نے سب سے پہلے اقدام کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ابتدائی

---

[1] (مملوکہ پروفیسر شیرانی صاحب) نیز گلزارِ کشمیر از کرپارام۔ ص ۱۶۷

زمانے میں ان لوگوں میں کوئی قابلِ ذکر نامور مصنّف نہیں پیدا ہوا۔ البتّہ "بٹ" قوم میں ہمیں ایک شخص ملتا ہے جو صاحبِ تصنیف مانا جاتا ہے۔ یہ شخص "بودی بٹ" تھا جو فرشتہ کے بیان کے مطابق شاہنامہ کا حافظ تھا اور اسے نہایت خوش الحانی سے پڑھ سکتا تھا۔ "بودی بٹ" نے "زین" نامی ایک کتاب علمِ موسیقی میں لکھی جو سلطان زین العابدین کی طرف منسوب ہے۔ یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ یہ رسالہ فارسی میں تھا یا کسی اور زبان میں؟ لیکن لفظ زین سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاید فارسی ہی میں ہوگا۔ کیونکہ بودی بٹ فارسی میں کافی مہارت رکھتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اُس نے شاہنامے کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ اگرچہ اس بیان کی تصدیق کسی مستند تاریخ سے نہیں ہوتی۔

اسی زمانے میں "سوم" نامی ایک اور مصنّف تھا جو "ہندوی" اور کشمیری میں اشعار کہتا تھا۔ اس نے سلطان کے زمانے کی ایک تاریخ لکھی ہے جس کا نام "زین چرتر" تھا۔ غالباً اس کتاب کی زبان فارسی نہ تھی[1]۔

بہرحال کشمیری ہندوؤں نے سلطان زین العابدین کے زمانے سے فارسی کی طرف توجہ کی اور رفتہ رفتہ ان کا درجہ کائستھوں کے مساوی ہو گیا۔ چنانچہ مغلوں کے زمانے میں یہ قوم بھی اپنے اعلیٰ کلچر، فارسی دانی اور تہذیب کے لیے بہت مشہور رہی۔

سکندر لودھی کے بعد اب ہم پھر کشمیر سے ہندستان کی طرف لوٹتے ہیں۔ سلطان سکندر نے اپنے عہدِ سلطنت میں جس ذہنی انقلاب کی داغ بیل ڈالی اس کا نقش ہندوؤں کے ذہن و فکر پر بہت گہرا

---

[1] مولانا محمد دین فوق کشمیر کی مفصّل تاریخ لکھ رہے ہیں۔ اُن سے معلوم ہوا کہ زین چرتر فارسی میں نہیں۔

پڑا۔ بلوخمن[۱] اس واقعے پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "فارسی زبان ۱۶ صدی عیسوی تک ہندوؤں کے اعلیٰ طبقات میں بھی پھیل گئی تھی"۔ لیکن فارسی میں دست رس شاید بول چال اور معمولی تحریر و تقریر تک ہی محدود معلوم ہوتی ہے کیونکہ اکبر کے زمانے سے پہلے ہمیں ہندوؤں کی کوئی فارسی تصنیف نہیں ملتی۔

گورو نانک گورو نانک[۲] لودھیوں کے آخری زمانے کے بزرگ ہیں آدی گرنتھ (محلہ اول) میں جو گورو نانک کی تصنیف ہے، فارسی کی آمیزش ہے، یہ مسئلہ کہ گورو نانک فارسی جانتے تھے یا نہیں متنازع فیہ ہے لیکن آدی گرنتھ کی فارسی سے جو کچھ مستفاد ہوتا ہے وہ صرف اتنا ہی ہے کہ آپ فارسی کے عالم تو نہ تھے لیکن مسلمان علما و فضلا کے ساتھ عام میل جول کی وجہ سے اور اس عہد میں عوام کی بولی میں فارسی کی بکثرت آمیزش کی بنا پر آپ کی ہندی (یا پنجابی میں) فارسی الفاظ بافراط موجود ہیں۔ گرنتھ صاحب میں ہمیں کچھ اشعار بھی ملتے ہیں جو خالص فارسی میں ہیں۔ اُن سے بھی اتنا ہی پتہ چلتا ہے کہ گورو نانک فارسی سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور رکھتے تھے لیکن عالمانہ واقفیت کا ان اشعار سے اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ایک دو اشعار یہاں اس غرض کے ساتھ لکھے جاتے ہیں کہ گرنتھ صاحب کے اس قدیم حصّے کی زبان کی نوعیت پر کچھ روشنی پڑ سکے:۔

صدق کر سجدہ من کر مقصود   جید ھر دیکھا تید ھر موجود

قدرت ہے قیمت نہ پائے   جا قیمت پائے کہی نہ جائے

پیر پیکامبر سالک صادق شہدے اور شہید   شیخ مشائخ قاضی ملا اور درویش شہید

---

[۱] کلکتہ ریویو (۱۸۷۱) ص ۳۲۱

[۲] اس مضمون پر اورینٹل میگزین ۱۹۲۸ء میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے (دیکھو اس کتاب کا ضمیمہ الف)

گرنتھ صاحب (محلّہ اول) کے یہ اشعار ظاہر کرتے ہیں کہ گرونانک کے زمانے میں عوام کی زبان میں اسلامی الفاظ کی زبردست آمیزش ہو چکی تھی۔ کبیرا اور دوسرے ہندی شعرا کا کلام بھی اس کی تائید کرتا ہے۔[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سکندر لودھی کے بعد ہندوؤں کے ایک گروہ میں فارسی زبان کی تعلیم کا سلسلہ اکبر کے زمانے تک مسلسل جاری رہا۔ چنانچہ جب اکبر کے عہد میں راجہ ٹوڈرمل نے ہندی کی بجائے فارسی کو دفتری زبان قرار دیا تو اس تبدیلی پر ہندوؤں میں کوئی اضطراب پیدا نہیں ہوا۔ حالانکہ اس اقدام عمل سے ہندوؤں کے مفاد کو نقصان پہنچا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تعلیم یافتہ ہندوؤں کی ایک جماعت ضرور موجود ہوگی جس نے فی الفور اس تبدیلی سے فایدہ اُٹھایا اور ہندی کی بجائے فارسی میں کام کرنا شروع کر دیا۔ ٹوڈرمل خود بھی فارسی میں مناسب استعداد رکھتا تھا۔ وہ اکبر کا درباری بننے سے پہلے شیر شاہ کا ملازم تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سوریوں کے زمانے میں بھی ہندوؤں کے ایک طبقے میں فارسی کی تعلیم موجود تھی۔

اسلامی معاشرت کا اثر ہندوؤں کی زبان اور کلچر پر | شمالی ہندستان میں مغلوں سے پہلے

کی تاریخ میں ہمیں صرف اتنی ہی شہادتیں دستیاب ہو سکی ہیں جن سے ہم ہندوؤں میں فارسی تعلیم کی حالت کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں لیکن یہ مستثنیات ہیں اور یہ کہنا غلط نہیں کہ ہندوؤں نے بہ حیثیت مجموعی مغلوں سے پہلے فارسی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی۔[2] اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندو مسلمانوں

---

[1] ملاحظہ ہو ڈاکٹر تاراچند کی انگریزی کتاب IN FLUENCE OF ISLAMON INDIA CULTUSE

[2] ملاحظہ ہو۔ ایشوری پرشاد کی انگریزی تاریخ HISTORY OF ISLAMIE IN INDIA

میں معاشرتی اور مذہبی میدانوں میں بہت بڑی حد تک اختلاط پیدا ہو گیا تھا۔ ہندو مسلمان مذہبی رنگ میں مذہبی پیشواؤں کا باہمی اثر قبول کر رہے تھے اور ہندو باقاعدہ مسلمان بادشاہوں کی فوجوں اور درباروں میں ملازم ہوتے تھے۔ فرشتہ[1] کا بیان ہے کہ محمد تغلق کے زمانے سے پہلے ہندو مسلمانوں کی ملازمت قبول نہ کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ قول صرف برہمنوں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں پر صادق آتا ہے۔ باقی ہندوؤں کو اس سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیے کیونکہ اوائل عہدِ اسلام سے مالگزاری کا محکمہ ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا چونکہ اس معاملہ خاص میں مسلمانوں نے ہندو طرزِ انتظام کی پیروی کی تھی اس لیے تمام مالیانی کام ہندی میں انجام پاتا تھا اور اس محکمے کے بعض عہدہ داروں کے پرانے نام اب تک قائم ہیں مثلاً پٹواری وغیرہ۔ (مورلینڈ۔ اگریرین سسٹم آف دی مغلز۔ بحوالہ انڈکس) عہد غزنویہ کے ہندو سپہ سالاروں اور جرنیلوں کا اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ امیر خسرو نے قران السعدین میں راوت، پایک اور دہانک کا متعدد مقامات پہ ذکر کیا ہے جو ہندو ملازموں کے ہندوانہ القاب ہیں۔ جنگ زنتھنبور میں سلطان علاء الدین خلجی[2] کی جان ایک جاں نثار ہندو ہی نے بچائی تھی۔ ابن بطوطہ نے رتن نامی ایک حساب داں ہندو کا ذکر کیا ہے جس کی فہم و فراست کی وہ بہت تعریف کرتا ہے۔ خان جہان (باپ اور بیٹا دونوں اس لقب سے ملقب تھے) فیروز تغلق کے معتمدین خاص میں سے تھے۔ بابر[3] جب ہندستان میں وارد ہوتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ ہندستان میں تمام عامل، منشی، تاجر اور کارگزار ہندو ہیں۔

---

[1] ج ۱۔ ص ۲۸۷

[2] برنی۔ ص ۲۸۲، ۲۸۳

[3] بابر نامہ ص ۲۰۴ (ارسکن۔ ص ۲۳۲)

شیخ عبدالقدوس گنگوہی[1] اپنے ایک خط میں بابر سے درخواست کرتے ہیں کہ اس صورتِ حالات کا خاتمہ کیا جائے یعنی ان ملازمتوں میں کچھ حصّہ مسلمانوں کو بھی دیا جائے سلطان اسلام شاہ سور[2] کے زمانے میں گکھڑوں نے فوج کو بہت تکلیفیں دیں سپاہی ان مصائب کو برداشت کرتے جاتے تھے اور ازراہِ خوف اسلام شاہ کے سامنے اپنا حال نہ بیان کرتے تھے شاہ محمد فرملی جو اپنے زمانے کے زبردست ظریف تھے بادشاہ کے پاس گئے اور سارا قصہ ان الفاظ میں کہہ سنایا۔ "اے بادشاہ! میں نے تین کیسہ ہائے زر کو آسمان سے اترتے دیکھا۔ ایک میں سونا، دوسرے میں کاغذ اور تیسرے میں خاک تھی۔ سونا ہندو دفتریوں کے قبضے میں چلا گیا۔ خاک سپاہ کے حصے میں آئی اور کاغذ حکومت کے خزانے میں محفوظ ہو گئے۔ اس گفتگو سے بادشاہ بہت متاثر ہوا اور اس نے صورت حالات کو بہتر بنانے کا وعدہ کیا۔ اس حکایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس عہد میں دفاتر میں ہندو بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔ لہٰذا مسلمانوں کی ملازمتوں میں ان کی موجودگی سے انکار کرنا تاریخی حقائق سے چشم پوشی کے مرادف ہے۔

سلاطینِ دکن اور ہندو اب دکن کی طرف آئیے۔ وہاں بھی شاہی ملازمتوں میں ہندو بکثرت موجود تھے۔ کریل، تاریخ دکن (ج ا۔ ص ۴۲) میں لکھتا ہے:۔

"کہتے ہیں کہ گانگو پہلا برہمن تھا جو مسلمانوں کے حلقۂ خدمت میں شامل ہوا۔ یہ بیان صحیح ہو یا غلط، یہ یقینی بات ہے کہ یہ آخری ہندو نہ تھا جو مسلمان دربار میں شامل ہوا۔ کیونکہ آنے والی دو صدیوں کے اندر دکن میں یہ ایک دستور بن گیا تھا کہ بادشاہ اور امرا برہمنوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا کرتے تھے۔

---

[1] مکتوبات [2] بدایونی۔ ج ۱۔ ص ۳۰

یہ بہ حیثیت حکمتِ عملی بہت دانشمندانہ تجویز تھی کیونکہ اس کے ذریعے حکومت اور رعایا کے باہمی روابط زیادہ مستحکم ہو جاتے تھے اور راعی اور رعیت ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جاتے تھے" عادل شاہیوں کے زمانے میں ہندی اور ہندستانیت کی طرف میلان اسی قسم کے روابط کا پتا دیتا ہے اور دکن ہی وہ ملک ہے جہاں اردو (ریختہ یا دکنی) کی شاعری سب سے پہلے قبولِ عام پاتی ہے۔

معاشرتی تعلقات کی اس طویل داستان سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا یہ اختلاط اتنا عام اور گہرا تھا کہ اس کا اثر زبان اور عادات پر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ فارسی اگرچہ کاروباری زبان نہ تھی تاہم مسلمانوں کی زبان تھی پس ضرور ہے کہ ہندوؤں نے اسے نہایت توجہ کے ساتھ بولنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہوگی۔

ابنِ بطوطہ کی ایک روایت ابنِ بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں ایک عجیب و غریب حکایت نقل کی ہے جسے اگر حرفاً و لفظاً صحیح سمجھا جائے تو اس زمانے کے متعلق ہمارے خیالات میں ایک زبردست انقلاب کا پیدا ہو جانا یقینی ہے "ایک ہندو بیوہ ستی ہونے کے لیے آگ کے شعلوں کے پاس کھڑی ہے وہ ان سے بگڑ کر کہتی ہے "مارا می ترسانی از آتش۔ ما می دانیم او آتش است۔ رہا کنی مارا"۔ یہ فارسی جملے کچھ اس طریق سے عربی عبارت میں واقع ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس لڑکی کی زبان سے نکل گئے ہیں۔ اگر اس روایت کو بالکل درست سمجھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ فارسی زبان کو اس عہد میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی سمجھ اور بول سکتی تھیں۔

خلاصہ مباحث گزشتہ سطور میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں سے پہلے ہندوؤں میں فارسی تعلیم عام نہ تھی۔ یہ امر سخت موجبِ حیرت ہے کہ اتنے طویل عرصے کے لیے ہندوؤں نے کیوں اس زبان

کی طرف توجہ نہ کی۔ گویا فارسی کی شیرینی اور اسلامی تمدن کی گہرائی ہندوؤں کے قلوب کو اپنی طرف مایل کرنے میں ناکام رہی۔ یہ معمّا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرتی اتحاد اور میل جول کے وسائل بھی وسیع پیمانے پر موجود تھے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ قانونِ قدرت کے عمل اور ردِّ عمل نے اس معاملے میں اپنا کام کیوں نہیں کیا۔ ذیل کی سطور میں ان اسباب پر روشنی ڈالی جاتی ہے جو ان نتائج کے ذمہ دار ہیں۔

فارسی کا دنیاوی مفاد سے خالی ہونا ایک زبردست اور مؤثر سبب یہ تھا کہ اسلامی حکومت کی ابتدا سے مالگزاری کا محکمہ ہندوؤں کے قبضے میں تھا جس کی زبان ہندی تھی۔ پس ظاہر ہے کہ فارسی تعلیم حاصل کیے بغیر ہندوؤں کو ملازمتیں مل سکتی تھیں۔ بلوخمن نے لکھا ہے کہ[1] "ریونیو کے محکمے میں ملازمت مل جانے کی آسانی نے ہندوؤں کو فارسی تعلیم سے روکے رکھا۔" سچ یہ ہے کہ بلوخمن کے اس خیال کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب راجہ ٹوڈرمل نے ہندی کی جگہ فارسی کو دفتری زبان بنا کر اس کو حصولِ ملازمت کے لیے ضروری ذریعہ قرار دیا تو ہندوؤں نے فی الفور فارسی پڑھنی شروع کر دی اور تھوڑی ہی مدت میں وہ اس زبان کے اچھے خاصے ماہر ہو گئے۔

جبری تعلیم کا نہ ہونا اس سلسلے میں اس امر کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ ہندستان کی بیشتر آبادی شہروں کی بجائے دیہات میں بستی ہے اور بستی تھی۔ دیہاتی پنچائتیں[2] ہندستانِ قدیم سے چلی آتی ہیں۔ یہ پنچائتیں

---

[1] کلکتہ ریویو (۱۸۷۱ء) ص ۳۲۱

[2] متھائی ویلیج گورنمنٹ ان برٹش انڈیا۔ ص ۵

"دیسی حکومت" (لوکل سلف گورنمنٹ) کا درجہ رکھتی تھیں۔ اس دیہی نظام میں معلم یا اُستاد کو معتبر حیثیت حاصل تھی۔ مرکزی حکومت بجز اطاعت و وفاداری یا بغاوت یا سرکشی کے اس نظام کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیتی تھیں۔ جب مسلمانوں کی حکومت ہوئی تو اُنھوں نے بھی اس پُرانے نظام کو برقرار رکھا۔ دہلی کی مرکزی حکومت سوائے مالیہ وغیرہ کے ان لوگوں کے اندرونی معاملات میں بہت کم مداخلت کرتی تھی۔ جب تک ٹیکس باقاعدہ ادا ہوتے رہتے تھے اس وقت تک ان لوگوں کی داخلی آزادی اور خودمختاری قائم رہتی تھی۔ تعلیمی معاملات میں بھی ان کی حکمتِ عملی یہی تھی۔ جبری تعلیم کا مسئلہ مذہبی آزادی کے مسلک کے منافی تھا۔ مسلمانوں نے ان لوگوں پر اپنے علوم کو بہ جبر ٹھونسنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ سیاسی نقطۂ نظر سے یہ پالیسی صحیح ہو یا غلط اس کا اثر یہ ہوا کہ حکومت کی جانب سے کبھی ہندوؤں میں تعلیم عام کرنے کی کوئی جد و جہد عمل میں نہیں آئی۔

ہندوؤں کی تنفر دپسندی

ان اسباب کے علاوہ اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خود ہندوؤں کے اعلیٰ طبقات بھی علیحدگی پسند اور قدامت پرست تھے۔ علامہ البیرونی[۱] نے جنھوں نے ہندستان میں رہ کر ہندوؤں کی عادات و طبیعت سے پوری واقفیت حاصل کی تھی یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندو بیرونی دنیا سے اس لیے میل ملاپ نہیں رکھتے کہ ان کے دلوں میں تمام اجنبیوں کے خلاف نفرت ہے وہ انھیں ملیچھ (ناپاک) کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ان کے ساتھ روابط و تعلقات قائم کرنے کو ناپسند کرتے ہیں۔ جب مسلمان اس ملک میں آئے تو وہ اجنبی ہونے کے علاوہ حکمران بھی تھے۔ اس لیے ہندوؤں کے دل میں ان کے متعلق بہت بیگانگی تھی۔ اس کے علاوہ البیرونی نے

۱۔ الہند البیرونی (ترجمہ سخاؤ) ج ۱۔ ص ۱۷

یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوؤں کو اپنے علوم اور اپنی گزشتہ شان و شوکت کے متعلق بھی مبالغہ آمیز "حسنِ ظن" ہے۔ وہ اپنے ملک کو بہترین ملک، اپنی قوم کو بلند ترین قوم اور اپنی شایستگی کو بہترین شایستگی سمجھتے ہیں۔

ہندی کا رواج عام

بارھویں صدی عیسوی تک کا زمانہ مذہبی دعوت و اصلاح اور تصوف کی تحریکوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں نئے نئے فرقے اور نئی نئی جماعتیں ظہور میں آئیں۔ ان سب مصلحین کا روئے سخن عموماً عوام کی جانب تھا انھوں نے اس غرض کے لیے عوام کی بولیوں کو اختیار کیا۔ کیونکہ انھی میں آسانی کے ساتھ تبلیغ کی جا سکتی تھی مسلمان صوفیوں نے بھی فارسی کی بجائے ہندی کو زیادہ مؤثر ذریعۂ تبلیغ خیال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں ہندی کے بڑے بڑے مصنّف مسلمان ہی تھے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی جیسے بزرگ ہندی میں شعر کہا کرتے تھے۔ ان کا تخلص "الکھ داس" تھا۔ اسی طرح محمد جائسی، قطبن، کبیر اور دوسرے متصوفین و مصلحین نے ہندی ہی کو ذریعۂ اظہار خیالات قرار دیا۔ قدرتی طور پر ہندی کے اس رواجِ عام نے اس عہد میں فارسی کے قبولِ عام کو نقصان پہنچایا۔[1]

پٹھانوں کی فارسی سے نفرت

افغانوں اور بیجاپور کے سُنّی حکمرانوں کے عہد میں فارسی زبان کو اور بھی نقصان پہنچا۔ بیجاپور کے عادل شاہیوں میں سُنّی اور شیعہ دونوں فرقوں کے حکمران ہو گزرے ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان میں سے بعض حکمران ہندی کی سرپرستی کرتے رہے اور بعض فارسی کے حامی تھے۔ یوسف عادل شاہ (۸۹۵ - ۹۱۰ھ) فارسی کا بڑا حامی تھا لیکن اس کے پوتے ابراہیم عادل (۹۴۱ھ - ۹۶۵ھ)

---

[1] ڈاکٹر تاراچند کی انگریزی کتاب "اسلام کا اثر ہندستانی تمدن پر" نیز ملاحظہ ہو اردو کی تعمیر میں صوفیائے کرام کا حصّہ" از مولانا عبدالحق۔

نے فارسی کو ہٹا کر ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا۔ چنانچہ خافی خاں لکھتا ہے:۔

"ابراہیم عادل شاہ نے اپنے باپ اور دادا کے طریقے کے خلاف فارسی کی جگہ ہندی کو جاری کیا اور بڑے ذمہ داری کے عہدے اور انتظامی اسامیوں پر برہمنوں کو فائز کیا" (ج ۳ ۔ ص ۳۰۷)

اس کے بعد عادل شاہ (۹۶۵ھ۔۹۸۰ھ) نے سریر آرائے سلطنت ہو کر پھر ہندی کو منسوخ کر دیا لیکن جب علی عادل کا زمانہ آیا تو ہندی کو پھر اقبال نصیب ہوا۔ بساتین السلاطین کا مصنف ابراہیم زبیری لکھتا ہے:۔

"علی عادل شاہ کے عہد مبارک میں فارسی کے بعض اچھے شاعر پیدا ہوئے۔ لیکن خود بادشاہ ہندی کو پسند کرتا ہے اس لیے اس کے دربار میں ہندی شعرا کی کثرت ہے۔ (ص ۴۳۰)

خافی خاں منتخب اللباب میں اس بیان کی تائید کرتا ہے۔

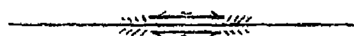
فاضلِ اجل پروفیسر محمود خاں صاحب شیرانی[1] شمالی ہندستان میں پٹھانوں کے عہد میں فارسی کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے تقریباً اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔

میں نے ہندوؤں میں فارسی تعلیم کے نہ پھیل سکنے کے جو اسباب پیش کیے ہیں وہ اگرچہ یقینی اور قطعی نہیں لیکن ان بواعث و عوامل کا اثر فارسی کی رفتارِ ترقی پر ضرور پڑا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مغلوں سے پہلے ہمیں ہندوؤں میں تو درکنار خود مسلمانوں میں فارسی کے متعلق وہ ادبی کارنامے نہیں ملتے جو دورِ مغلیہ کا طرۂ امتیاز ہیں۔

---

[1] پنجاب میں اُردو، ص ۲۰۵

دوسرا باب



عہدِ اکبری

دوسرا باب

عہدِ اکبری

ہندوؤں میں فارسی تعلیم کا آغاز

نئے دور کا آغاز جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کی تخت نشینی کے ساتھ ساتھ تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہی۔ اکبر نے اپنی حکومت کے آغاز کار ہی سے اِس سیاسی ضرورت کو بھانپ لیا تھا کہ بادشاہ کو ہندوؤں کی تالیف قلوب کرنی چاہیے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ہندستان کے ایک بادشاہ کے لیے یہ نہایت ضروری ہی کہ وہ حکمران اقلیت کے علاوہ ملک کی ایک بہت بڑی اکثریت کے معاملات میں بیش از بیش دلچسپی لے۔ اس کے خیال میں تخت وتاج کا استحکام ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ وفاداری پر منحصر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مغلوں کے لیے اپنے موطن اصلی یعنی آبا واجداد کے ملک کی طرف جانا کسی حد تک ناممکن ہی ہمایوں کے ساتھ افغان رعایا نے جو بدسلوکی کی تھی اس سے وہ ناواقف نہ تھا۔ اس لیے اس نے اپنے دل میں اپنی حکومت کو نہایت زبردست بنیادوں پر قایم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ماثر الامرا[1] کے مصنف کا بیان ہی کہ صفوی بادشاہ ایران نے ہمایوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ہندستان کی حکومت تب ٹھہر سکتی ہی کہ وہاں کا حاکم افغانوں کو تجارت اور دوسرے پُرامن مشاغل میں لگا دے اور راجپوتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قایم کرے۔ ہمایوں کو اتنی عمر نصیب نہ ہوئی کہ وہ اس اصول کو جامۂ عمل

[1] دربار اکبری ص ۶۱

پہنا سکتا اور نہ کوئی تاریخی شہادت ایسی موجود ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ نصیحت اکبر کے کانوں تک پہنچی۔ غالباً یہ لطیفۂ غیبی اور فیض ربانی ہی تھا۔ یا اکبر کی فراست اور دانشمندی کہ اس نے بعینہٖ یہ حکمتِ عملی اختیار کی اور اس اصول کو آزمایا جس کو آزمانے کا موقع اس کے جوانا مرگ باپ کو نہ حاصل ہو سکا تھا۔

یہاں یہ بیان کرنا نہایت ضروری ہے کہ اکبر کی حکمت عملی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا اگرچہ ہمارے مبحث سے بالکل خارج ہے تاہم یہاں ان جزئیات کا ذکر کیا جائے گا جن کا تعلق خاص طور پر ہندوؤں کی تعلیم سے ہے۔ ان سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ یہی امور مجموعی حیثیت سے ہندوؤں میں فارسی کی ترویج و ترقی میں ممد و معاون ہوئے۔

اکبر کی حکمتِ عملی کے اصول ثلثہ

اکبر کے اصول سلطنت نے علم کو عموماً اور فارسی تعلیم کو خصوصاً زیادہ وسعت دی۔

اس کی یہ حکمتِ عملی تین موٹے موٹے اصولوں پر مبنی تھی یعنی عام [1] رواداری، تعلیم [2] عوام، علوم [3] و فنون خصوصاً ہندو علوم و فنون کی قدر افزائی۔

ہندوؤں کی طرف میلان

جہاں تک عام رواداری کا سوال ہے۔ اکبر کے متعلق یہ مسلّم ہے کہ وہ حکومت کے حاصل کرنے سے پہلے اتنا زیادہ متقشف نہ تھا۔ تصوّف کی طرف وہ طبعی میلان رکھتا تھا۔ مسلمان صوفیوں سے اُسے خاص عقیدت تھی۔ ان لوگوں کے طفیل اس کو ہندو جوگیوں سے بھی اُنس اور نیازمندی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی حکومت کے پہلے ہی دور میں جزیے کو منسوخ کر دیا تھا اور ہندو مزارات پر سے محصول اٹھا دیا تھا۔ اسی زمانے میں اس نے ہندوؤں سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کر لیے اور اس طریق سے راجپوت ہندوؤں کو سلطنت کے زیادہ قریب کر دیا۔ ابتدائے حکومت ہی

سے ہنڈوں کو بعض اعلیٰ مناصب عطا کیے اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ان کو بھی سلطنت میں دخیل بنایا۔

مذہبی معاملات میں وہ بہت زیادہ آزاد تھا۔ اس نے پادری اکوواکے سامنے یہ اعلان کیا کہ میں نے اپنے لڑکوں کو حسب مرضی مذہب قبول کرنے کی اجازت دے رکھی ہی۔ اس نے عبادت خانے میں مختلف مذاہب کے علما کے درمیان ایک مباحثے کی مجلس قایم کی جس میں ہندو علما بھی برابر شریک ہوتے تھے۔ ایک برہمن اکبر سے اس کے حرم میں ملاقات کرتا اور اس کے سامنے وید منتر پڑھا کرتا تھا۔ آخری زمانے میں ہنڈوں کی رسوم و عبادات کی طرف اتنا میلان پیدا ہو گیا تھا کہ اُن کی خاطر مسلمانوں کے ساتھ بے انصافیاں بھی کر بیٹھتا تھا۔ وہ مسلمان علما کی طرح بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ ہندو علما کی خاطر داری کیا کرتا تھا۔ علما اور ماہرین فن کو میاں، مرزا یا خان کا لقب دیتا تھا۔

ہندو علوم کی قدر افزائی ہندو علما و فضلا انعام و اکرام سے کبھی محروم نہیں کیے گئے۔ اُمرائے دربار بھی اکبر کی دیکھا دیکھی ہندو ارباب فن پر نوازشیں کیا کرتے تھے۔ خان خاناں نے ایک موقع پر رامداس کلاونت کو ایک لاکھ روپیہ عطا کیا[1]۔ اس قسم کی فیاضیوں کا حال اگرچہ فیروز تغلق کے زمانے میں بھی ملتا ہی لیکن مسٹر نرندرا ناتھ نے درست لکھا ہی کہ اکبر کا زمانہ اس لحاظ سے بہترین زمانہ تھا[2]۔

ایسی فیاض اور قدر دان حکومت کے ماتحت علوم و فنون بیحد ترقی پاتے ہیں۔ چنانچہ اکبر کے زمانے میں ہر قسم کے علم و فن نے ترقی پائی۔ فارسی جو گزشتہ زمانے میں زوال پذیر ہو رہی تھی۔ اب پھر بڑھنے لگی۔ اکبر کا عہد فارسی ادب

---

[1] بداؤنی۔ ج ۲۔ ص ۲۴۴

[2] نرندرا ناتھ لا، پروموشن آف لرننگ۔ ص ۱۷۱

کے لیے نشو و ترقی کا زمانہ تھا۔[1] اس لیے کہ اسی زمانے میں فارسی میں بہترین تاریخیں مرتب ہوئیں اور دوسری زبانوں کی کتابوں کا بھی فارسی میں ترجمہ ہوا۔ غرض ہر طرح کی تصنیفات کا ایک ذخیرہ جمع ہو گیا۔ ہندی نے بھی اکبری دور میں وسعت حاصل کی۔[2] اکبر خود بھی ہندی میں شعر کہا کرتا تھا اور "اکبر رائے" تخلص کیا کرتا تھا۔ خان خاناں کی زباندانی کی قابلیت سب کے نزدیک مسلّم ہے۔ "رحیم ست سئی" نام ایک کتاب اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ ہندی کا مشہور شاعر تلسی داس اسی زمانے میں تھا۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ اس نے کبھی اکبر سے ملاقات بھی کی یا نہیں۔ اس کی تصنیف "رام چرتر مانس"، یا رامائن نہایت مقبول ہے۔ حقیقت میں وہ "ہندی کے باغ کا بہترین نونہال ہے۔"[3]

ہندی کی حوصلہ افزائی کے علاوہ اکبر ہندوؤں کے قدیم لٹریچر کا بھی نہایت مدّاح تھا۔ اس کا خیال تھا کہ قدیم سنسکرت کی کتابوں میں آج کل کی نسبت تصنّع، تکلّف اور آورد کم تھی۔[4]

اس نے ہندو علوم کے ہر شعبے میں دلچسپی لی۔ چنانچہ مختلف علوم مثلاً شاعری، فلسفہ، ریاضی، الجبرا وغیرہ کی کتابوں کو فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ پہلی اسلامی حکومتوں میں بھی اگرچہ فارسی کتابوں کے تراجم کا حال ملتا ہے مگر اکبر نے اس کی طرف حد سے زیادہ توجہ کی۔

ملّا عبدالقادر بدایونی نے ۹۸۲ھ میں "سنگھاسن بتیسی" کا ترجمہ کیا۔ اس کا

---

[1] اس کے لیے پروفیسر عبدالغنی کی انگریزی کتاب "فارسی ادب مغلوں کے زمانے میں" ملاحظہ ہو۔

[2] گریرسن (دیباچہ) ونسنٹ سمتھ۔ اکبر ص ۴۲۱

[3] ونسنٹ سمتھ اکبر ص ۴۱۷ و مابعد

[4] بدایونی۔ ج ۲۔ ص ۳۲۰۔

نام "خرد افزا" رکھا۔[۱] ۹۸۳ھ میں بھاون نام ایک پنڈت دکن سے آکر مسلمان ہوگیا۔ ملا بداؤنی نے اس کی معاونت سے "اتھروید" کا ترجمہ شروع کیا لیکن اس کو پورا نہ کرسکا۔ پھر شیخ فیضی اور حاجی ابراہیم تھانیسری نے یہ خدمت اپنے ذمے لی لیکن یہ بھی اس کام کو ختم نہ کرسکے۔[۲]

ملا بداؤنی نے ۹۹۷ھ میں راماین کا اور ۹۹۹ھ میں "تاریخ کشمیر" کا ترجمہ ختم کیا۔[۳] ۱۰۰۰ھ میں متعدد علما کی متفقہ کوششوں سے "مہابھارت" کا ترجمہ کیا گیا۔ اس پر فیضی نے دیباچہ لکھا۔[۴] ان کے علاوہ لیلاوتی، نل دمن، تاجک اور ہری بنس کے تراجم ہوئے۔[۵]

عام تعلیم کا اصول

اکبر "عام تعلیم" کو رائج کرنے والوں کا امام تھا۔ اس کی سلطنت کا اس سلسلے میں سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس کے زمانے میں عام اسکولوں کا رواج ہوا۔ اسی کے زمانے میں مشترکہ اسکولوں کا افتتاح ہوا اور مختلف طلبہ کے لیے نصابِ تعلیم مقرر ہوا۔ چنانچہ ہندوؤں کے لیے بھی خاص نصاب مقرر کیا گیا۔[۶] اس بارے میں ابوالفضل لکھتا ہے:۔[۷]

"اخلاق، حساب، سیاق، فلاحت، مساحت، ہندسہ، نجوم، رمل، تدبیر منزل، سیاست مدن، طب، منطق، طبیعی، ریاضی، الٰہی، تاریخ، مرتبہ مرتبہ اندوزد واز ہندی علوم بیاکرن، نیائے، بیدانت، پاتنجل برخواند و ہرکس را از بایست وقت درنگزارند۔"

۱ۓ بداؤنی۔ ج ۲۔ ص ۱۸۳ ۲ۓ بداؤنی۔ ج ۲۔ ص ۲۱۲

۳ۓ بداؤنی۔ ج ۲۔ ص ۳۶۶ ۴ۓ پرومودشن ص ۱۴۷

۵ۓ بداؤنی۔ ج ۲۔ ص ۳۱۹ ۶ۓ پرومودشن ص ۱۴۷، ومابعد

۷ۓ آئینِ اکبری۔ ج ۱۔ ص ۲۰۲

ابوالفضل لکھتا ہے کہ اس قسم کے قوانین نے مکاتب اور مدارس کو ایک خاص رنگ دے دیا اور ان مدارس سے سلطنت کو بیحد رونق حاصل ہوئی۔ ابوالفضل فخر کے لہجے میں لکھتا ہے[۱]۔

"ازیں طرز آگہی مکتبہا رونق دیگر گرفت و مدرسہا فروغ تازہ یافت۔"[۲]

اس مقام پر ہم مسٹر نرندر ناتھ لا کی کتاب "مسلمانوں کے عہد میں علمی و تعلیمی ترقی" سے ایک اقتباس درج کرتے ہیں:۔

"غرض یہ اکبر کی دانشمندانہ اور منظم حکمتِ عملی تھی کہ اس کے ذریعے ہندو علوم کی حفاظت کا انتظام کیا گیا۔ اس نے ہندو نوجوانوں کی تعلیم کا ان کی اپنی تہذیب کے مطابق بندوبست کیا اور پھر مدرسوں میں ہندو اور مسلمان طالب علموں کی مشترکہ تعلیم کو رائج کیا۔ عبادت خانے میں ہندو علما کے ساتھ بحث و مناظرے کا سلسلہ جاری کیا۔ اُس نے ہندوؤں کی پُرانی کتابوں کے ترجمے کا حکم دیا جس سے ہندو تہذیب کی قدر دانی، نیز اس کی اشاعت کے لیے جوش و خروش کا حال بخوبی معلوم ہوتا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ اس نے ممتاز علما و فضلا کی جو فنون لطیفہ مثلاً موسیقی اور مصوری میں خاص شہرت رکھتے تھے شاہانہ سرپرستی کی۔"

اس حکمت عملی کا اثر ہندو ذہنیت پر اکبر نے ان طریقوں سے ہندوؤں کو یقین دلایا تھا کہ اُسے ان کے مذہب، ان کی روایات، ان کی تہذیب اور ان کے تمدن کے ساتھ خاص لگاؤ اور دلچسپی ہے۔

[۱] آئین اکبری۔ ج ۱۔ ص ۲۰۲ [۲] پروموشن۔ ص ۱۷۱

اپنی رعایا کے فوائد عامہ کے ساتھ اس گہری ہمدردی نے نہایت عمدہ نتائج پیدا کیے۔ اس طرزِ عمل نے پس ماندہ اقوام کی مدتوں کی خوابیدہ ذہنی قوتوں کو حرکت دی اور ہر شعبہ عمل میں ایک خاص بیداری، ایک خاص زندگی محسوس ہونے لگی۔ اس کے زمانے میں ہر جگہ امن وامان کا دَور دَورہ تھا اور جیسا کہ پُرامن ایام میں ہُوا کرتا ہے زندگی کے ہر میدان میں ترقی کی تحریکیں پیدا ہوگئیں۔

راجہ ٹوڈرمل کا فرمان ان حالات میں راجہ ٹوڈرمل نے اپنی شہرۂ آفاق اصلاحات کو سنہ ۹۹۰ھ[1] میں رائج کیا۔ ان اصلاحات میں سے ہمیں صرف ایک فرمان سے مطلب ہے اور وہ یہ کہ اس نے تمام مملکت کے طول و عرض میں یہ حکم دیا کہ تمام دفتری کام فارسی زبان میں انجام دیا جائے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس سے قبل دفاتر کا کام ہندی زبان میں انجام پاتا تھا۔ ٹوڈرمل کی اصلاحات کے نفاذ پر ہندوؤں کی طرف سے ناراضگی کا اظہار موجبِ تعجب نہ ہوتا اس لیے کہ اس تجویز کے ذریعے ہندوؤں کے مفاد کو سخت نقصان پہنچا تھا لیکن تھوڑی بہت بے اطمینانی کے علاوہ کسی گوشے سے شدید ناراضگی کا مظاہرہ نہیں ہُوا۔[2] جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندو اس تغیرِ حالات کو برداشت کرنے کے لیے آمادہ تھے۔ ہم نے اکبر کی جس معتدلانہ حکمتِ عملی کا ذکر کیا ہے وہ ہندوؤں کی تالیفِ قلوب کے لیے کافی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ حکومت کی ہر تحریک کو رعایا لبیک کہنے کے لیے تیار رہتی تھی اور اس موقع پر بھی ہندوؤں نے بظاہر رضا و تسلیم کا شیوہ اختیار کیا۔ اس خاموشی اور رضامندی کی ایک اور وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہندوؤں کے بعض خاندان سکندر لودھی کے زمانے سے فارسی زبان سے آشنا

---

[1] آئین (ترجمہ بلوخمن۔ ص ۳۵۲)

[2] آئین (ترجمہ بلوخمن۔ ص ۳۵۲) و جرنل سوسائٹی بنگال ۱۸۷۱ء ستمبر، ص ۱۸۸

چلے آتے تھے۔ یہ امر قرین قیاس ہے کہ ان فارسی دان طبقات نے ہندی کی بجائے فارسی کے رواج کو اپنے مفاد کے لیے چنداں نقصان دہ نہ سمجھا ہوگا۔ ان لوگوں کے علاوہ باقی ہندوؤں کے لیے یہ فرمان فارسی کی طرف ترغیب دینے والا ثابت ہوا اور فارسی تمام ہندستان کی سیاسی اور لطیف زبان قرار پائی۔

فرمان کی حیثیت اور اس کا اثر

غالباً یہ اقتصادی مجبوری تھی جس نے ہندوؤں کو فارسی کی طرف زیادہ تر متوجہ کیا۔[51]

اس فرمان کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ تاوقتیکہ وہ ملک کی شاہی زبان کو حاصل نہ کریں گے اس وقت تک انھیں ملازمت نہیں مل سکے گی۔ راجہ ٹوڈرمل نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ فارسی سے ناآشنا ہوکر اس کے ہم مذہب ملک کے معاملات میں صحیح طور پر حصّہ لینے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ اس فرمان کے رواج و نفاذ کے بعد ہندوؤں نے فارسی میں سہہ تن مصروفیت کا اظہار کیا اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے انجام پر ہندو فارسی میں مسلمان ہموطنوں کے برابر ہو گئے تھے۔[52] اگر یہ زبردست اختلاط کی صورتیں اور اسباب نہ پیدا ہوتے تو کسے معلوم ہے اُردو زبان کا کیا حال ہوتا؟ جہاں راجہ ٹوڈرمل ہندوؤں میں فارسی زبان کو رواج دینے والوں کا پیشوا ہے وہاں اُسے اُردو زبان کے ترقی دینے والوں میں بھی شمار کرنا چاہیے۔

یہ اُن اسباب کا سرسری سا خاکہ ہے جس نے ہندوؤں کو ایک نئی شاہراہ پر قدم رکھنے کے لیے مجبور کیا۔ یعنی اب فارسی ـــــ اجنبیوں کی زبان ـــــ عام ہندوؤں کے ہاں پڑھائی جانے لگی۔ اس امر کو باور کرنے کے لیے ہمارے

---

[51] ایضاً ہیول رابرین رول ص ۴۸۸)

[52] آئین ربلوخمن۔ ص ۳۵۲)

پاس وجوہ موجود ہیں کہ پہلے پہل کائستھوں نے اس کا استقبال کیا اس لیے کہ ان لوگوں میں پہلے ہی سے فارسی پڑھنے کا دستور چلا آتا تھا۔ نیز اس لیے کہ ہندوؤں میں صرف یہی لوگ منشی گری کا کام کرتے تھے۔ لہٰذا جونہی کہ دفاتر کی زبان تبدیل ہوئی انھوں نے معمولی کام کاج میں اپنے آپ کو طاق کرلیا ہوگا۔ فرمان کے نفاذ سے زیادہ بےچینی کے نہ پیدا ہونے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوؤں کی خواندہ اور انشا پیشہ جماعتوں میں فارسی کی معمولی نوشت وخواند ضرور موجود تھی۔

اس زمانے کا لٹریچر بہت کم ہے، فنونِ لطیفہ کو ضرور ترقی ہوئی

اگرچہ ہندوؤں نے اس زمانے میں فارسی کو کمال شوق سے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ مگر کوئی خاص نتائج کتابوں کی صورت میں برآمد نہیں ہوئے۔ ہمیں ہندوؤں میں کوئی اعلیٰ پایے کا مصنّف نظر نہیں آتا جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہندوؤں نے ابھی تک زبان پر قدرت حاصل نہیں کی تھی جو تصنیف وتالیف کے لیے ضروری تھی۔ لیکن اکبر کی شاہانہ سرپرستی اور حوصلہ افزائی نے ہندو قوم کے اندر جو زندگی پیدا کی وہ فنونِ لطیفہ مثلاً موسیقی، مصوّری اور خوشخطی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

مصوّری

اس زمانے میں مصوّری کا "ہندی ایرانی دبستان" ترقی پذیر ہوا۔ اکبر کے درباری مصوّرین میں بہت سے ہندو تھے۔ مثلاً ابوالفضل نے آئین[1] میں جن لوگوں کو گنایا ہے ان کے نام یہ ہیں:۔ دسونت، بساون، کیسو، لال مکند، مادھو، جگن، مہیش، کھیم کرن، تارا، سانولہ، ہری بنس، رام۔ ابوالفضل کے نزدیک ہندوؤں کی بنائی ہوئی تصویریں بہت ہی نفیس ہوتی تھیں اور ساری دنیا میں بہت کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

---

[1] آئین (ج ۱، ص ۱۱۷)

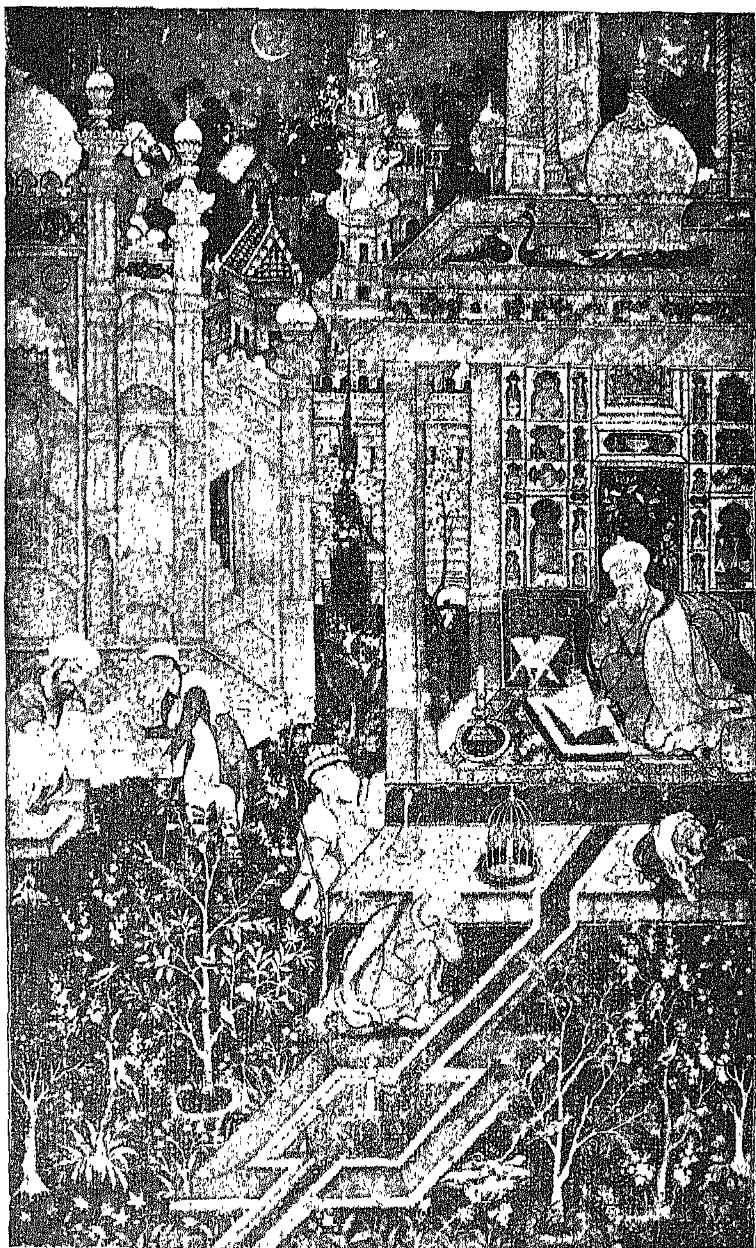
بانکی پور لائبریری[51] میں "تاریخ خاندانِ تیموریہ" کا ایک نسخہ موجود ہے جو مصوّر ہے اور جس میں ان درباری مصوّرین میں سے اکثر کے "عمل" موجود ہیں۔ پرسی براؤن لکھتا[52] ہے کہ اس ہندی ایرانی دبستان کے امام تو عبدالصمد اور میر سید علی ہیں، لیکن باقی اکابر تمام تر ہندوؤں میں سے ہیں۔" یہ لوگ دربار میں کتابوں کو مصوّر کرنے کے لیے رکھے جاتے تھے۔

موسیقی اس عہد میں موسیقی نے بھی بہت ترقی پائی۔ ابوالفضل لکھتا[53] ہے کہ اکبر کے دربار میں ہندو، ایرانی، تورانی، کشمیری عورتیں اور مرد موسیقی داں تھے۔ یہ لوگ سات گروہوں میں منقسم تھے۔ ہر گروہ کے لیے ہفتے کا ایک ایک دن مقرر تھا جس دن اُسے اپنا فرض بجالانا پڑتا تھا۔ مسٹر نرندر ناتھ لا محولہ بالا کتاب میں لکھتے[54] ہیں:-

"موسیقی کے میدان میں اس امر کا سُراغ نہیں ملتا کہ ہندو اور مسلمان کب سے اور کس طرح ایک دوسرے سے استفادہ کرتے رہے؟ اور ہر قوم دوسری قوم کے ذخیرۂ فن میں کس طرح اضافہ کرتی رہی؟ مسلمانوں کی حکومت کے ابتدا سے ہی ہم اس معاملے میں بیحد تعاون و تناصر پاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سلطان حسین شرقی نے "خیال" کو ایجاد کیا۔ لیکن اب وہ ہندو موسیقی کا جزو ہے۔ اُدھر "دُھرپد" جو خالصتہً ہندو موسیقی کا جزو تھا اب "مُسلم موسیقی" کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔ موسیقی کی موجودہ حالت صدیوں کے اختلاط اور خلط ملط کا پتا دیتی ہے۔ یہ اختلاط اکبر کے دربار میں

---

[51] فہرست بانکی پور لائبریری۔ ج ۷، ص ۴۰ [52] پرسی براؤن۔ انڈین پینٹنگز۔ ص ۶۳
[53] آئین، بلوخمن ص ۶۱۲ [54] پردموشن ص ۱۵۷



عہد اکبری کے ہندو مصورین کی مصوری کا نمونہ (از تاریخ خاندان تیموریہ)

کمال تک پہنچا ۔"

میاں تان سین جو پہلے ہندو تھا اور بعد میں شاید مسلمان ہو گیا تھا اس زمانے کا بہترین موسیقی داں تھا[۵۱]۔ رام داس کا درجہ علم موسیقی میں تان سین سے دوسرے درجے پر تھا۔ ابوالفضل[۵۲] نے دربار اکبری کے ۳۶ ماہرین موسیقی کی جو فہرست پیش کی ہے ان میں آگرہ کا اندھا شاعر "سورداس" بھی شامل ہے۔ اکبر کے زمانے میں علم موسیقی کا آفتاب نصف النہار تک پہنچا اور یہ نہایت مدلل طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس فن کے کمال میں ہندوؤں کا کافی سے زیادہ حصّہ ہے۔

خوشخطی | خوشخطی کو مسلمانوں نے نہایت قدیم زمانے سے فن لطیف کی حیثیت سے ترقی دی۔ پریس کی ایجاد سے پہلے یہ فن اشاعتِ کتب اور ترویجِ علوم کا واحد ذریعہ تھا۔ اکبر نے ادھر بہت توجہ کی اور خط کی مختلف انواع و اقسام میں کافی سے زیادہ دلچسپی لی[۵۳]۔ چونکہ یہ فن زیادہ تر فارسی کے پڑھنے اور جاننے پر موقوف ہے اس لیے اس وقت تک جبکہ ہندوؤں میں فارسی کا عام رواج نہیں ہوا ہندو خوش نویس بہت کم ملتے ہیں۔ رائے منوہر اور راجہ ٹوڈرمل جن کے متعلق ہم آگے چل کر تفصیل سے لکھیں گے، نہایت اچھے خوش نویس تھے۔

ہندوؤں میں فارسی لٹریچر کے ابتدائی آثار | خالص فارسی لٹریچر کا اس زمانے میں کوئی نام و نشان موجود نہیں۔ تحقیق کے جدید و قدیم مآخذ کی تلاش کے باوجود کسی کتاب کا سراغ

---

۵۱ پروموشن ص ۱۵۵ ۵۲ آئین بلوخمن ص ۶۱۲

۵۳ آئین۔ ج ۱۔ ص ۱۱۲، ۱۱۳، بلوخمن ص ۹۹،

نہیں مل سکا۔ تاریخوں اور ہندستان اور یورپ کی فارسی فہرستوں کی اوراق گردانی کی گئی لیکن اس عہد میں کسی ہندو کی فارسی تصنیف نہیں مل سکی۔ ہاں کچھ فارسی دانوں کا حال معلوم ہوتا ہے جنھیں بہرحال ہندوؤں میں فارسی لٹریچر کے ابتدائی آثار کے طور پر ذکر کرنا چاہیے۔

عہدِ اکبری کے فارسی داں ہندو: (۱) راجا ٹوڈر مل

اس ضمن میں ہم راجہ ٹوڈرمل کو کسی حال میں نظرانداز نہیں کر سکتے جو ہندوؤں میں ایک بڑی حد تک فارسی کو رواج دینے والا تھا۔ ہمیں یہاں اس کی زندگی کے تفصیلی حالات سے کوئی سروکار نہیں۔ اس مقصد کے لیے ناظرین کو دوسری کتابوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اس کی زندگی کے موٹے واقعات یہ ہیں[1] کہ وہ لاہرپور میں پیدا ہوا (نہ کہ لاہور میں جیسا کہ مآثرالامرا کے مصنف نے لکھا ہے) اس نے اکبر کے ماتحت پہلا ذمہ داری کا عہدہ ۱۸ سال جلوسِ اکبری میں حاصل کیا۔ ۲۲ سن جلوس میں وہ وزیر مقرر ہوا ستائیسویں سال جلوس میں وہ دیوان مقرر ہوا اور ۹۹۸ھ میں فوت ہوگیا۔

راجہ ٹوڈرمل کی فارسی قابلیت[2] کے متعلق کوئی ٹھیک بیان نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے بعض اہم اصلاحات رائج کیں اور فارسی کو دفاتر کی زبان قرار دیا۔ ان امور سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے فارسی میں اچھی خاصی قابلیت حاصل تھی کیونکہ فارسی نہ جاننے کی حالت میں راجہ اپنے ذمہ داریوں سے عہدہ برآنہ ہو سکتا۔ لہٰذا یہ نتیجہ

---

[1] آئین بلوخمن ص ۳۲، ۳۳۳، ۳۵۲ نیز خلاصۃ التواریخ ۴۰۹ و مابعد، دربار اکبری ۵۱۹ و مابعد مآثرالامرا ج ۲ ص ۱۲۳؛ نفریح العمارات قلمی (مملوکہ پروفیسر شیرانی صاحب) اکبرنامہ ج ۳ ص ۵۶۹

[2] برہمن کی کتاب چہار چمن میں اکبر کے ایک درباری شاہباز خاں کی رائے راجہ ٹوڈرمل کے متعلق اچھے الفاظ میں درج ہے۔ (ملاحظہ ہو ورق ۱۰۶ قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری)

نکالنا بالکل صحیح ہو کہ راجہ فارسی سے اچھی طرح واقف تھا۔ تذکرۂ خوشنویساں[1] کے مصنّف کا بیان ہو کہ "ٹوڈرمل از طایفہ کھتری، نویسندۂ چابک دست و خطوط بخوشخطی و نمکی مے نوشت، بوسیلۂ مظفر خاں برتبۂ وزارت اکبری رسیدہ ..... الخ

خلاصۃ التواریخ[2] مصنّفہ منشی سجان رائے میں راجہ ٹوڈرمل کی قابلیت کا حال اِن الفاظ میں درج ہو:۔

"در دقایق سیاق و حقایق حساب بے نظیر، در علم محاسبات موشگاف، ضوابط و قوانینِ وزارت و تنظیم احکام سلطنت و بندوبست امور مملکت و آبادی و معموری رعیت و دستور العمل کارہائے دیوانی و قانون اخذ حقوق سلطانی و افزونئ خزانہ و امنیت مسالک و تادیب سرکشاں و تسخیر ممالک و دستور مناصب امرا و مواجب سپاہ و دوامی پرگنات و تنخواہ جاگیر از و یادگار است"۔

مگر ابوالفضل راجا کو تعصب کا الزام دیتا ہو اور اگرچہ راجا کے تدبّر، جرأت، ہوشیاری اور بے نفسی کی تعریف کرتا ہو مگر راجا کی فارسی دانی کے کم و کیف کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہتا۔

ٹوڈرمل کی تصنیفات: خزانِ اسرار (؟)[4]

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد دربارِ اکبری[3] میں لکھتے ہیں:۔ "کشمیر

---

[1] تذکرۂ خوشنویساں۔ ص ۸۸ [2] خلاصۃ التواریخ ص ۴۰۹ [3] دربار اکبری ص ۵۳۰

[4] انڈیا آفس لائبریری (عدد ۲۴۳۲) میں راجہ ٹوڈرمل کی طرف ایک کتاب منسوب کی گئی ہو جس کا نام "دستور العمل" ہو۔ ایتھے صاحب کے نزدیک کتاب کے بعض حصّے ایسے ہیں جن کا مصنف ٹوڈرمل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ق ۵۱ پر شاہجہاں آباد کا ذکر ہو جو شاہجہاں کے عہد میں تعمیر ہوا۔ ابوالفضل نے راجہ کی "چند فصل" کا ذکر کیا ہو جن میں بعض مالی تجاویز مرقوم تھیں مگر ان کا کہیں بھی پتا نہیں چلتا (اکبرنامہ ج ۳۔ ص ۳۸۱)۔ بہت ممکن ہو کہ یہ وہی دستور العمل ہو اور کچھ ابواب الحاقی ہوں۔ لیکن ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔

اور لاہور کے کہن سال لوگوں میں کتاب "خازن اسرار" اس کے نام سے مشہور ہے
مگر کمیاب ہے۔ میں نے بڑی کوشش سے کشمیر میں جاکر پائی لیکن دیباچہ میں یہ دیکھ کر
تعجب ہوا کہ ۱۰۰۵ھ کی تصنیف ہے۔ حالانکہ خود ۹۹۷ھ میں مرگیا تھا۔ شاید اس کی
یادداشت کی کتاب پر کسی نے دیباچہ لگا دیا .... الخ "

خوش قسمتی سے خازن اسرار[1] کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔
اس کی ابتدائی سطور یہ ہیں :۔

" سپاس بیقیاس حضرت مالک الملکی کہ خانۂ تن در وجود انسان را بچراغ عقل
منور گردانید و بنور انصاف و معرفت بہرہ وری شعاع انوار بخشید ..... راجہ ٹوڈرمل
از دیر باز رہ گم کردۂ خارستان جہل و نادانی بود، برہبری کرم عمیم خویش، راہنمائے گلستان
معرفت گردانید "

اس اقتباس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا مصنف ٹوڈرمل نامی کوئی
شخص تھا۔ دیباچے میں اکبر کی مدح بھی موجود ہے۔ کتاب نہایت دشوار اور فاضلانہ
انداز میں لکھی گئی ہے۔ قرآن مجید کی آیات اور عربی ضرب الامثال اور اصطلاحاتِ علمیہ
کی اتنی فراوانی ہے کہ مصنف کی علمیت کا سکہ قلب پر بیٹھتا ہے اور قیاس کہتا ہے کہ
یہ اکبری عہد کے کسی ہندو کی تصنیف نہیں ہوسکتی، خواہ وہ ٹوڈرمل ہی کیوں نہ ہو۔
یہ بالکل روشن ہے کہ تصنیف (بلحاظ انشا) کسی اچھے انشا پرداز کی ہے لیکن یہ معمّا کس
طرح حل ہو کہ مصنف کا نام اور اکبر کی مدح جیسے ناقابل فراموش شواہد بھی موجود ہیں۔

ٹوڈرانند اتفاقاً ہندی کی کتابوں میں تلاش کے بعد ایک کتاب دستیاب ہوئی
جس کا نام ٹوڈرانند ہے اور راجہ ٹوڈرمل کی طرف منسوب ہے۔ مصر بندھو ونود[2]
کے بیان کے مطابق اس کے تین اجزا ہیں :۔

---

[1] خازن اسرار (قلمی ق ۱)   [2] مصر بندھو ونود۔ ص ۲۹۵

(۱) دھرم شاستر (۲) جوتش اور (۳) طب۔ ہر جزو بہت سے چھوٹے چھوٹے حصّوں پر منقسم ہے۔ بیکانیر سنسکرت لائبریری[۱] کی فہرست کے بیان کے مطابق یہ ایک سنسکرت کتاب ہے۔

مندرجہ بالا کتاب کا اگر خازن اسرار کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو ان دونوں کتابوں میں ایک مشابہت موجود ہے۔ ہماری رائے میں خازن اسرار "ٹوڈرانند" کا ترجمہ ہے لیکن ٹوڈرمل خود مترجم نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ اس کا ترجمہ کسی اچھے انشا پرداز کے ہاتھوں عمل میں آیا ہے۔ مضامین میں کچھ فرق موجود ہے۔ لیکن تراجم میں اضافہ اور تخفیف دونوں کا ہونا ممکن ہے۔ سنسکرت کتاب تین حصّوں پر منقسم ہے اور خازن اسرار" چار منازل پر مشتمل ہے۔ افسوس ہے کہ ٹوڈرانند کا کوئی نسخہ یہاں موجود نہیں ورنہ اس نظریے کو ہم زیادہ تیقن کے ساتھ پیش کرسکتے۔ بہرحال ہم "خازن اسرار" کو (بعینہا) ٹوڈرمل کی تصنیف نہیں مان سکتے۔

بھگوت پران | کہتے ہیں کہ راجہ ٹوڈرمل نے بھگوت پران کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا[۲]۔ لیکن اس خیال کی کسی تاریخی شہادت سے تائید نہیں ہوتی اور نہ اس کے کسی نسخے کا ذکر کہیں موجود ہے۔

رسالۂ حساب | "یک رسالہ در فن سیاق" بھی راجہ کی طرف منسوب ہے[۳] لیکن معلوم نہیں کہ یہ رسالہ فارسی میں تھا یا ہندی میں۔ کوئی عجب نہیں کہ فارسی میں ہی ہو۔

---

[۱] فہرست بیکانیر سنسکرت لائبریری ص ۳۴۵، ۳۴۹ عدد ۷۴۸

[۲] A LIT: HISTORY OF INDIA P 36N گریرسن۔ ص ۳۵

[۳] دربار اکبری۔ ص ۵۴۹، اُمرائے ہنود ص ۱۳۶

اکبری تراجم میں ہندوؤں کا حصّہ اس عہد کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں سنسکرت کتابوں کے ترجمے کا کام نہایت سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ شروع ہوا۔ بدایونی کے بیانات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کاموں میں پنڈتوں سے بہت مدد لی گئی تھی۔ اتھروید کا ترجمہ بدایونی کے سپرد کیا گیا تھا اور امداد کے لیے ایک پنڈت بھی مقرر کیا گیا تھا۔ اسی نوع کی اور کئی مثالیں بھی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان فارسی تراجم میں ان برہمنوں کی کوششوں کو بھی بہت حد تک دخل ہے گویا وہ فارسی کتابیں مسلمان فضلا اور برہمنوں کے مشترک کارنامے ہیں۔

مرزا منوہر توسنی یہ چیز نہایت ہی عجیب ہے کہ اکبر کے زمانے میں ہم ایک ایسے ہندو شاعر کو دیکھتے ہیں جسے فارسی کے ساتھ بے نظیر شغف اور واقفیت ہے۔ اس کے خیالات اسلامی تخیل میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اس کی زبان شستہ اور واضح ہے۔ یہ ہندو قوم کا سب سے پہلا فارسی شاعر یعنی محمد منوہر توسنی تھا۔ بدایونی اس کے حالات میں لکھتا ہے[1]:

"منوہر نام دارد، ولد لون کرن راجۂ سانبر است کہ در لمکزار مشہور است و ایں ہمہ نمک در سخن او تاثیر ایں سرزمین است، صاحبِ حسنِ غریب و ذہنِ عجیب است، اوّل او را محمد منوہر می خواندند بعد ازاں میرزا منوہر خطاب یافت و پدرش با وجود کفر بشرف و افتخار و مباہات ہمیں محمد منوہر می گفت، ہر چند مرتبۂ طبع بادشاہی نبود طبع نظمی دارد" از وست ؎

شیخ مستغنی بدین و برہمن مغرور کفر   مست حسن دوست را با کفر و ایماں کار نیست

---

[1] بدایونی، ج ۳، ص ۲۰۱

بے عشق تو در جگر بیا لب ناراست | بے درد تو در سرم سراسر خار است
بتخانہ و کعبہ ہر دو نزد م کفر است | ما را بہ یگانگی ایزد کار است

زلالے کہ تخلص بود داد نار این چند بیت گفتہ کہ

شربت آشنا ما میا در بزم ما دُردی کشاں | کز جگر در کف کباب و خون دل در ساغر است
ننگ مرد الست حرف از جان و دل گفتن بعشق | دل چو خون سخت است بستہ ہاں چو باد صرصر است
توسنی بردہ سمند شوق در میدان عشق | مے رسی امین بمقصد بہر تا چوں اکبر است

از ہندوئے چوں این قدر طبع شعر و حالت غریب بود ثبت نمودہ آمد۔

طبقاتِ اکبری[1] میں لکھا ہے:۔

"رائے منوہر بن لون کرن از صغر سن در حجرۂ شفقت حضرت الٰہی نشو و نما یافتہ، در خدمت شاہزادہ کامگار سلطان سلیم بزرگ شدہ خط سواد پیدا کردہ، سلیقہ شعر بہم رسا نیدہ۔ میگو ید و کوسنی[2] (کذا) تخلص دارد"۔

تزکِ جہانگیری میں لکھا ہے:۔ (نیز ملاحظہ ہو ترجمہ راجرز۔ ج ۱۔ ص ۱۷)

"منوہر کہ از قوم کچوائیاں سیکھاوٹ است و پدر من در خورد سالی با دعنایت بسیار مے کردند۔ فارسی زبان بودہ باآنکہ از وتا بہ آدم ادراک فہم بہیچ یکے از قبیلۂ او نمے تواں کرد خالی از فہمے نیست

---

[1] طبقاتِ اکبری۔ ص ۴۸۸۔ منوہر توسنی کے مفصل حالات کے لیے دیکھو سفینۂ خوشگو (قلمی) ج ۲ ورق ۹۳؛ گل رعنا (فہرست باکی پور لائبریری۔ ج ۸۔ ص ۱۳۰)؛ اکبرنامہ۔ ج ۳۔ ص ۴۲۲؛ کلکتہ ریویو ۱۸۷۱ء۔ اپریل نمبر؛ امرائے ہنود۔ ص ۳۴۳؛ مخزن الغرائب احمد علی سندیلوی (قلمی پروفیسر شیرانی)

[2] صحیح توسنی

وشعر فارسی مے گوید، ایں بیت از وست ؎

غرض ز خلقت سایہ ہمیں بود کہ کسے

بنورِ حضرت خورشید پائے خود ننہد"

صاحب مآثر الامرا[1] نے یہ شعر انتخاب کیا ؎

یگانہ بودن ویکتا شدن زچشم آموز

کہ ہر دو چشم جدا و جدا نمے نگرند

انیس العاشقین زخمی میں منوہر کی ایک مثنوی کا ذکر موجود ہے جس کے کچھ اقتباسات مخزن الغرائب میں درج ہیں۔ مثلاً

الٰہی سینہ کن با عشق دمساز دلے دہ معدنِ گنجینۂ راز

بدل داغِ محبت جاوداں دہ نشانِ مہر خود بر ورقِ جاں دہ

امیدِ من زتو انعامِ عام است کہ نومیدی ز درگاہت حرام است

نمی دانم خدا یا کفر و دیں چیست گرفتارِ کمند این و آں کیست

حضرت علیؓ کی مدح میں لکھا ہے:۔

تعالی اللہ عجائب بارگاہست کہ غیر از کعبہ و بُتخانہ راہست

علیؓ بگزیدۂ لطف الٰہ است بہ محشر مہرباں را عذرخواہ است

نہ گنجد وصفِ حیدر در بیانہا بود در منقبت قاصر زبانہا

تذکرۂ خوشنویساں میں لکھا ہے:۔

"از صغرِ سن در حجرۂ شفقت حضرت خلیفۂ الٰہی نشو و نما یافتہ در خدمتِ شاہزادۂ کامگار سلطان سلیم خط و سواد پیدا کردہ، سلیقۂ شاعری و خوشخطی بہم رسانیدہ۔"

---

[1] ج ۳۔ ص ۱۱۶، ۱۱۷

نشترِ عشق میں لکھا ہے:۔

"فکر شعر بروانی وسلاست می فرمود" او اول شعرائے ہندوست کہ نامش تا ایران زمیں رسیدہ، میرزا صائبا مرحوم از کلام او ایں بیت راکہ می آید، پسندیدہ داخل بیاض خود نمودہ با وجود ظلمت شہرتی خود را محمد منوہرے نامد...... ازاں خوش مقال است":۔

از اثر یک نگہ اوست مست ہم بت وہم تبکدہ ہم بت پرست

زاہد کعبہ پرستی تو وما دوست پرست
تو بایں عقل مسلمانی ومن برہنم

۳۔ کرشنا داس | برٹش میوزیم لندن کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست میں ہمیں ایک کتاب ملی ہے جو کرشنا داس اکبری کی لکھی ہوئی ہے۔

یہ کتاب نہایت مختصر سی ہے یعنی ۱۵۷ مصرعوں میں فارسی سنسکرت کی ایک لغت تیار کی گئی ہے۔ جس کی تیاری کا حکم خود شہنشاہ اکبر نے دیا تھا۔ اگر برٹش میوزیم کی اطلاع صحیح ہے تو یہ مختصر سا مجموعہ ہمیں اس زمانے کے ترجمے کی سرگرمیوں کے سلسلے میں کچھ مفید معلومات دے گا۔

تیسرا باب

جہانگیر سے فرخ سیر تک

(از سنہ ۱۰۱۴ھ تا سنہ ۱۱۲۴ھ)

تیسرا باب

(از عہدِ جہانگیری ۱۰۱۴ھ تا جلوس فرّخ سیر ۱۱۲۴ھ)

[اس باب میں اُن ہندو فضلا کا ذکر ہوگا جو ۱۰۱۴ھ سے لے کر ۱۱۲۴ھ تک مشہور ہوئے۔ (یعنی نورالدین جہانگیر کی تخت نشینی سے لے کر عہد فرخ سیر تک) ہندوؤں نے اس عہد میں بہت سا کارآمد اور عمدہ لٹریچر پیدا کیا اور علم و فضل کی تقریباً تمام شاخوں میں نام پیدا کیا۔ لیکن ان علما و فضلا کے تفصیلی ذکر اور اُن کے تحلیلی و تنقیدی مطالعے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سرسری طور پر اُس ماحول کا ذکر کیا جائے جس میں یہ لٹریچر پیدا ہوا۔]

جہانگیر کی حکمتِ عملی

نورالدین جہانگیر اگرچہ اپنے نامور باپ سے ذہنی طور پر کم درجے پر تھا۔ تاہم اس کی طبیعت میں علمی مذاق موجود تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ اُس کی رواداری اور بے تعصبی اپنے باپ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اُس نے ہندوؤں کو اپنے عہد حکومت میں ذمّہ دار عہدے دیے اور نہایت اہم مناصب اُن کے سپرد کیے۔

رائے گفنسور جہانگیری عہد میں دیوان کے منصب پر فائز تھا[1]۔ اس زمانے کی تاریخوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر نے سیاسی اور تعلیمی حکمت عملی کے نفاذ میں اکبر کی پوری پوری پیروی کی۔ جہانگیر نے حکم دیا کہ کوئی مسلمان ہندوؤں

---

[1] تزک جہانگیری (طبع سرسید) ص ۱۸: اقبال نامۂ جہانگیری ص ۳۰۶

کو جبراً مسلمان نہ بنائے[1]۔ اس کے عہد میں بعض بڑے بڑے مندر مثلاً متھرا میں گوبند دیوی کا مندر تعمیر ہوئے۔ جہانگیر ہندوؤں کی اکثر تقاریب میں بنفس نفیس شامل ہوتا تھا۔ دیوالی کے تیوہار پہ باقاعدہ دربار منعقد کرتا تھا[2]۔ شوراتری پر ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں کو بلاتا۔ سلونو کے موقعہ پر اپنے ہاتھ پر ہندوؤں کی طرح راکھی باندھتا تھا[3]۔

بادشاہ کو جوتک رائے منجم[4] کے فیصلوں میں بہت اعتقاد تھا۔ چنانچہ یہ منجم کئی دفعہ سونے کے ساتھ تولا گیا۔ راجہ سورج سنگھ نے ایک دفعہ ایک ہندو شاعر کو دربار میں پیش کیا جس نے ایک ہندی نظم پڑھی۔ بادشاہ اس نظم سے اس قدر محظوظ ہوا کہ اس نے شاعر کو ایک ہاتھی بخش دیا۔

جہانگیر تزک میں جدروپ سنیاسی[5] کی ملاقات کا واقعہ خود بیان کرتا ہے۔ یہ ملاقات پورے چھ گھنٹے تک ممتد رہی۔ جہانگیر اس سنیاسی کے فضل و کمال، اس کی خدارسی اور دانش مندی کا بہت معترف تھا چنانچہ لکھتا ہے:۔

"طریق زیست و زندگانی او بریں نہج است کہ نوشتہ شدہ۔ خواہان ملاقات مردم نیست لیکن چوں شہرت تمام یافتہ مردم بدیدن او مے روند۔ خالی از دانش نیست علم بیدانت را کہ علم تصوف باشد خوب ورزیدہ۔۔۔۔ سخنان خوب مذکور ساخت چنانچہ خیلے در من اثر کرد۔۔۔۔۔۔۔ الخ"

اسی طرح تزک میں رودر بھٹا چارج[6] کی ملاقات کا بھی تذکرہ کیا ہے جس

۱؎ تزک (ترجمہ راجرز) ص ۲۰۵ ۲؎ تزک (سرسید) ص ۱۱۹ ۳؎ ایضاً

۴؎ تزک (سرسید) ص ۲۸۵، ۳۲۵ ۵؎ تزک (سرسید) ص ۱۸۵، ۱۸۶؛ بینی پرشاد جہانگیر ص ۲۷۶؛ اقبال نامہ جہانگیری ص ۴۵ وغیرہ ۶؎ تزک ص ۳۲۹

کی علمیت اور فضیلت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :-

" دریں ایام رو در بھٹا چارج نام برہمنے کہ از دانش وران
این گروہ مطالبِ عقلی و نقلی را خوب ورزیدہ و در فن خود تمام ست الخ"[1]

جب خان عالم کو سفیر بنا کر ایران روانہ کیا گیا تو اس کے ساتھ بشن داس مصور کو بھی بھیجا تاکہ شاہ عباس کی تصویر اُتار کر لائے۔ یہ بشن داس اس زمانے کا بلند پایہ مصور تھا جس کے فن کو جہانگیر کی معارف پروری نے ضرور ترقی دی ہو گی۔

عہدِ اکبری کے بیان میں ہم نے ایک شاعر کا ذکر کیا ہے جس کا نام مرزا محمد منوہر توسنی تھا جس نے زیادہ تر جہانگیر کی رفاقت میں تربیت پائی جہانگیر کا سلوک اپنی بادشاہی کے زمانے میں اس کے ساتھ بہت حد تک مربیانہ رہا۔ خود تزک میں اس کی شاعری اور قابلیت کا ذکر نہایت اچھے الفاظ میں کرتا ہے۔

شاہ جہاں

اگرچہ شاہ جہاں صاحبقراں کا سب سے بڑا کمال اس کی تعمیری سرگرمیوں میں پنہاں ہے تاہم تعلیمی ترقی اور علمی احیا و ترویج میں بھی وہ اپنے کسی پیش رو سے کم نہیں تھا۔ اس کا زمانہ ہندستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ امن اور خوش حالی کا زمانہ تھا اور مکاتب و مدارس کی بہتات، علوم و فنون کی کثرت اور علما و فضلا کا اجتماعِ عظیم صاف صاف بتلا رہا ہے کہ اس ہنگامۂ عمل میں اس بیدار مغز بادشاہ کا بہت بڑا حصہ تھا۔ شاہ جہاں نامہ اور عملِ صالح کی ان فہرستوں پر اگر نگاہ ڈالی جائے جن میں شعرا، فضلا، علما اور اربابِ فن کا تذکرہ کیا گیا ہے تو ہمیں یہ زمانہ علمی لحاظ سے ایک زریں عہد معلوم ہوتا ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ برنیر نے اس عہد کی تعلیمی پستی اور علم کی

---

[1] تزک (ترجمہ راجرز - ج ۲ - ص ۱۱۷)؛ تاریخ ذکاء اللہ - ج ۵ - ص ۳۴۸

کم رواجی کی افسوس ناک طور پر خلافِ واقعہ تصویر کھینچی ہی تو ہمیں تعجب ہوتا ہی
ہمیں رنج کے ساتھ کہنا پڑتا ہی کہ برنیر کا بیان سراسر غلط اور باطل ہی اور شاہ جہاں
کے زمانے کی علمی بلندی کے پیشِ نظر بہتان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ علمی
سرپرستی کے علاوہ شاہ جہاں موسیقی کا بہت بڑا قدردان تھا۔ اس کے دربار میں
مہاپاتر اور رام داس دو بہت بڑے موسیقی داں تھے۔ اس بادشاہ کے عہد میں مسلمانوں
میں علی العموم اور ہندوؤں میں علی الخصوص انشا، شاعری اور تاریخ کو جو ترقی حاصل
ہوئی وہ اس بادشاہ کی علم دوستی کی ایک بہت بڑی دلیل ہی۔

دارا شکوہ

داراشکوہ[1] شاہ جہاں کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس کی طبیعت تصوّف
اور فلسفے کی طرف مائل تھی۔ وہ عربی فارسی کے علاوہ ہندی اور
سنسکرت کا بھی بہت بڑا فاضل تھا۔ عمر کے آخری حصّے میں دارا کی طبیعت میں ویدانت
کی طرف بہت میلان پیدا ہوگیا تھا۔ باپ کے عہدِ حکومت میں جب اُسے بنارس کا
گورنر بنایا گیا تو اس نے بڑے بڑے فاضل برہمنوں کو ویدوں کے ترجمے کے لیے
بُلایا۔ اس کے ذہن پر ہندو علوم کا گہرا اثر موجود تھا۔ اُپنشد کو وحدانیت اور سرِّ الٰہی
کا منبع خیال کرتا تھا۔ اس کی انگشتری پر "پربھو" کا لفظ کندہ تھا۔
وہ ملّا شاہ بدخشی کا مُرید با صفا تھا اور اُن کی بہت عزت کرتا تھا۔ دارا نے
سفینۃ الاولیا کے نام سے اولیا و اصفیا کا ایک ضخیم تذکرہ لکھا ہی۔ اس کے علاوہ
اس نے ہندو علوم کی چند کتابوں کے ترجمے فارسی میں کیے یا کرائے ہیں۔ اپنشد
کا ترجمہ "سرِّ اکبر" یا سرّ الاسرار کے نام سے بہت مشہور ہی۔ کہا جاتا ہی کہ اُس نے

---

[1] داراشکوہ کے حالات کے لیے دیکھو سرکار۔ تاریخ اورنگ زیب۔ ج ۱، ص ۲۹۳-۳۰۲،
دیباچہ مجمع البحرین (طبع کلکتہ)۔ وغیرہ۔ یہاں پُرانے مآخذ سے استفادہ کرتے ہوئے مفصّل حالات دیے گئے ہیں۔

بھگوت گیتا[۱] اور یوگ وشِشتا کا ترجمہ بھی کرایا۔ دارا کی کتاب مجمع البحرین جس کو حال ہی میں پروفیسر محفوظ الحق صاحب نے شایع کیا ہے۔ ہندو اور اسلامی فلسفے کے مقاماتِ اتصال سے بحث کرتی ہے اور اس موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ داراشکو کو ہندو علما اور منشیوں سے بہت اُنس تھا اور وہ اُن کی حوصلہ افزائی سے کبھی دریغ نہ کرتا تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ عالمگیر ایک متعصب بادشاہ تھا جس نے ہندو رعایا کو اذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اورنگ زیب کی سیاسی حکمت عملی کچھ بھی ہو۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ ہم یہاں صرف اس کی تعلیمی سرگرمیوں کو مدنظر رکھیں گے جو ہندوؤں کی ترقی و تنزل پر بہت حد تک اثر انداز ہو سکتی تھیں۔ ۱۰۸۲ھ میں اس بادشاہ نے ایک فرمان جاری کیا کہ ہندو عاملوں، تعلقہ داروں، منشیوں اور متصدیوں کو برطرف کیا جائے اور اُن کی جگہ دفاتر میں مسلمانوں کو بھرتی کیا جائے چنانچہ خافی خان[۵۲] لکھتا ہے:-

"صوبہ داران و تعلقہ داران پیشکاران و دیوانیان ہنود را برطرف ساختہ مسلمانان مقرر نمایند و کروری محالات خالصہ مسلمان می نمودہ باشند"

علامہ شبلی[۵۳] "عالمگیر پر ایک نظر" میں لکھتے ہیں کہ اس فرمان کی ضرورت اس

---

[۱] پرنسپل محمد شفیع صاحب نے اس بیان میں یہ ترمیم کی ہے کہ برٹش میوزیم کے نسخوں میں گیتا کا ترجمہ ابوالفضل کی طرف منسوب ہے۔

[۵۲] خافی خان ج ۲۔ ص ۲۴۹ [۵۳] عالمگیر پر ایک نظر ص ۶۸

لیے محسوس ہوئی کہ شعبۂ مالیات کے اکثر حکام جو ہندو کالیستھ تھے رشوت[1] ستانی کے عادی ہو گئے تھے۔ بادشاہ نے اس بدانتظامی اور بے قاعدگی کے استیصال کے لیے سخت اور موثر قدم اٹھایا۔ یہی اصلاحی اقدام تھا جس کی وجہ سے سینکڑوں معمولی متصدی ملازمتوں سے برطرف ہوئے اور چونکہ ان مظلوموں یا سزا یافتہ لوگوں میں ہندوؤں کی کثرت تھی اس لیے اورنگ زیب کی بعض دوسری کوششوں سے متاثر ہو کر اس واقعے کو بھی یہ آب و رنگ دے دیا گیا ہے۔ یعینہٖ یہ خیال سید ہاشمی صاحب نے ایک مضمون کے دوران میں ظاہر کیا ہے جو موصوف نے "حقیقی عالمگیر" کے عنوان سے اسلامک کلچر[2] میں رقم فرمایا ہے۔

اس موقعے پر یہ بات ضرور مدّنظر رکھنی چاہیے کہ بادشاہ کا یہ اقدام سیاسی اعتبار سے غیر مؤثر ہوا۔ اس لیے کہ اس زمانے میں ہندوؤں نے سیاق و انشا اور دیگر امورِ دیوانی میں اتنی مہارت پیدا کر لی تھی کہ بادشاہ کو اپنے اس حکم پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ حکم ہوا کہ ازاں بعد نصف بخشی اور پیشکار آدھے مسلمان ہوں اور آدھے ہندو۔ چنانچہ خافی خاں[3] نے لکھا ہے۔

> بعد چندے قرار یافت کہ از جملہ پیشکاران دفتر دیوانی و بخشیان سرکار یک مسلمان و یک ہندو مقرر می نمودہ باشند"

---

[1] دستور العمل یوسف میرک جو شاہ جہاں کے عہدِ آخر کی تصنیف ہے اس بات کی تائید کرتی ہے۔

"واین مردم قانون گو کہ در ہر ملک دیدہ می شود ظاہر اکہ بادشاہان متقدمین ہمین صرف را بخاطر داشتہ نصب کردہ اند لیکن چوں اکثر ہندو اند و متدین نیستند و درمیان نیز ہمہ اُو فہرا متدین شدہ نیامدہ اند عمل آنہا برخلاف قانون تدین معلوم می شود ....."

(ق ۱۶ ب نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری)

[2] اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۲۶ء ص ۳۱۵، [3] خافی خاں ج ۲ ص ۲۴۹ - ۲۵۲

سرکار[1] نے بھی اپنی "تاریخ اورنگ زیب" میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے یہ حکم پہلے حکم سے تھوڑے دنوں بعد ہی جاری کر دیا گیا تھا اور قیاس کہتا ہے کہ اورنگ زیب کا پہلا حکم ابھی دائرۂ عمل میں آیا ہی نہ ہوگا کہ یہ دوسرا فرمان نافذ ہو گیا ہوگا مگر باوجود اس کے عہد عالمگیری میں ہندو ملازمین کی کثرت اور بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں پر فائز ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس فرمان کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ مولانا شبلی نے عہد عالمگیری کے متعدد اعلیٰ منصب داروں کی ایک فہرست تیار کی ہے جس میں تمام اُن لوگوں کو شامل کیا گیا ہے جو اس فرمان کے بہت بعد مرہٹوں کے ساتھ برسرِ جنگ رہے[2]۔

ہندوؤں کی تعلیم کے سلسلے میں بادشاہ کے ایک اور اقدام عمل کا ذکر بھی عام طور پر کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اورنگ زیب نے ہندوؤں کے معابد اور مکاتب کو منہدم کروا دیا تھا[3]۔ لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ بادشاہ کا یہ حکم عام نہ تھا بلکہ صرف ان معابد و مدارس کے ساتھ مخصوص تھا جو سیاسی طور پر اس قابل سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ پروفیسر جادوناتھ سرکار نے اپنی کتاب میں اورنگ زیب کی معابد شکنی کے واقعات کی جو تاریخی فہرست مرتب کی ہے اس میں ایسے واقعات بھی ہیں جن میں مورخ موصوف نے ہندو معبدوں اور مندروں کو امداد دینے کے واقعات کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا شبلی[4] "عالمگیر پر ایک نظر" میں لکھتے ہیں کہ بادشاہ کا یہ حکم صرف اُن مندروں کے لیے تھا جن میں بغاوت اور سرکشی کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی اور جو سازش اور طغیان کا مرکز بن چکے تھے۔ خافی خان لکھتا ہے کہ بادشاہ نے

---

[1] سرکار: تاریخ اورنگ زیب۔ ج ۳۔ ص ۳۱۵

[2] اس سلسلے میں فاروقی کی کتاب "اورنگ زیب" بھی ملاحظہ ہو۔

[3] مآثر عالمگیری۔ ص ۸۱۔ [4] عالمگیر پر ایک نظر۔ ص ۵۷

سنا کہ بعض مندروں اور مکتبوں میں مسلمان لڑکے بھی ہندوؤں سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بادشاہ نے اس کو سراسر خلافِ سیاست سمجھتے ہوئے ایسے معابد کے خلاف قدم اٹھایا۔ مآثرِ عالمگیری[1] میں لکھا ہے:۔

"بعرض خداوند دیں پرور رسید کہ در صوبہ ٹھٹہ و ملتان خصوص بنارس برہمنانِ بطالت نشان در مدارس مقرر بہ تدریس کتب باطلہ اشتغال دارند و راغبان وطالبان ہنود و مسلمان مسافت ہائے بعیدہ نمودہ جہت تحصیل علوم شوم نزد آں جماعہ گمراہ می آیند۔"

بادشاہ کے ان افعال کو قابلِ ملامت بھی قرار دیا جائے تو بھی اس کی حکمتِ عملی کا اثر فارسی تعلیم کی اشاعت وترویج پر مطلق نہیں ہوا۔ بلکہ جیسا کہ ہم آگے چل کر دکھائیں گے اس زمانے میں ہندوؤں نے پہلے سے بھی زیادہ فارسی کی طرف توجہ کی۔ ان مصنفین میں سے اکثر و بیشتر شاہی ملازم تھے اور اسی حیثیت سے فائدہ اُٹھا کر انھوں نے بہت سی عمدہ تاریخی کتابیں لکھیں۔

محمد اعظم و محمد معظم اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ مغلوں کی شان و شوکت میں بہت کچھ زوال آگیا تاہم اورنگ زیب کے دونوں بیٹے محمد اعظم اور محمد معظم ہونہار اور مدبر تھے۔ مغلیہ قوم کی ہیبت ہر طرف چھائی ہوئی تھی، اورنگ زیب کی وفات پر جانشینی کے لیے جو جھگڑا ہوا اس میں محمد معظم کو فتح حاصل ہوئی اور وہی تخت شاہی پر بیٹھا۔ ذیل کی سطور میں ہمیں ایسے مصنفین کا حال بھی ملے گا جو محمد اعظم کے دربار سے متعلق تھے لیکن انھیں اورنگ زیب کے زمانے کے مصنفین میں شمار کرنا چاہیے۔

---

[1] عالمگیر پر ایک نظر، ص ۷۵ [2] ایلیٹ۔ ج ۷۔ ص ۵۵۲

تاریخ ارادت خانی[1] میں لکھا ہے کہ محمد معظم ایک تعلیم یافتہ، سلیم المزاج اور مہذب بادشاہ تھا۔ وہ عام طور پر تمام مذاہب و ادیان کے رہنماؤں سے گفتگو میں مصروف رہتا اور فلسفہ و تصوف کی کتابوں کو شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ گورو گوبند سنگھ کے ساتھ دوستانہ روابط رکھتا تھا۔ وہ مرہٹوں اور راجپوتوں کے ساتھ بھی مصالحانہ سلوک روا رکھتا تھا۔ اگر قدرت نے اُسے کچھ سال اور زندہ رہنے کا موقع دیا ہوتا تو ہندوستان کی تاریخ کے ابواب کی ترتیب موجودہ ترتیب سے مختلف ہوتی۔ محمد معظم ۱۱۲۴ھ میں راہگرائے عالم جاودانی ہوگیا۔

دفاترِ دیوانی اور ہندو ہم نے ان سلاطین کی حکمتِ عملی کے اُن پہلوؤں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جن کا تعلق ہندوؤں کی تعلیم و ترقی سے تھا تاکہ اس بیان سے ہم اس عہد کے فارسی لٹریچر میں ہندوؤں کی کوششوں کے ساتھ اس کا کچھ تعلق دکھا سکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اکبر کے زمانے میں ہندوؤں نے جس سرعت اور قوت کے ساتھ فارسی کی طرف اقدام کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ بہت تھوڑے عرصے میں دفاترِ دیوانی پر چھا گئے، تصنیف و تالیف میں نام پیدا کیا اور باوجود مخالف حالات کے ان کی ترقی اور عروج میں مطلق کوئی فرق نہ آنے پایا۔ فرشتہ[2] عہدِ جہانگیری کے اواخر میں لکھتا ہے:-

"......... براہمہ .... قلادۂ نوکری در گردن نمی انداختند داوّل کسے کہ از فرقۂ براہمہ در دور سلاطین نوکری قبول کرد۔ گانگو پنڈت بود و تا حال کہ سنہ ۱۰۱۶ھ است۔ بخلاف سائر ممالک ہند خصوصاً دفتر بادشاہان دکن و نولیسندگی ولایات ایشاں بہ براہمنہ مرجوع است"

---

[1] ایلیٹ۔ ج ۷۔ ص ۵۵۲

[2] فرشتہ ج ۱۔ ص ۲۷۸

اس عہد کے لٹریچر کی بعض امتیازی خصوصیات

اس زمانے میں جو لٹریچر پیدا ہوا اُسے ہم بلحاظ مدارج تین حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:۔

(۱) ترجمے کا دَور

(۲) تاریخ و فنِ انشا کا دَور

(۳) عام تصنیفات کا زمانہ اور فارسی علوم کی اشاعتِ عام

اکبری عہد کے لٹریچر کا حال ہم پڑھ آئے ہیں۔ اکبری زمانے میں ہمیں کوئی خاص قابلِ قدر کتاب دستیاب نہیں ہوتی لیکن زیرِ بحث دَور میں ہندوؤں میں فارسی تعلیم کا ہمہ گیر شوق پیدا ہو چکا تھا۔ اس لیے جہانگیر کے عہد میں سب سے پہلی تصنیفات جو ہمیں ملتی ہیں وہ تراجم ہیں۔ اس معاملے میں ہندوؤں کی تصنیفات کا آغاز اور اُن کی ترقی کا حال دنیا کی باقی زبانوں سے بہت حد تک مشابہ ہے۔ کیونکہ یہ مسلّم ہے کہ تصنیفی قابلیت کے پیدا ہونے سے پہلے عموماً تراجم کی طرف ہی توجہ کی جاتی ہے۔ بنا بریں جہانگیر کے عہد کو "تراجم کا عہد" کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے زمانے میں انشا اور تاریخ نگاری کو بہت تقویت حاصل ہوئی۔ علی الخصوص تاریخ میں ہندوؤں نے ایسا کمال پیدا کیا کہ اس عہد کی تاریخیں بلحاظ ثقاہت، جدت اور اعتبار کے تمام زمانوں سے بڑھی ہوئی ہیں۔ خلاصۃ التواریخ وغیرہ ہنود کی بہترین تاریخیں ہیں جن کا مقابلہ بعد کی کتابیں نہیں کر سکتیں۔ اورنگ زیب کی حکومت کے اواخر میں ہندوؤں میں فارسی علوم بہت رواج پا گئے تھے۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب نے جب ہندو متصدیوں کو برطرف کرنے کا ارادہ کیا تو اُسے اپنے اس عزم میں سخت ناکامی ہوئی۔ یہ ہندوؤں میں فارسی کی اشاعت عام کا زمانہ تھا۔

اس سلسلے میں بعض اور اُمور کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اولاً یہ

کہ ہندوؤں کے اس زمانے کے فارسی لٹریچر کا مطالعہ کرنے سے تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح ایک قوم اس قدر جلد مسلمانوں کے خیالات، اُن کی تعلیم، اُن کے طرزِ بیان سے کُلی طور پر واقف ہوگئی۔ حالانکہ اسے مذہبی طور پر ان علوم کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ اس صورتِ حال سے ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ اعلیٰ ذہانت کے علاوہ ہندوؤں کے اندر زمانہ شناسی کا زبردست ملکہ موجود ہے۔ وہ فطری طور پر جانتے ہیں کہ ماحول کے ساتھ تطابق سے کتنی برکات کا نزول ہوتا ہے۔ اور زمانے کی عام روش سے متصادم ہونا کس حد تک مذموم ہے۔

دوم۔ ہندوؤں کا فارسی ادب اور دیگر معاشرتی حالات بتاتے ہیں کہ مغل بادشاہوں نے ان ہندو مصنّفین کی ہمیشہ قدر افزائی کی اور انھوں نے عام ہندو رعایا کو مسلمانوں کے قریب تر لانے کی کوشش کی۔ چہار چمن میں چندر بھان برہمن شاہجہاں کی اُن عنایات کا تفصیل سے تذکرہ کرتا ہے جو وقتاً فوقتاً اس کے حق میں صادر ہوتی رہیں۔ ولی رام، برہمن اور دوسرے ہندوؤں کے ساتھ دارا شکوہ کی فیاضیوں کا تذکرہ بھی کتابوں میں ملتا ہے۔ یہ مصنّف عموماً بادشاہوں کی ملازمت میں ہوتے تھے جہاں انھیں اپنی تاریخی تصنیفات و تالیفات کے لیے اچھا خاصہ مواد مل سکتا تھا نیز یہ لوگ چونکہ اکثر واقعات کے عینی شاہد ہوتے تھے اس لیے ان تاریخوں کو جو اعتبار اور صحت حاصل ہو سکتی ہے اس سے دوسرے لوگ کہاں بہرہ یاب ہوسکتے ہیں۔ اس زمانے میں جو تاریخی کتابیں لکھی گئی ہیں اُن سے پروفیسر جادو ناتھ وغیرہ مصنّفین عہدِ حاضر نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا ہے۔ اس عہد میں بہت سے نامور ہندو شاعر پیدا ہوئے ان میں سے دو تین کا درجہ بہت بلند ہے باقی شعرا میں سے جن کا ذکر آئندہ ابواب میں ہوگا معدودے چند ہی ان کے شاعرانہ کمال کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ انشا کی کتابیں نہ بلحاظ ادب بلکہ باعتبار تاریخی کتب کے بھی بہت شہرت رکھتی ہیں۔ ان اشارات کے ساتھ ہم اس زمانے

کے لٹریچر کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں۔ ہم ہر مضمون کی کتابوں کو علیحدہ علیحدہ گنائیں گے اور پھر ان میں سے جو زیادہ کار آمد اور مشہور ہوں گی اُن کا تذکرہ زیادہ شرح وبسط کے ساتھ کیا جائے گا۔ کتابوں کی ترتیب زمانی کو خاص طور پر مدنظر رکھا گیا ہے۔

اس عہد کی تاریخیں اور مؤرّخ

ذیل میں سب سے پہلے لایق ذکر تاریخی کتابوں کی ایک فہرست دی جاتی ہے اس کے بعد نامور مؤرخین کا مفصل تذکرہ اور اُن کی کتابوں کے متعلق تبصرہ کیا جائے گا۔ جو کتابیں متوسط درجے کی ہیں اُن کے متعلق بھی مناسب تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ سجان رائے بٹالوی، بندرابن داس بہادر شاہی اور نراین کول عاجز اس عہد کے مشہور مؤرخ ہیں۔

تاریخی تصانیف کی فہرست

(۱) چہار چمن[۱] مصنفہ چندربھان برہمن (۱۰۵۷ھ) یہ اگرچہ ایک قسم کی انشا ہے لیکن بحیثیت تاریخ کے بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ سر جادوناتھ سرکار نے اس کو شاہ جہاں کی تاریخ کے سلسلے میں استعمال کیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اپنے تفصیلی حالات قلمبند کیے ہیں۔ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے اُمرا و وزرا کے حالات بھی ہیں۔ شاہ جہاں کی روزمرہ زندگی کا پروگرام بتایا گیا ہے اور اُن مواقع کا ذکر کیا ہے جن میں برہمن نے شاہ جہاں کے سامنے اپنی غزلیں پڑھیں۔ آخر میں کچھ خطوط بھی ہیں جن میں سے بیشتر منشآت میں موجود ہیں۔ ملا قوسی نے چہار چمن کے متعلق کہا تھا ؎

چار چمن ساختہ برہمن ‏ مے زند از عالم دیگر سخن

---

[۱] ریو۔ ج ۳۔ ص ۹۳۵

(۲) راجاولی مصنّفہ بنوالی داس ولیؔ[۱] داراشکوہی (سنہ ۱۰۶۱ھ) یہ رسالہ صرف ہندو راجایان قدیم کے حالات پر مشتمل ہی اور کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔

(۳) شاہ جہاں نامہ مصنّفہ بھگونت داس[۲] بندۂ درگاہ۔ یہ رسالہ شاہ جہاں کے زمانے میں لکھا گیا جو ہ "منظوقوں" پر مشتمل ہی مغلیہ خاندان کا آدم علیہ السلام سے لے کر شاہ جہاں کی تخت نشینی تک کا حال دیا گیا ہی۔ تاریخ کے اعتبار سے چنداں اہم نہیں۔

(۴) گوالیار نامہ[۳] مصنّفہ منشی ہیرامن ولد گردھرداس (سنہ ۱۰۷۸ھ) ہیرامن معتمد خاں گورنر کا منشی تھا۔ یہ گوالیار کی تعمیر سے لے کر معتمد خاں کی گورنری تک کی تاریخ ہی۔ کتاب زیادہ تر جلال حصاری کی اسی نام کی ایک کتاب پر مبنی ہی بلکہ اس سے ماخوذ ہی۔ اور سوائے معتمد خاں کے عہد نظامت کے حالات کے اس کو کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہیں۔

(۵) لُبّ التواریخ مصنّفہ بندرابن داس بہادرشاہی (سنہ ۱۱۰۱ھ تا سنہ ۱۱۰۵ھ) (اس کا مفصّل حال آگے آتا ہی)

(۶) خلاصۃ التواریخ مصنّفہ سجان رائے بٹالوی (سنہ ۱۱۰۷ھ) (اس کا مفصّل حال آگے آتا ہی)

(۷) فتوحاتِ عالمگیری[۴] مصنّفہ ایشر داس ناگر (تقریباً سنہ ۱۱۰۹ھ) ایشر داس ناگر پٹن ضلع گجرات کا باشندہ تھا۔ وہ پہلے قاضی عبدالوہاب قاضی لشکر کی ملازمت

---

[۱] ولیؔ کے حالات کے لیے دیکھو تذکرۂ حسینی (قلمی) ورق ۲۹۳، گلزار حال کا دیباچہ۔ گل رعنا (بانکی پور) ورق ۴۸۴۔ روز روشن ۷۶۸، راجاولی کے لیے دیکھو ریو ج ۳: خلاصۃ التواریخ صفحہ ۷

[۲] پنجاب پبلک لائبریری میں اس کا ایک نسخہ ہی۔ [۳] ریو ج ۱۔ ص ۳۰۳ معارف ۱۹۱۰

[۴] ریو ج ۱۔ ص ۲۶۹۔ معارف ۱۹۱۸۔ سرکار تاریخ اورنگ زیب ج ۱ دیباچہ ج ۔ ص ۳۵

میں رہا۔ زاں بعد شجاعت خاں عامل گجرات کے متصدیوں میں شامل ہوگیا۔ کتاب چار سوانح پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر جی۔ بر ڈ نے تاریخ گجرات کی ترتیب میں اس کتاب سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے۔ سر جادو ناتھ سرکار نے بھی تاریخ اورنگ زیب میں اس سے مدد لی ہے۔ یہ کتاب مالوہ اور راجپوتانے کے حالات کے متعلق مستند ہے لیکن شمالی ہندستان کے حالات میں اس سے غلطی سرزد ہوتی ہے۔ یہ کتاب ایشر داس کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔

(۸) اعظم الحرب[۱] مصنفہ کامراج (۱۱۲۰ھ) یہ محمد اعظم شاہ کی تاریخ ہے مصنف محمد اعظم کا ملازم تھا اور یہ تاریخ اُن عنایات کے صلے میں لکھی گئی ہے جو مصنف پر شہزادہ موصوف نے کیں۔

(۹) عبرت نامہ[۲] مصنفہ کامراج (۱۱۳۱ھ) یہ گزشتہ تاریخ کی نسبت زیادہ ضخیم ہے اور ۱۱۱۸ھ سے لے کر ۱۱۳۱ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے۔

(۱۰) منتخب التواریخ مصنفہ جگجیون داس[۳] (۱۱۲۰ھ) ولد منوہر داس ساکن گجرات، وہ ڈاک کا مہتمم تھا۔ ۱۱۰۹ھ میں محمد معظم نے اُسے وقائع نگار مقرر کیا۔

(۱۱) دل کشا مصنفہ بھیم سین (۱۱۲۰ھ)

(۱۲) تاریخ کشمیر مصنفہ نرائن کول عاجز (۱۱۲۲ھ)

(۱۳) تاریخ مرہٹہ مصنفہ دھونکل سنگھ منشی[۴] (۱۱۲۱ھ) مصنف رنجیت سنگھ جاٹ والیِ بھرتپور کا ملازم تھا۔ یہ کتاب ۱۸۰۳ء سے لے کر ۱۸۰۵ء تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ ان جنگوں میں رنجیت سنگھ جاٹ نے جو کارہائے نمایاں کیے ہیں ان کا تذکرہ بہت مفصّل ہے۔

۱؎ ریو۔ ج ۳۔ ص ۹۳۷ ۲؎ انڈیا آفس کیٹلاگ عدد ۳۹۱ ۳؎ معارف ۱۹:۸

۴؎ ریو۔ ج ۱۔ ص ۲۷۱۔ ماڈرن ریویو ۱۹۱۹ (جلد ۲۶) ص ۱۱۷، انڈیا آفس عدد ۴۴۵

یہ اس عہد کی تاریخی کتابوں کی مکمل فہرست ہے۔ ان میں سے ہم خلاصۃ التواریخ (نمبر۵)، لب التواریخ (نمبر۶) تاریخ دل کشا (نمبر۱) اور تاریخ کشمیر نرائن کول عاجز (نمبر۱۲) کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں۔

بندرا بن داس بہادر شاہی

لُبّ التّواریخ ہند

لب التواریخ ہند کا مصنف بندرا بن داس ولد رائے بھارا مل تھا۔ رائے بھارا مل پہلے پہل شاہ جہاں کے معمولی منشیوں میں ملازم ہوا لیکن اس کے بعد اپنی بے نظیر ذہانت، دیانت اور قوتِ عمل سے ترقی کرتے کرتے پنجاب کا دیوان مقرر ہوا۔ ۲۰ سن جلوس شاہ جہانی میں اس کو دوبارہ پائے تخت میں واپس بلا لیا گیا اور اس کو رائے ہزاری ذات کی عزت سے مفتخر کیا گیا۔ اس سے پہلے وہ شہزادہ داراشکوہ کے ماتحت دیوان کُل کے عہدے پر فائز رہ چکا تھا۔

بندرا بن داس کا اپنا بیان ہے کہ رائے بھارا مل کی وفات کے بعد اورنگ زیب نے اُسے رائے کا خطاب دیا۔ محمد معظم بہادر شاہ کی شاہزادگی کے ایام میں ہمارا مصنف بعہدہ دیوان کام کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بندرا بن کو عام طور پر بندرا بن داس بہادر شاہی کہا جاتا ہے۔ مصنف کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایلیٹ کا بیان ہے کہ چونکہ مصنف ایسے حالات اور ایسے ماحول کا تربیت یافتہ تھا۔ اس لیے قرین قیاس ہے کہ اس کے مرتب کردہ حالات بہت حد تک عینی مشاہدات کا مجموعہ ہوں گے۔

---

[۱] بندرا بن داس اور لب التواریخ کے لیے دیکھو ایلیٹ ج ۷۔ ص ۱۶۸؛ ریو ج ۱ ص ۲۲۸

امرائے ہنود۔ ص ۱۱۔ خافی خاں۔ ج ۲۔ ص ۲۱۷؛ ج ۲، ص ۳۰۴، ۳۲۱

لب التواریخ ہندستان کی عمومی تاریخ ہی جو شہاب الدین غوری سے لے کر سنہ ۱۱۰۱ھ تک کے حالات پر مشتمل ہی۔ مصنّف نے اسی سال یہ کتاب ختم کی بعض اور قرائن کے پیشِ نظر کتاب کی تاریخ تالیف میں اختلاف پیدا ہو گیا ہی لیکن ہر صورت میں کتاب کی تاریخ تصنیف سنہ ۱۱۰۱ھ اور سنہ ۱۱۰۵ھ کے درمیان تسلیم کرنی پڑے گی۔

یہ کتاب دس فصول پر منقسم ہی۔ ہر فصل کئی کئی شعبوں پر مشتمل ہی۔ ذیل میں کتاب کی سرسری فہرست مضامین پیش کی جاتی ہی۔

فصل اوّل : سلاطین دہلی
فصل دوم (۶ شعبے) فرمانروایان دکن
〃 سوم : سلاطین گجرات
〃 چہارم : فرماں روایان برہانپور
〃 پنجم : فاروقی سلطنت
〃 ششم : حکّامِ بنگال
〃 ہفتم : شرقی حکومت جونپور
〃 ہشتم : اُمرائے سندھ
〃 نہم : فرماں روایان ملتان
〃 دہم : سلاطین و فرماں روایان کشمیر

بندرا بن داس کتاب کے دیباچے میں لکھتا ہی کہ سنہ ۱۱۰۱ھ تک اورنگ زیب کی حکومت میں بہت وسعت پیدا ہو گئی تھی اس لیے ایک نئی تاریخ مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی لہٰذا مصنّف نے ایک مختصر رسالہ لکھنے کا عزم کیا جس میں عہدِ اورنگ زیب کا حال زیادہ وضاحت اور شرح و بسط کے ساتھ لکھا جا سکے۔ گزشتہ تاریخ کے متعلق مصنّف نے زیادہ تر فرشتہ کو پیشِ نظر رکھا ہی جو مصنّف کا سب سے بڑا ماخذ تھا لیکن ۱۰۰۰ سے ۱۱۰۰ تک کے حالات ذرا تفصیلی ہیں۔ کتاب کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ بندرا بن نے فرشتہ کے علاوہ اکبر نامے اور جہانگیر نامے کو بھی استعمال کیا ہی۔

خافی خاں منتخب اللباب میں اس تاریخ پر اظہار خیال کرتے ہوئے

لکھتا ہے:۔ کہ

"چوں مسموع گردید کہ بندرا بن داس بہادر شاہی کہ مدت مدتے) درایام بادشاہزادگی متصدی حضرت شاہ عالم بود تاریخے تالیف نمودہ۔ درآں سوانح سی وچند سال را با حاطہ بیان درآوردہ است۔ از استماع آں بغایت مشغوف گشتہ۔ در بہم رسانیدن آں تاریخ نہایت تفحص بکار بُرد۔ بعدہ کہ بسعی بسیار آں نسخہ را بدست آوردہ باُمید آنکہ از خرمن اندوختۂ او خوشہ چینی نماید از روئی غور من اولہ الیٰ آخرہ بمطالعہ درآوردہ نصف آنچہ راقم الحروف جمع ساختہ دریں اوراق باحاطۂ بیان درآوردہ بہ نظر نیامد"۔

ہمارا خیال ہے کہ صاحب منتخب کی رائے ذرا سخت ہے۔ کتاب کا پہلا حصّہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے محض فرشتہ کا خلاصہ ہے۔ لیکن عصری تاریخ میں لب التواریخ خاصی قدر و قیمت رکھتی ہے۔ صاحب منتخب جو تقریباً ایک صدی کے فاصلے پر ہے لب التواریخ کی عینی شہادتوں کے مقابلے میں زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ایک اور امر جو خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ یہ تاریخ ہماری معلومات کے مطابق سب سے پہلی عمومی تاریخ ہے جو ایک ہندو کے قلم سے نکلی ہے۔ میجر سکاٹ نے "تاریخ دکن" کی ترتیب میں اس سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے اور الیٹ اور ڈوسن نے اس کے بعض اقتباسات کے تراجم اپنی تاریخ ہند میں شامل کیے ہیں۔

بندرا بن کا انداز تحریر سادہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان پر مصنف کو کافی قدرت تھی۔

سجان رائے بٹالوی

خلاصۃ التواریخ اس تاریخ کا مصنف سجان رائے بٹالوی تھا وہ ذات کا کھتری اور متصدی پیشہ تھا۔ غالب گمان یہ ہو کہ ان کے خاندان میں قانون گوئی وراثتاً رائج تھی۔ مصنف نے اس کتاب میں اپنا نام تک بھی نہیں لکھا۔ اگرچہ زبان اور بعض اور قرائن سے یہ معلوم ہوجاتا ہو کہ مصنف ضرور کوئی ہندو ہوگا۔ سجان رائے کو بعض اوقات غلطی سے سُبحان رائے، سحاب رائے، سنجان رائے وغیرہ بھی پڑھ دیتے ہیں۔

خلاصۃ التواریخ[1] سے جو حالات معلوم ہوسکے ہیں وہ صرف اتنے ہی ہیں کہ مصنف بٹالہ میں پیدا ہوا، کابل کا سفر کیا، ٹھٹہ اور پنجور کی سیر و سیاحت کی، خاندانی پیشہ منشی گری تھا۔

سجان رائے کی ایک اور تصنیف خلاصۃ المکاتیب[2] سے معلوم ہوا کہ سجان رائے کا ایک بیٹا رائے سنگھ تھا۔ مولانا امان اللہ حسینی جو اس عہد کے ایک بڑے فاضل تھے مصنف کے دوست تھے۔ سجان رائے سنہ ۱۱ھ تک شاہی ملازمت سے مستعفی ہوچکا تھا۔

سجان رائے کی تصانیف صرف دو تک ہی محدود ہیں (۱) خلاصۃ التواریخ (۲) خلاصۃ المکاتیب جو فن انشا و نثر میں ایک مبسوط کتاب ہو اور رائے سنگھ کی خاطر لکھی گئی تھی۔

ہندوؤں کی تمام تاریخوں میں سے صرف خلاصۃ التواریخ کو یہ شرف حاصل ہو کہ اس پر مشرق اور مغرب کے متعدد ... نے اپنی توجہ مبذول کی

---

[1] خلاصہ ص ۴۱، ۸۶؛ ۱۲۶، ۳۵ [2] خلاصۃ المکاتیب (قلمی)۔ ق ۳

ہو۔ غالباً اس کتاب پر سب سے پہلا مضمون میجر نساؤ لینر کے قلم سے نکلا اور جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں طبع ہوا (سلسلۂ جدید۔ ج ۳)، ایلیٹ نے "ہندستان کی کہانی اس کے اپنے مؤرخوں کی زبانی" میں ایک پُرمغز مضمون لکھا۔ مگر وہ مضمون ذرا جادۂ اعتدال سے ہٹا ہوا ہو اور صاحبِ مضمون نے رائے کے اظہار میں بہت سختی سے کام لیا ہو۔ ایچ بیورج نے بھی اس کتاب پر ایک بلند پایہ مضمون لکھ کر ایشیاٹک سوسائٹی کے جلسے میں پڑھا۔ اس مضمون میں اگرچہ بعض اوقات بے معنی تاویلات سے کام لیا گیا ہو لیکن بحیثیت مجموعی یہ مضمون بہترین ہو۔ موجودہ مصنفین میں سے پروفیسر جادو ناتھ سرکار نے اس کے بعض ضروری حصص کا ترجمہ کیا ہو اور اپنی کتاب "ہندعہدِ اورنگ زیب میں" شامل کیا ہو۔ پرنسپل محمد شفیع صاحب ایم۔ اے کا لکھا ہوا ایک مختصر سا شذرہ "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" میں بھی موجود ہو۔ ان کے علاوہ برٹش میوزیم لندن اور بانکی پور لائبریری کی فہرست مخطوطات میں کتاب پر اچھی بحث کی گئی ہو۔

خلاصہ اور مختصر التواریخ

ایلیٹ صاحب[1] اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ یہ کتاب ایک شرم ناک سرقہ ہو اور اس کے مطالب ایک اور تاریخ سے جس کا نام مختصر التواریخ ہو چُرائے گئے ہیں۔ ایلیٹ صاحب کی برہمی کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ سجان رائے نے بہت سی نئی اور پُرانی کتابیں اپنے مآخذ میں گنائی ہیں لیکن جس کتاب کو وہ حرف بحرف نقل کرتا ہو اس کا ذکر تک بھی نہیں کرتا۔ اب ذرا اس مختصر کی حقیقت بھی سُن لیجیے۔ ایلیٹ صاحب کو ایک ناتمام سی کتاب کہیں سے دستیاب ہوئی جس کا نہ آغاز تھا نہ انجام۔ اس پر مختصر التواریخ "لکھا ہوا تھا، عبارت بہت حد تک خلاصۃ التواریخ سے ملتی تھی۔

---

[1] ج ۸۔ ص ۵۔ ۱۲

ایلیٹ صاحب کو خیال ہوا کہ یہ کوئی پُرانی کتاب ہی جو جہانگیر کے زمانے تک آتی ہی اور سجان رائے نے اس کتاب کو بلا تذکرہ نقل کیا ہو اور یہ ایک "شرم ناک فعل" ہی۔ اب اگر اس معمّے پر غور کیا جائے تو تین صورتیں دماغ میں آتی ہیں۔ اولاً ممکن ہی کہ یہ دونوں کتابیں سجان رائے کی ہوں اور مختصر خلاصۃ التواریخ کا ابتدائی خاکہ ہو۔

دوم یہ کہ کسی کاتب نے خلاصۃ التواریخ کو لکھ کر یا اس کا خلاصہ تیار کرتے ہوئے اس پر "مختصر" کا لفظ لکھ دیا ہو۔

سوم ممکن ہی مختصر کے مصنّف نے خلاصہ سے سرقہ کیا ہو اور وہ ثانی الذکر سے مؤخر ہو۔ پہلی صورت کی تائید میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سجان رائے نے کتاب کو آخری شکل میں ڈھالنے سے پہلے کئی دفعہ لکھا نیز جہاں وہ اپنی کتاب کی غرض و غایت پر بحث کا آغاز کرتا ہی وہاں وہ اس کو "نسخہ مختصرے متضمن احوالِ فرماں روایانِ ماضیہ"[1] کے نام سے یاد کرتا ہی۔ ریو نے برٹش میوزیم مخطوطات کی فہرست میں اس صورت کی تصدیق کی ہی۔ دوسری شکل وہ ہی جس کا وقوع عام طور پر ہوتا ہی۔ چنانچہ کاتبوں کی انھی بے پروائیوں سے حافظ، خیام وغیرہ کے اشعار غلط طور پر دوسرے شعرا کے نام کے ساتھ منسوب ہو گئے ہیں۔ تیسری صورت کو بیورج ... نے پیش کیا ہی اور اس کے لیے دلایل بھی پیش کیے ہیں۔ اب مشکل یہ ہی کہ مختصر کا کوئی اور نسخہ موجود نہیں اس لیے ہمیں پہلی دو صورتوں میں سے کوئی ایک قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہی۔

الیٹ کے مقابلے میں نساؤلینہ صاحب نے دوسری انتہا کو اختیار کیا ہی وہ کہتے ہیں کہ آرایشِ محفل کے مصنّف نے خلاصۃ التواریخ کے مضامین کا سرقہ کیا ہی۔ حالانکہ شیر علی افسوس نے اس کتاب کے دیباچے میں خود اعتراف کیا ہی کہ یہ کتاب خلاصہ پر مبنی ہی۔ افسوس نے بعض بعض مقامات سے اس کی تصحیح بھی کی ہی اور

---

[1] خلاصۃ (ظفر حسن ایڈیشن) ص ۸۔

اس کے مضامین پر اضافہ کیا ہے۔

خلاصہ کے مضامین یہ تاریخ قدیم زمانے سے لے کر اورنگ زیب کی تخت نشینی تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں ایک پُر مغز دیباچہ ہے جس میں مصنف ۲۷، ۲۸ کتابوں کا ذکر کرتا ہے جو ترتیب کے وقت پیشِ نظر تھیں۔ اس کی تدوین میں دو سال کا عرصہ صرف ہوا اور ۱۱۰۷ھ کو پایۂ تکمیل کو پہنچی اورنگ زیب کی جانشینی کے ساتھ کتاب دفعتاً ختم ہو جاتی ہے لیکن بعض قلمی نسخوں کے آخر میں اورنگ زیب کی تاریخ وفات بھی درج ہے جو الحاقی معلوم ہوتی ہے۔

سب سے پہلے ہندوؤں کے مذہبی اعتقادات، ان کے مختلف فرقوں کے حالات ہیں پھر شہروں کے حالات ہیں۔ اس کے بعد ہندستان کے صوبوں کا جغرافیائی حال ہے۔ اس کے بعد یدھشٹر سے لے کر عہدِ اسلامی تک ہندو راجاؤں کے حالات ہیں۔ پھر سبکتگین سے لے کر بہلول لودھی تک کے واقعات دیے ہیں۔ آخر میں بابر سے لے کر اورنگ زیب تک مغلیہ سلاطین کے حالات دیے ہیں۔

ہندوؤں کا عہد کتاب کے ½ حصّے کے برابر ہے۔ اس میں ہندستان کی پیداوار مشہور شہروں کا حال اور ہندستان کی بعض خصوصیات بیان کی گئی ہیں مصنّف پنجاب کا باشندہ تھا اس لیے صوبہ لاہور یا پنجاب کا حال زیادہ مفصّل ہے مغلوں سے پہلے جو سلاطین حکمران رہے ان کا حال بہت معمولی ہے اور چنداں دقیع نہیں زیادہ تر فرشتہ کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ البتہ شیر شاہ کے حالات میں مصنّف نے اپنی آزادیِ رائے کا کافی ثبوت دیا ہے۔ اور اکبرنامہ وغیرہ کا تتبع نہیں کیا۔ غزنوی سلاطین میں سے صرف سات کا ذکر کرتا ہے۔ مغل بادشاہوں کے حالات زیادہ مفصّل ہیں لیکن شاہجہاں کا عہد بہت حد تک تشنہ ہے اور ناظرین کی توجہ کو وارث کے شاہجہاں نامے کی طرف مبذول کیا ہے۔ شاہجہاں کے بیٹوں میں تختِ نشینی کے لیے جو جنگ ہوئی

اس کا حال زیادہ مفصل ہے۔ صوبجاتی آزاد حکومتوں کا ذکر مستقل ابواب وفصول میں نہیں کیا بلکہ جس بادشاہ کے عہد میں ان کا الحاق مرکزی حکومت سے ہوا اس کے ساتھ ہی ضمنی طور پر ان کا بھی مختصر سا تذکرہ کر دیا گیا ہے۔ تحریر کا انداز یہ ہے کہ نثر کے ساتھ اشعار اور فرد بکثرت لائے گئے ہیں اور تاریخی عبارتوں میں بعض غیر متعلق مضامین بھی آجاتے ہیں جو حقیقت میں بہت مفید معلومات سے مملو ہوتے ہیں۔ اگرچہ تاریخ کے نقطۂ نگاہ سے یہ اندازِ نگارش زیادہ پسندیدہ نہیں خیال کیا جاتا۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس کتاب میں بعض اوقات ایسے بیانات آجاتے ہیں جن کا تعلق بہت بعد کے زمانے کے ساتھ ہے۔ مثلاً برٹش گورنمنٹ کا ذکر، کلکتہ کی عمارتوں کا ذکر وغیرہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضامین الحاقی ہیں۔

خلاصۃ التواریخ کے دو ضمیمے بھی ہیں جن سے ایک تو جگ کشن داس مہرہ کا لکھا ہوا ہے اور دوسرا کسی غیر معلوم مصنف کا ہے۔ ان دونوں ضمیموں میں ایک صدی بعد تک کے حالات درج ہیں۔

خلاصہ کی اہمیت میجر نساؤ لنیز[1] اس کتاب کے بے حد مداح ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کتاب ہندستان کی بہترین اور عمدہ ترین تواریخ میں سے ایک ہے۔ ایلیٹ صاحب[2] اگرچہ اس کتاب کی قدر و قیمت کے قایل ہیں لیکن انھیں یہ شکایت ہے کہ یہ سرقہ ہے۔ اس لیے وہ اس کے متعلق کوئی عمدہ رائے نہیں رکھتے۔ خان بہادر مولوی عبدالمقتدر خان صاحب بانکی پور لائبریری کی فہرست میں کہتے ہیں کہ جو کچھ اس میں ہے وہ فرشتہ میں بھی ہے۔ نیز ان کا خیال ہے کہ مصنف نے جتنی کتابوں کو مآخذ میں شمار کیا ہے ان سب کو نہیں دیکھا ہوگا۔

---

[1] جرنل۔ رایل ایشیاٹک سوسائٹی (سلسلۂ جدید۔ ج ۳) ۔ ۱۸۹۴۔ ص ۷۴۳ - ۷۶۸

[2] ایلیٹ۔ ج ۸۔ ص ۵ - ۱۴

بیورج ...... لکھتے ہیں:۔

"یہ نامناسب نہ ہوگا اگر ہم سجان رائے کو "ہندی ہیروڈوٹس" کہہ کر پکاریں۔ اس لیے کہ ان دونوں بزرگوں کی کتابوں میں صحیح اور دل کش تاریخ نگاری کے عناصر موجود ہیں اور دونوں غیر جانبدار مؤرخ ہیں۔ گارساں دی تاسی اسی لیے اس کتاب کو فرشتہ پر ترجیح دیتا ہے۔

لیکن ہم نہ تو سجان رائے کو ہیروڈوٹس کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں اور نہ فرشتہ کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے ہیں بلکہ سجان رائے کی تاریخ کی اصلی خوبیوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ سجان رائے نے فرشتہ سے بہت کچھ اخذ کیا ہے بلکہ اگر یہ کہیں کہ سب کچھ فرشتہ سے ماخوذ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ لیکن سجان رائے کی جغرافیائی معلومات شہروں کے حالات، ملک کی پیداوار اور اس قسم کی باتیں فرشتہ میں نہیں ملتیں۔ فرشتہ نے صوبجاتی حکومتوں کا مفصّل تذکرہ کیا ہے۔ سجان رائے نے انھیں نظر انداز کر دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں کی غرض و غایت اس قدر مختلف ہے کہ ان کا مقابلہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ سجان رائے میں آزادی رائے اور دیانت کا جوہر معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور چیز جو اس کتاب میں سب سے نمایاں حیثیت رکھتی ہے یہ ہے کہ مصنّف کے قلب میں اپنی قومیت کا زبردست احساس موجود ہے جو باوجود ضبط کے نمایاں ہو کر رہتا ہے۔ شخصی حکومتوں میں اس خودداری کی توقع بہت کم ہوتی ہے لیکن ہمارا مصنّف اپنی رائے اور رجحانات کا باقاعدہ اظہار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس مضمون کی ابتدا میں کہا تھا کہ بعض امور ایسے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف ہندو ہے۔ حالانکہ ایلیٹ صاحب لکھتے ہیں کہ کتاب میں کوئی ایسی چیز نہیں (بجز بکرمی سن کے) جو مصنّف کے ہندو ہونے پر دلالت کرتی ہو۔

مذہب کے متعلق جس طریق سے سجان رائے نے اظہار خیال کیا ہو وہ مسلمانوں سے مختلف ہو۔ راجہ ٹوڈرمل کا تفصیلی ذکر، ہندو عہد کا مبسوط تذکرہ یہ سب امور ایلیٹ صاحب کی تردید کر رہے ہیں۔

پروفیسر سرکار[۱] نے اس کتاب سے بہت فائدہ اٹھایا ہو۔ سیر المتاخرین واخبار محبّت کے مصنّفین نے اس کتاب کے اکثر حصّوں کو بلا اعتراف اپنی کتابوں میں شامل کیا ہو۔ یہ کتاب ۱۹۱۸ء میں مع حواشی و مقدمہ، خان صاحب ظفر حسن خان کی کوششوں سے بمقام دہلی طبع ہو چکی ہو۔

خلاصہ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہو کہ یہ ایک ہندو مصنّف کی پہلی قابل قدر، پُراز معلومات اور مفید تصنیف ہو[۲]۔ یہ تصنیف ہندستان کی اچھی تاریخوں میں شمار ہونے کے قابل ہو۔ مالی جمع وخرچ کے جو اعداد سجان رائے نے دیے ہیں ان میں سے بعض تو وہی ہیں جو آئینِ اکبری میں ہیں اور بعض مصنّف نے اپنے زمانے کے مطابق لکھے ہیں۔ الغرض اس لحاظ سے بھی یہ کتاب جدید معلومات کی حامل ہو۔

اولیا کے حالات میں اور شہروں کے ذکر میں سجان رائے نے بازاری قصّوں اور گپّوں پر اعتبار کیا ہو۔ چڑیلوں اور دیوؤں کے حالات دیے ہیں جو سراسر خلاف عقل ہیں۔ یہی وجہ ہو کہ شیر علی افسوس نے بھی خلاصہ کے اس پہلو پر بہت نکتہ چینی کی ہو۔

اس کے باوجود معاشرت اور تہذیب و تمدّن کے بہت سے اشارات اس کتاب میں دستیاب ہوتے ہیں جو غالباً اور کتابوں میں نہیں۔ اس کے ساتھ

---

[۱] Aurangzeb.

[۲] Encyclopaedia of Islam article "Sujan Rai" by Prof: Mohd Shafi M.A.

کتاب مختصر اور دلچسپ ہی۔

سجان رائے کی تحریر سادہ نہیں ہوتی اور اس عہد کے عام مؤرخین اور منشیوں کی طرح اس کی عبارتوں میں بھی مشکل الفاظ ملتے ہیں۔ نثر کے ساتھ ساتھ اشعار بکثرت لائے گئے ہیں۔ خلاصۃ المکاتیب اور موجودہ تاریخ میں بعض ایسے مشترک محاورات اور تراکیب ہیں جن کا بکثرت استعمال کیا گیا ہی۔ سر جادوناتھ سرکار کی رائے اس کے انداز تحریر کے متعلق اچھی نہیں لیکن جب یہ دکھیا جاتا ہی کہ اس زمانے میں یہی چیز سب سے زیادہ پسندیدہ خیال کی جاتی تھی تو پھر خلاصۃ التواریخ سے خاص طور پر شکایت نہیں رہتی۔

بھیم سین ولد رگھونندن داس

تاریخ دِل کُشا[۱] یہ تاریخ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے وقت سے لے کر شاہ عالم کے زمانے تک کے حالات پر مشتمل ہی۔ اس کتاب کا مصنّف بھیم سین ولد رگھونندن داس بمقام برہانپور ۱۰۵۹ھ میں پیدا ہوا اور دیانت رائے عالمگیر شاہی کا بھتیجا تھا۔ جب بھیم سین آٹھ سال کا ہوا تو وہ اورنگ آباد میں اپنے باپ کے پاس چلا گیا۔ وہاں فارسی کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد اپنے باپ کی جگہ بطور قایم مقام کام کرتا رہا اور آخر کار مختلف لوگوں کی ملازمت میں رہ کر دلپت رائے بنا دلیہ کے ہاں ملازم ہوگیا۔ دکن کی لڑائیوں میں بہت حصّہ لیا۔ یہ دلپت رائے بنا دلیہ اورنگ زیب کے ملازمین سے تھا اور محمد اعظم اور محمد معظّم کی جنگ میں اوّل الذکر کا حامی تھا

---

[۱] اس کتاب کا حال میں نے سر جادوناتھ سرکار کے ایک مضمون سے لیا ہی جو انھوں نے اس کتاب کے متعلق لکھا ہی (ماڈرن ریویو ۱۹۱۹ء) (ج ۲۷ ص ۱۷؛ ریو۔ ج ۱، ۲۷۱)

دِل کُشا کا مفصّل حال پروفیسر جادوناتھ سرکار نے ماڈرن ریویو میں لکھا ہے مصنّف نے اپنے خاندان، اپنی تعلیم اور مختلف حالاتِ زندگی کو اس تاریخ میں اچھی طرح سے بیان کیا ہے۔ ہم دل کشا کی اہمیت کے متعلق پروفیسر صاحب کی رائے کا خلاصہ یہاں درج کرتے ہیں:-

"اگرچہ مآثرِ عالمگیری جزئی حالات، افراد و اشخاص کے ذکر اور جغرافیائی بیانات کے لیے بہت مفید ہے۔ نیز اس میں مختلف منصبداروں کی تفصیل، ان کے تغیر و تبدل کی کیفیت اچھی طرح سے بیان کی گئی ہے تاہم مورخ مذکور ان واقعات کے اسباب و علل سے بحث نہیں کرتا۔ نیز واقعات پر ماحول کے اثرات کو واضح نہیں کرتا اور نہ ملک کی اندرونی معاشرت اور عوام کی زندگی ہی پر کچھ روشنی ڈالتا ہے۔ ان سب امور کے لیے "تاریخ دل کشا" ایک بہترین مجموعۂ معلومات ہے۔ کتاب کی اصل قدر و قیمت کا راز اس میں ہے کہ یہ عینی مشاہدات پر مبنی ہے۔ وہ معمولی باتیں جنھیں درباری تاریخیں اکثر نظر انداز کر دیتی ہیں۔ یہاں بہت کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ کتاب میلوں، تفریح کے مشاغل، سڑکوں کی حالت، رسوم و رواج، منصبداروں اور عہدہ داروں کی معاشرت کے اسرار کو نہایت اچھی طرح سے بے نقاب کرتی ہے۔ دل کشا کا طرزِ بیان سلیس اور عام فہم ہے۔ وہ واقعات کے بیان کرنے میں خلطِ مبحث کا مرتکب نہیں ہوتا جو ایک مورّخ کا ضروری وصف ہونا چاہیے۔ جے سکاٹ صاحب نے اس کتاب کا ملخص ترجمہ کیا ہے"۔

نراین کول عاجز

تاریخِ کشمیر | اس کتاب کا مصنف نرائن کول عاجز[1] تھا۔ جس نے عارف خان

---

[1] ایشیاٹک ریسرچز (ج۔ ۱۵) ص ۲۔ براؤن کیمبرج مخطوطات کی فہرست ص ۱۷۷

صوبہ دار کشمیر کی فرمایش پر ۱۱۴۲ھ میں اسے مرتب کیا۔ اس سے پہلے کشمیر کی بہت سی تاریخیں لکھی گئی تھیں۔ یہ کتاب ان پر خاص فوقیت تو نہیں رکھتی لیکن تاریخی مواد کو اس نے نئے انداز سے مرتب کیا ہے۔ واقعاتِ کشمیر کا درجہ اس سے بہت بلند ہے۔ اولیا و صلحا و علما کے سوانح کی وجہ سے ملک حیدر کی تاریخ عام لوگوں کے مطالعے کے لیے موزوں نہیں۔ اس کتاب میں کشمیر کے واقعات کو دلچسپ اور مسلسل تاریخی کہانی کے رنگ میں مرتب کر دیا ہے۔

اگرچہ اس کتاب کا مصنف دیباچے[1] میں کہتا ہے کہ " واقعات را بفارسیِ پُچ خالی از تکلیفات مترسلانہ و رعایت اختصار و ایجاز بقلم عجز رقم آوردہ " لیکن عبارت کوئی زیادہ سہل نہیں اور کتاب چونکہ راج ترنگنی کا ترجمہ ہے۔ اس لیے اس میں ترجمے کے جملہ نقائص موجود ہیں۔

انشا اور منشی

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے اس عہد میں فنِ انشا کو بہت ترقی ہوئی۔ منشیانِ عہد میں (جو صاحبِ تصنیف بھی تھے) ہرکرن، برہمن، مادھو رام، ملک زادہ منشی اور منشی اودی راج (طالع یار) کے نام لایقِ ذکر ہیں۔ ان میں سے چندر بھان برہمن بہت نامور ہیں چنانچہ ان کا مفصل حال ذیل میں آئے گا۔ باقیوں کے متعلق بھی تفصیل کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جامع الانشا بھاگ چند (۱۰۰۰ھ)، خلاصۃ الانشا (۱۱۰۲ھ)، خلاصۃ المکاتیب سبحان رائے (۱۱۱۰ھ) اور منشی جہت روپ نراین (۱۱۲۱ھ) کی طرف محض اشارہ کرتے ہوئے اہم منشیوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

---

[1] تاریخ کشمیر عابز (قلمی)، ورق ۴

ہرکرن

انشاءِ ہرکرن[1] مصنفہ منشی ہرکرن ولد متھرا داس کنبوہ ملتانی (۱۰۳۱ھ و ۱۰۳۲ھ) ہرکرن عہدِ جہانگیر میں نواب اعتبار خاں کا منشی تھا جو ۱۰۳۱-۱۰۳۲ھ میں اکبرآباد کا صوبہ دار تھا۔ یہ کتاب بہت اہم خیال کی جاتی ہے جب انگریزوں کو فارسی میں کاروبار کی ضرورت محسوس ہوئی تھی تو انھوں نے اس انشا کو پیش نظر رکھا تھا اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہوا۔

چندر بھان برہمن

منشآتِ برہمن چندر بھان کا والد دھرم داس لاہور کا باشندہ تھا[2] اور ملازمت شاہی میں پیشۂ منصدی سے روزی حاصل کرتا تھا۔ مصنف تذکرۂ حسینی[3] کا بیان ہے کہ دھرم داس کا وطن اصلی اکبرآباد ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ چندر بھان لاہور کا باشندہ تھا جس کو غلطی سے بیل صاحب[4] نے پٹیالہ سے تعبیر کیا ہے۔ مرآۃ الخیال میں اسے "چندر بھان زنّار دار" کے نام سے یاد کیا گیا ہے[5]۔
ابتدائی تعلیم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی سے حاصل[6] کی۔ طالب علمی کے زمانے سے

---

[1] ریوج ۲۔ ص ۵۳۰؛ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ مضمون "ہرکرن" از بلوشے ج ۲۔ ص ۲۷۷

[2] عمل صالح (قلمی پنجاب یونیورسٹی) ورق ۱۳، [3] تذکرۂ حسینی (قلمی) ق ۵۴

[4] بیل کی ڈکشنری مشاہیر (طبع ۱۸۹۴) ص ۱۴ [5] مرآۃ الخیال (قلمی) ق ۱۴۸

[6] نشترِ عشق (قلمی) ج ۱، ق ۹۰ و ریو ج ۳، ص ۹۳۵

لے کر زمانۂ ملازمت تک کے تفصیلی حالات نہیں ملتے عمل صالح[۱] میں لکھا ہے کہ برہمن پہلے امیر عبدالکریم میر عمارت لاہور کی ملازمت میں داخل ہوا۔ چندر بھان کا بھائی اودے بھان شاہ جہاں آباد کے ناظم عاقل خاں کے دفتر میں نوکر تھا۔ سب سے پہلے برہمن کو شاہ جہاں سے ملنے کا اتفاق غالباً یہیں ہوا[۲]۔ چندر بھان امیر عبدالکریم میر عمارت کی ملازمت چھوڑ کر کچھ مدت تک افضل خاں[۳] وزیر کل کی ملازمت میں منسلک ہوا لیکن افضل خاں کی وفات (۱۰۴۸ھ) نے اسے ایک جاں نثار مربی سے محروم کر دیا۔ بعد ازاں اس کو شاہی ملازمت میں منشی گری کے کام پر مامور کر دیا گیا تاکہ وزرا اور دیگر افسرانِ اعلیٰ کی تحریری معاونت کرے۔ دارا شکوہ کو برہمن کی طرز تحریر نہایت پسند تھی چنانچہ دارا شکوہ کی زندگی بھر برہمن اس کا منشیِ خاص رہا۔ دارا کے مرنے کے بعد برہمن نے عزلت گزینی کر لی اور بمقام بنارس ۱۰۷۳ھ میں فوت ہوا[۴]۔

منشآت برہمن سے معلوم ہوتا ہے کہ چندر بھان کے تین بھائی اور بھی تھے جن میں سے ایک اودے بھان عاقل خاں کے دربار میں متصدی تھا۔ باقی دو بھائی رائے بھان و اندر بھان تعلقات دنیوی سے علیحدہ ہو کر فقر و فنا کی زندگی بسر کرتے رہے۔ برہمن کے تعلقات ان کے ساتھ نہایت خوش آیند تھے چنانچہ اپنے خطوط میں ان کے متعلق نہایت عزت و احترام کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔

منشآت میں ایک خط ہے جو برہمن نے اپنے فرزند تیج بھان کے نام لکھا تھا[۵]۔

---

[۱] ریو ج ۳ ورق ۱۴۳، [۲] نشتر عشق بحوالۂ سابق برہمن نے چہار چمن میں افضل خاں کی عنایات کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ [۳] ایضاً: چہار چمن کے بیان کے مطابق تقسیم اور موازنہ ممالک محروسہ کی خدمت بھی برہمن کے سپرد تھی [۴] پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ایک نسخہ ہے۔ [۵] منشآت برہمن (قلمی) ق ۹۶

اس ایک بیٹے کے علاوہ برہمن کی کسی اور اولاد کا حال معلوم نہیں۔

بیل صاحب لکھتے ہیں کہ برہمن نے بمقام آگرہ ایک نہایت اچھی رہائش گاہ تیار کی تھی لیکن اب اس کے آثار ناپید ہیں[1]۔ اُمرائے ہنود میں لکھا ہے کہ اب تک آگرہ میں ایک باغ، باغ چندر بھان کے نام سے مشہور ہے[2]۔ تفریح العمارات میں برہمن کی بہت سی عمارتوں کا ذکر ہے۔

برہمن نہایت سلیم المزاج، صوفی مشرب اور صلح کُل ہندو تھا۔ عمل صالح[3] میں لکھا ہے کہ "ہر چند بصورت ہندوست لیکن دم در اسلام مے زند" اپنی تحریرات میں ہندوانہ مراسم کا نہایت عزت سے ذکر کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو "زناردار" کہنا پسند کرتا تھا۔ اُس کی طبیعت میں ایک گداز تھا۔ کہتے ہیں[4] اس کی آنکھیں ہر وقت تر رہتی تھیں، ابنائے نوع کے ساتھ ہمدردی بے حد تھی منشآت[5] میں بے شمار ہندوؤں کے نام ملتے ہیں جن کی ہمدردی میں برہمن نے امراو عمائد کو سفارشی خط لکھے ہیں۔ جن میں ان کے حالات کی پریشانی اور قابلیت پر زور دیتے ہوئے امانت کی درخواست کی ہے۔

داراشکوہ برہمن کی بے حد قدر افزائی کیا کرتا تھا۔ تذکروں[6] میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ برہمن نے ایک غزل لکھی جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

مرا دلے ست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بکعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

داراشکوہ کو یہ غزل بے حد پسند آئی۔ اِس غزل کو لے کر وہ شاہ جہاں کے پاس حاضر ہوا۔ بادشاہ کی طبیعت اس وقت کچھ آزردہ تھی۔ یہ شعر سُن کر اور مضطرب ہو گئی۔ اُمرا نے لطائف الحیل سے بادشاہ کی طبع کو تسکین دی اور شاہزادے

---

[1] صفحہ ۱۸۳ [2] بیل بحوالہ سابق [3] تفریح العمارات (مملوکہ پروفیسر شیرانی صاحب) ص ۱۶۹ ، ۲۰۰ [4] عمل صالح بحوالہ سابق [5] نسخہ یونیورسٹی لائبریری [6] نشتر عشق وغیرہ

سے کہا کہ اس قسم کے اشعار پیش کرنے سے احتراز کیا کرے۔ اگرچہ روایت کی صحت میں کچھ کلام ہی مگر یہ امر بالکل مسلّم ہی کہ برہمن کو داراشکوہ کے دربار میں خصوصیت حاصل تھی۔

برہمن کو خطِ شکستہ میں کمال حاصل تھا[1]۔ تذکرۂ خوشنویسان[2] میں اس کے خط کی صفائی کی تعریف کی گئی ہی۔

یہاں تک برہمن کے وہ حالات ہیں جو مختلف تذکروں اور تاریخوں سے جمع کیے جاسکے ہیں۔ اب ہم ان کی تصنیفات کی ایک فہرست دیتے ہیں۔

منشآت کی ابتدا میں برہمن نے اپنی متعدّد تصانیف کا نام لیا ہی مثلاً چہار چمن (۲) گلدستہ (۳) تحفۃ الانوار (۴) نگارنامہ (۵) تحفۃ الفصحا (۶) مجموعۃ الفقرا ان کے علاوہ (۷) منشآت اور (۸) دیوان۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور چہار چمن، منشآت اور دیوان ہیں۔ فارسی شعرا کا ایک تذکرہ بھی برہمن کی طرف منسوب کیا جاتا ہی[3]۔ برٹش میوزیم کی مطبوعہ کتابوں میں "نازک خیالات" کے نام سے "آتم بلاس" ایک سنسکرت کتاب کے ترجمے کا ذکر ہی۔ نیز خلاصۃ التواریخ میں مکالماتِ بابالال کو برہمن کی طرف منسوب کیا گیا ہی۔ چندربھان کی نمایاں ترین خصوصیت اس کی انشا پردازی ہی۔ چہار چمن کو تاریخی کتابوں میں شمار کیا گیا ہی۔

منشآتِ برہمن۔ چندربھان برہمن کے اُن خطوط کا مجموعہ ہی جو اس نے وقتاً فوقتاً شاہ جہاں، امرائے دربار، ہمسرانِ عہد اور اپنے متعلقین کے نام مرقوم کیے۔ زیادہ تر لشکر خاں اور افضل خاں وزیرِ کل کی طرف لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر سفارشی خطوط ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کے اسما لکھے جاتے ہیں جن کی قابلیت یا پریشانی حال

---

[1] عمل صالح (قلمی) ق ۷۱۳ [2] تذکرۂ خوشنویسان ص ۵۵ ؛ تفریح العمارت (قلمی مملوکہ پروفیسر شیرانی صاحب) ص ۲۶۷ [3] اورنٹیل کالج میگزین فروری ۱۹۲۸ء ص ۴۴ [4] خلاصۃ التواریخ ص ۶۰

کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ بھوپت رائے منشی، خواجہ انند روپ، ہرناتھ برہمن، تلسی رام، خواجہ کھیم داس، اندربھان، دیال داس، ملّا محمد جان قدسی، گوپال داس منشی، پران ناتھ وغیرہ۔ ان ناموں کے پیش کرنے سے یہ مقصود ہے کہ شاہ جہاں کے عہد میں ہندو ملازمین اور اُن کی فارسی دانی کی تدریجی ترقی کا کچھ اندازہ ہوسکے۔ آخر میں ایک آدھ خط اپنے والد کے نام ہے۔ چند خطوط اپنے تارک الدنیا بھائیوں (رائے بھان و اندربھان) کے نام لکھے گئے ہیں۔ کچھ خطوط اپنے فرزند تیج بھان کو مخاطب کرکے تحریر کیے گئے ہیں جن میں اس کو فارسی عربی میں کمال حاصل کرنے کی طرف متوجہ کیا ہے۔

۱۔ برہمن کے یہ خطوط تاریخی حیثیت سے چنداں قابلِ وقعت نہیں البتہ فنِ انشا کے نقطۂ نظر سے قابلِ قدر مجموعہ ہے۔

۲۔ تذکرۂ حسینی[۱] کا مصنف لکھتا ہے کہ " دیوانے و انشائی بسیار سادہ یادگار گزاشتہ"۔ عملِ صالح[۲] میں لکھا ہے کہ وہ اپنی انشا میں ابوالفضل کا مقلد ہے لیکن میرے خیال میں یہ بیان صحیح نہیں۔ برہمن کی طرز نہایت سادہ ہے۔ بخلاف اس کے ابوالفضل نے فارسی میں نہایت مشکل اور پیچیدہ اندازِ تحریر کو عروجِ کمال پر پہنچا دیا تھا اس میں شبہہ نہیں کہ برہمن کے سامنے ابوالفضل کی انشا موجود ہوگی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوانہ افتادِ طبع کے باعث وہ مشکل نگاری سے متنفر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ محمد صالح[۳] کے بیان کے مطابق ترسل و انشا میں مہارت رکھتا ہے اور اس کو نامہ طرازی اور مدعا پردازی میں پوری مشق تھی لیکن اس کے باوجود اس کا انداز بالکل سادہ، تکلف و اغراق سے پاک، مسلسل استعارات و تشبیہات سے خالی ہوتا ہے۔ کلمات الشعرا[۴] کے مصنف کا بیان ہے کہ بطرزِ قدیم، شستہ و صاف اور ہندوال

۱۔ تذکرۂ حسینی (قلمی)، ق ۴۴ ۲۔ ق ۱۳ ، ۳۔ عملِ صالح (قلمی) ق ۷۱۷،
۴۔ کلمات الشعرا (قلمی) ق ۹

غنیمت بود"۔ میرے خیال میں اس کے سب سے مشکل خطوط وہ ہیں جو اس نے تیج بھان اور اپنے تارک الدنیا بھائیوں کو لکھے ہیں۔ اگر ان کو غور سے دیکھو تو ابوالفضل وغیرہ کی نہایت ہی خفیف جھلک دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ہم یہ فتوی کبھی نہ دے سکیں گے کہ اس کا انداز تحریر مشکل ہے اور بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گلستان کی عبارت ہے مثلاً "چوں جان بخشی او فرمودہ اند، نان بخشی او کم از جان بخشی نیست" وغیرہ وغیرہ (۲) "رائے صاحب رائے من، ہر چند کم تر یاد مے فرمایند، بیشتر بیاد مے آیند"۔

۳۔ سادگی کے علاوہ ایک اور امر قابلِ غور ہے کہ اس کے رسایل و رقعات نہایت مختصر ہیں۔ القاب و آداب میں شان و شوکت نہیں بلکہ اس کی جگہ سلاست اور سادگی پائی جاتی ہے۔ اگر ایک طرف ابوالفضل، ملّا عنایت اللہ کنبوہ، ملّا منیر اور دوسرے منشیانِ عہد کے خطوط رکھو اور دوسری جانب برہمن کے، تو یقیناً دورِ حاضر کا ایک تعلیم یافتہ آدمی برہمن کے خطوط کو بلحاظ سادگی اور ایجاز کے ترجیح دے گا۔ مثال کے طور پر ذیل کے القاب جو مختلف الحال مکتوب الیہ کی طرف لکھے گئے ہیں لکھے جاتے ہیں:۔

۱۔ افضل خان کے نام۔ خان شہامت نشان سلامت[1]

۲۔ " " کے نام۔ نقاوۂ دودمان مجد و اعتلا

۳۔ راجہ ٹوڈرمل شاہ جہانی کے نام۔ راجہ والا منزلت سلامت

۴۔ راجہ لعل چند کے نام۔ رائے صاحب رائے من

۵۔ والد کے نام۔ قبلۂ حقیقی سلامت

۶۔ بھائی کے نام۔ برادر غمخوار من

۷۔ فرزند کے نام۔ معلوم فرزند ارجمند خواجہ تیج بھان باد

۴۔ تحریر میں ہندوانہ عقاید کا رشتہ نہیں چھوڑتا۔ مثلاً یہ لکھنا ہو کہ "فلاں کہ

---

[1] یہ سب اقتباسات منشآت برہمن سے لیے گئے ہیں۔

نشانِ عبادات و اطاعت بر جبیں و رشتۂ عقیدت در گلو دارد"۔ برہمن اکثر مقامات پر اسے یوں ادا کرتا ہے" برہمن عقیدت کیش کہ صندل اخلاص بر جبین و زنار عقیدت در گلو دارد"۔ اس کا ایک شعر ہے:۔

مرا برشتۂ زنار اُلفتے خاص است
بہ یادگار من از برہمن ہمیں دارم

منشی مادھورام[1]

انشاءِ مادھورام | مصنفہ منشی مادھورام (تقریباً ۱۱۲۰ھ) یہ اورنگ زیب کے زمانے میں لطف اللہ خاں[2] نائب صوبہ دار لاہور کا منشی تھا۔ کچھ عرصے کے لیے وہ شاہزادہ جہاں دار شاہ کا ملازم بھی رہا۔ اس کتاب کو بھی بہت شہرت حاصل ہے حالانکہ اس کا اندازِ بیان نہایت تکلیف دہ اور ناگوار سا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مادھورام اپنے آقا کی انشا سے بہت متاثر تھا۔ مآثر الامرا[3] میں لطف اللہ خاں کے متعلق لکھا ہے:۔

"محاورہ و مکالمہ بالفاظ غیر مانوس (کہ محتاج بفرہنگ و قاموس بودے و آں دور از سلاست و روانی ست) بسیار داشت۔ عبارت ہائے ساختہ و تراکیب بہ تکلف تراشیدہ وی زبان زد مردم ست"۔

ہم یہاں مادھورام کی انشا[4] سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں:۔

"زمام اہمال مہام انام، بقبضۂ اقتدار آں مرجع خاص و عام باد بعد از شوق و غرام، ادعیہ اجابت التیام، توسن خوش خرام،

---

[1] ایشیاٹک سوسائٹی بنگال فہرست مخطوطات۔ ایوانف (کرزن کلیکشن) عدد ۱۵

[2] مآثر الامرا ج ۳۔ ص ۱۷۱ [3] مآثر الامرا۔ ج ۳۔ ص ۱۷۵ [4] نسخہ پنجاب یونیورسٹی (قلمی) ق ۶۷

جامۂ مشکفام، بوجہہ مدعا طرازی سبکت گام مے گردد کہ درسوابق
ایام خطے مشعر استعلام خبر خیر انجام خدام ذوی الاحترام سیٹھ
بینی رام بخیر ارقام در آمدہ۔ جوابش باوصف مبالغہ و ابرام بتعاقل
آں سلیم الطبع موزوں کلام کہ ازیں رہ گذر خاطر مستہام مورد اقسام تردد
و آلام مے باشد۔"

اس اقتباس میں مہام، زمام، التیام وغیرہ ہم قافیہ الفاظ کی رعایت
خاص طور پر ملحوظ رکھی گئی ہے جو یقیناً سلاست اور روانی میں زبردست سدراہ
ہے۔ اگرچہ اس سے ذخیرۂ الفاظ کی فراوانی کا پتا چلتا ہے۔ یہ انشا گزشتہ صدی
تک بطور نصاب پڑھائی جاتی رہی ہے۔

ملک زادہ منشی

نگارنامہ[1] مصنفہ ملک زادہ منشی (سنہ ۱۰۹۰ھ) یہ عہدِ شاہ جہانی کا ایک زبردست
منشی تھا۔ غالباً مصنف کا نام منشی لعل چند تھا لیکن عام طور پر اس
کو ملک زادہ ہی کہا جاتا ہے۔ منشی موصوف مدت تک شہزادۂ معظم کے پاس ملازم
رہا کچھ عرصے تک بشارت خاں کا متصدی رہا۔ نگارنامہ اور کارنامہ کے آغاز میں
مصنف نے اپنے حالات مفصل دیے ہیں۔ نگارنامہ دو دفاتر پر مشتمل ہے۔ پہلے دفتر
میں اپنی منشآت ہیں اور دوسرے دفتر میں دوسرے منشیوں کی تحریرات ہیں۔
اس کتاب کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے دیباچے میں بعض اہم
مضامین پر بحث ہے مثلاً انشا کا مقصد، اس کی غرض و غایت، اس کی ترقی اور
عروج، ہندستان کے بہترین منشی، عہدِ شاہ جہانی اور عالمگیری کے اعلیٰ انشا نگار،

---

[1] ریو۔ ج ۱۔ ص ۴۹۵۔ بانکی پور فہرست۔ ج ۹۔ عدد ۸۷۹۔ ص ۱۰۶

منشی کے فرائض، اس کی ضروریات وغیرہ پر پوری بحث ہے۔
نگارنامے میں عہدِ عالمگیری کی بعض اہم دستاویزات محفوظ ہیں جن کی وجہ سے یہ نسخہ بہت قابلِ قدر بن گیا ہے۔

منشی اودھے راج

ہفت انجمن[۱] مصنفہ منشی اودھے راج رستم خانی (سنہ ۱۱۱۱ھ) منشی اودھے راج اورنگ زیب کے زمانے میں مسلمان ہوگیا تھا۔ نگارنامے میں منشی اودھے راج کو اعلیٰ منشیوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اس انشا کی ترتیب اودھے راج (طالع یار) کے فرزند حمایت یار کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ ہفت انجمن سات ابواب پر منقسم ہے۔ سب سے ضروری حصّہ وہ ہے جس میں مرزا راجہ جے سنگھ کے خطوط ہیں۔ سر جادو ناتھ سرکار نے اس کتاب کو مرہٹوں کی لڑائیوں اور مرزا راجہ جے سنگھ کے حالات کے لیے بہت مفید پایا ہے۔ طالع یار کا اندازِ بیان نہایت عمدہ ہے البتہ حمایت یار کا دیباچہ تصنّع اور تکلف سے خالی نہیں۔

منشی اودھے راج پہلے رستم خان فیروز جنگ کا سکریٹری تھا (مقتول سنہ ۱۰۶۸ھ: مآثر الامرا ج ۲۔ ص ۲۷۰) رستم خان کے قتل ہونے کے بعد مرزا راجہ جے سنگھ کا ملازم ہوگیا (مآثر الامرا۔ ج ۳۔ ص ۵۶۸) جو سنہ ۱۰۷۷ھ میں راہ گرائے عالمِ فانی ہوگیا۔ اس کے بعد اودھے سنگھ نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا اسلامی نام "طالع یار" قرار پایا۔ عالمگیر نے اسے اعلیٰ منصب پر فائز کیا۔ سید محمد قنوجی کے مریدوں میں منسلک ہوکر اس نے اپنے آپ کو قادری سلسلے میں شامل کر لیا۔ سنہ ۱۱۰۶ھ میں اس کی وفات ہوئی۔

---

[۱] اس کا ایک نسخہ یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔

کتاب کے مضامین کی فہرست یہ ہے:۔

۱۔ مراسلات رستم خان بخدمت شاہ جہاں
۲۔ مراسلات راجہ جے سنگھ بخدمت اورنگ زیب بعد از جنگِ اجمیر
۳۔ مراسلات جے سنگھ بخدمت اورنگ زیب در مہم دکن
۴۔ رستم خان بخدمت شاہ زادگانِ شاہ جہاں
۵۔ رستم خان و جے سنگھ بنام اُمرائے شاہ جہانی و عالمگیری
۶۔ ایضاً
۷۔ اودھے راج کے ذاتی خطوط

ان بڑے منشیوں کے علاوہ ولی بنوالی داس، لچھمی نرائن (جس نے شاہ نامے کا خلاصہ کیا ہے) اور وامق کھتری اس زمانے کے اعلیٰ منشی تھے۔ وامق مسلمان ہوکر اخلاص خان کے نام سے موسوم ہوا۔ اورنگ زیب اس کی انشا کی بہت تعریف کیا کرتا تھا۔ مصنفِ نگارنامہ نے سبتل سنگھ اور پنڈی داس دو منشیوں کا ذکر کیا ہے جو اس زمانے سے متعلق تھے اور بہت اچھے انشا پرداز تھے۔

شعرا

مُنشی چندر بھان برہمن

یہ ہندستان کے بہترین ہندو شعرا میں سے تھا۔ برہمن کو عام طور پر دوسرے درجے کا شاعر سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے اشعار کی شیرینی اور لطافت عہد شاہ جہانی کے اچھے شعرا کے لگ بھگ ہے۔ سادگی اس قدر ہے کہ

سنہ معارف ۱۹۱۸

اس زمانے میں کسی کے ہاں نہیں ملتی، یہی وجہ ہی کہ عام لوگوں نے برہمن کو پسند نہیں کیا لیکن یہی وہ وصف ہی جس کی بنا پر ہم برہمن کو عہدِ شاہ جہانی کا پسندیدہ شاعر مانتے ہیں۔ صائب نے اس کے اشعار کو اپنی بیاض میں درج کیا ہی اور یہ سب سے بڑا اعتراف ہی جو ایک شاعر کی جانب سے دوسرے شاعر کے حق میں ہو سکتا ہی۔

دیوانِ برہمن برہمن نے اور کتابوں کے علاوہ ایک دیوان بھی یادگار چھوڑا ہی۔ نشترِ عشق[1] کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہی کہ برہمن نے ایک دفعہ اپنے دیوان کے کئی نسخے نہایت عمدہ خط میں لکھوائے اور ہر ہر صفحے کو نہایت اعلیٰ بیل بوٹوں کے ساتھ آراستہ کیا اور پھر نہایت نفیس جلد بندی کر کے ایران و توران وغیرہ بیرونی ممالک کے علما و شعرا کے پاس بغرضِ انتخاب روانہ کیا لیکن ان علما کی ستم ظریفی یا بے ذوقی کا بُرا ہو کہ انھوں نے کتاب کی مطلّا جلد اور آراستہ بیل بوٹوں کو اس کی طرف واپس بھیج دیا اور ڈیوان یعنی متن کو ضایع کر دیا۔ اس حکایت کی صحت اور دُرستی کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اس افسانے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہی کہ برہمن نے اپنا دیوان اپنے جیتے جی مرتب کر لیا تھا۔ دیوان کا ایک نسخہ پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہی۔ یہ دیوان غزلیات و رُباعیات کا مجموعہ ہی۔ قصاید موجود نہیں البتہ غزلیات میں بعض مدحیہ قطعات موجود ہیں مثلاً

چراغ بزمِ شہنشاہ ست چناں روشن
کہ شد ز پرتوِ آں چشمِ آسماں روشن

برہمن کی نمایاں شاعرانہ خصوصیت سادگیٔ کلام ہی۔ دیوان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہی کہ برہمن کا کلام اسلامی تخیّل میں ڈوبا ہوا تھا۔ عشق کی کیفیات،

---

[1] نشترِ عشق (قلمی)، ج ۱۔ ق ۹۰

محبت کی صعوبتیں، تصوّف کی منزلیں، وحدۃ الوجود کے مسائل برہمن کے کلام میں اسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح مسلمان شعرا کے کلام میں ہیں۔

ہندوؤں میں برہمن شاید سب سے پہلا باکمال شاعر تھا جس نے ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے۔ ہمارے تذکرہ نویسوں نے برہمن کے کلام میں سے صرف چند اشعار کا انتخاب کیا ہے لیکن پہلا نامور ہندو شاعر ہونے کے لحاظ سے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے خیالات کا پورا پورا اندازہ کرنے کے لیے بہت سی مثالیں پیش کی جائیں:-

ہر کہ دارد ہوس عشق، نشانے با اوست — چوں گل لالہ بہ دل داغ نہانے با اوست
در جہاں باش ولیکن ز جہاں فارغ باش — ہر کہ فارغ ز جہانست، جہانے با اوست
مرد را سود و زیاں در نظر آید یکساں — ہر کہ شد در گرو سود، زیانے با اوست

وحدۃ الوجود:- بانئے خانہ و بت خانہ و مے خانہ یکیست
خانہ بسیار و لے صاحب ہر خانہ یکیست

بے ثباتی عالم:- بنائے قصرِ جہاں را ثبات ممکن نیست
بجز اساسِ محبت کہ دیر بنیاد ست

راستی:- راستی نیست ایں کہ دارد سرو
راست گویم کہ راستی دگر ست

عُمر:- خواہی کہ کُنی از روشِ عُمر تماشا
یک لحظہ برہمن بسرِ جو شدہ بنشیں

اہلِ کمال کی پریشانی:- بس کہ طبع شگفتہ داریم
لاجرم ہمچو گُل پریشانیم

خالِ رُخِ یار:- آں نکتہ کہ خال نام دارد
از روئے تو انتخاب کردیم

ترکِ مدّعا:- برہمن ار بکند یاد مدعا چہ عجب
که مدّعا ہمہ در ترکِ مدّعا باشد

کمر:- دریں خیال چو موگشتم وز شوق ہنوز
خیال موئے میانِ تو از میاں نرود

تخیّل:- بنازم آں سرِ زلفِ سیہ کہ نیم شبے
چو در خیالِ من آید، شبم دراز کند

وحدۃ الوجود:- گُل یکے خار یکے شاخ یکے تاک یکیست
نزدِ اربابِ نظر ہر خس و خاشاک یکیست

محبّت:- دل درختے است عشق پروردہ
از محبّت ہمیشہ بار ورست

برہمن اور رشتۂ زنّار:- مرا بہ رشتۂ زنّار اُلفتے خاص ست
بہ یادگارِ من، از برہمن ہمیں دارم

ما حالِ دلِ خویش نہفتیم و نگفتیم | شب تا سحر از دردِ نہ خُفتیم و نگفتیم
با رشتۂ مژگاں ہمہ شب دانۂ اشکے | از غیر نہاں داشتہ سفتیم و نگفتیم
در راہِ محبّت بہ خیالِ قدمِ او | ہر مرحلہ را با مژہ رُفتیم و نگفتیم
در سینۂ خود رازِ غمِ عشق برہمن | چوں غنچہ بصد پردہ نہفتیم و نگفتیم

ربُاعی

ما پست و بلند روزگاراں دیدیم | ما فصلِ خزان و نو بہاراں دیدیم
در راہِ طلب دو اسپہ مے باید تاخت | ما تا ختنِ شاہسواراں دیدیم

مرآۃ الخیال[1] کے مصنف نے سارے دیوان میں سے یہ غزل پسند

---

[1] مرآۃ الخیال (قلمی) ق ۸۴

کی ہی:۔

کنم زسادہ دلی بند دیدۂ مژگاں را	بمشت خس نتواں بست راہ طوفاں را
شبے خیال تو آمد بخواب آسودیم	دگر زہم نکشودیم چشم گریاں را
برہمن از تو سخن بے دلیل مے خواہم	کہ اعتبار نباشد دلیل و برہاں را

ہندو۔ متھرا داس[1]

یہ شاعر زیادہ مشہور نہیں۔ انڈیا آفس لائبریری میں اس کا قلمی دیوان موجود ہی۔ باڈلین لائبریری میں اس کی ایک مثنوی "لیلیٰ مجنوں" کا پتہ چلتا ہی۔ اس کے علاوہ اس کی طرف خسرو شیریں بھی منسوب کی جاتی ہی۔ اس شاعر کا تذکرہ "گُلِ رعنا" میں بھی ہی۔ شاہ جہاں کے زمانے میں خان زمان صوبہ دار بنگال نے اسے قید کرلیا تھا۔ شاعر نے ایک قطعہ حکیم رکنا کاشی کے نام روانہ کیا۔ لیلیٰ مجنوں کا جو نسخہ باڈلین لائبریری میں ہی۔ اس کا سن کتابت ۱۰۵۵ھ ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ شاعر شاہجہاں کے اوائل زمانہ میں عالم شباب کو پہنچ چکا تھا۔ دیوان میں غزلیات، رباعیات اور فردیں ہیں۔ تصانیف کے اعتبار سے اندازہ ہوتا ہی کہ اچھا شاعر ہوگا لیکن چونکہ ہم نے اس کی کسی تصنیف کو نہیں دیکھا اس لیے اس کے متعلق قطعی رائے کا اظہار نہیں کرسکتے۔

سالم کشمیری

محمد اسلم سالم[2]۔ یہ دراصل کشمیری برہمن تھا۔ ملا محسن فانی کی کوشش سے

---

[1] گل رعنا (بانکی پور۔ ج ۸۔ ص ۱۳۴) انڈیا آفس۔ عدد ۱۵۵۹۔ باڈلین عدد ۱۱۰۱

[2] نشترِ عشق (قلمی)۔ ج ۱۔ ق ۲۳۷؛ گل رعنا (بانکی پور۔ ج ۸۔ ص ۸۹) باڈلین عدد ۱۱۶۷ بانکی پور۔ ج ۳۔ ص ۱۹۳

مسلمان ہوا۔ وہ محمد اعظم کی سلک ملازمت میں منسلک تھا۔ ایک مثنوی "اعظم شاہ" کے نام پر لکھی جس کا ایک نسخہ باڈلین لائبریری میں موجود ہے۔ محمد اعظم کی وفات پر محمد معظم شاہ عالم کے وقایع نگار کی حیثیت سے کشمیر چلا گیا ۱۱۱۹ھ اور ۱۱۳۱ھ کے درمیان وفات ہوئی۔

سالم کو دوسرے درجے کے شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا پورا دیوان موجود ہے جس میں بعض بعض نہایت شستہ اور اعلیٰ اشعار پائے جاتے ہیں۔ اس کی دو مثنویاں بھی ہیں:۔

(۱) گنج معانی (۲) مثنوی اعظم شاہ

بانکی پور لائبریری میں بعض اور مختصر سی مثنویاں بھی ہیں۔ اس کی شاعری میں اسلام کی محبت، تصوف کی طرف توجہ اور خیالات میں تفلسف کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ حسن تعلیل و ایہام کی بہت کثرت ہے۔ اس کی شاعری کا نمونہ ذیل میں دیا جاتا ہے:۔

در دیدہ بدل درد تو داریم چو گرداب پیچیدہ تر آید نگہ از چشم تر ما
سالم چو فتد قطرہ بدریا نتوان یافت ما بے خبرانیم کہ یابد خبر ما؟

ہم چو ریگ شیشۂ ساعت بطوف کوئے دل سالم از خود مے رویم و جائے خود دل مے کنیم

سایۂ افتادۂ بے یار و بے یاورمنم سایہ ہم دارد کسے، از سایہ بیکس ترمنم

در خمار توبہ ام ساقی ندانم چوں کنم ہر چہ مے خواہد دلم گویا نمے خواہد دلم

سالم از دردِ تو برگوشۂ عزیزاں دوُر ست
دست بر دل نہ و در کلبۂ احزاں بہ نشیں
پائے چوں شمع بہ ہستی زدہ خنداں بہ نشیں
منشیں باخود و با آتش سوزاں بہ نشیں

شوم موج ہوا در باغ و برگرد سرت گردم
چو شاخ گُل در آغوشم مگر بے اختیار آئی

رُباعی

ایں عمر کہ رشتہ تاب دام اجل ست — خوابیست پریشاں کہ درو صد خلل ست
ویں دل کہ درون سینہ دارم ہیہات — چوں شیشۂ ساعت ہمہ طول امل ہست

بنوالی داس ولی

داراشکوہ کا ملازم تھا۔ ولی کی بہت سی مثنویاں ملتی ہیں مثلاً بحر عرفان وغیرہ جو اکثر متصوفانہ خیالات کی حامل ہیں۔ شاعری کے لحاظ سے زیادہ بلند نہیں معلوم ہوتیں۔

ان اکابر شعرا کے علاوہ واثق کھتری، مخلص (گلاب رائے ولد گرداس) لچھمی نرائن بھی شاعر تھے۔ مخلص عہد عالمگیری میں نواب زبردست خاں کا ملازم تھا۔ اس کا حال سفینۂ خوش گو میں دستیاب ہوتا ہے۔ لچھمی نراین نے ۱۰۴۰ھ میں شاہ نامے کا خلاصہ تیار کیا ہے۔ وہ شہزادہ بیدار بخت کے ہاں پیش کار تھا۔

تراجم

سنگھاسن بتیسی کے بہت سے ترجمے ہوئے۔ جہانگیر کے عہد میں (سنہ ۱۱۱۹ھ) بھارامل[۵۵] کھتری نے سب سے پہلا ترجمہ کیا۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔ انڈیا آفس میں اس نسخے کے علاوہ ایک اور ترجمہ ہے جو کشن داس ابن ملوک چند تنبولی نے کیا ہے۔ یہ شخص لاہور کا باشندہ تھا اور نواب حیات اللہ امیرالامرا کا ملازم تھا اس لیے اس کا نام "گلشن بلاس" رکھا گیا ہے۔ اس کا ایک اور نسخہ بتراجم برٹش میوزیم میں ہے۔

شاہجہاں کے عہد میں اس کا ایک اور ترجمہ ابن ہرکرن نے کیا۔ ریو نے[۵۶] رائے بن ہری گرب داس کایتھ کے ترجمے کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ چیتر بھوج اور بھارامل کے نسخوں کا مرکب سا ہے۔ اس کی تصنیف کی تاریخ سنہ ۱۰۶۱ھ یا سنہ ۱۰۶۲ھ ہے۔

راماین کے مختلف تراجم:۔

(ا) گردھرداس کایتھ دہلوی، جس نے سنہ ۱۰۳۶ھ میں راماین کا ترجمہ مثنوی میں کیا۔

(ب) چندرمن نے سنہ ۱۰۹۷ھ میں ترجمہ کیا۔

(ج) دیبی داس کایتھ نے بھی اسی زمانے میں ترجمہ کیا۔

(د) امر سنگھ منشی نے سنہ ۱۱۱۷ھ میں یعنی اورنگ زیب کے آخری سال میں اس کا ترجمہ کیا جس کا نام "امر پرکاش" رکھا۔

---

۵۵ نسخ انڈیا آفس۔ عدد ۱۹۸۸، ۱۹۸۹، ۱۹۹۰؛ ریو۔ ج ۲۔ ص ۷۶۳

۵۶ ریو۔ ج ۱۔ ۱۵۶

گلزارِ حال[1] ۔ پربھودہ چندرودناٹک کا ترجمہ بنوالی داس ولی نے سنہ ۱۱۷۸ھ میں کیا۔
نازک خیالات ۔ برہمن نے آتم بلاس کا ترجمہ کیا۔ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کی مطبوعات میں موجود ہے۔

قصص

کشایش نامہ[2] مصنفہ راج کرن (سنہ ۱۱۰۰ھ) یہ چھ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔
تحفۃ الحکایات[3] مصنفہ برہمن حصاری (قبل سنہ ۱۱۲۳ھ)
کارنامہ[4] ملک زادہ منشی (مصنف نگارنامہ)

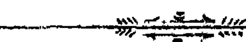
دیگر فنون

بدیع الفنون[5] مصنفہ دھرم نراین (سنہ ۱۱۷۴ھ) اس میں حساب ہے۔ اس کے نو باب ہیں۔ بعض جگہ مصنف کا نام میدنی مل یا ماداری مل بھی دیا گیا ہے۔ شاید یہ دو مختلف شخص ہوں۔
فرس نامہ ہندی[6] (قبل از سنہ ۱۰۵۴ھ) اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں۔ سید عبداللہ فیروز جنگ کے حکم سے ہندی سے ترجمہ ہوا۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

---

[1] ریو۔ ج ۳۔ ص ۱۰۴۴ [2] ریو ج ۲۔ ص ۷۶۸، انڈیا آفس۔ عدد ۲۸۲۵ [3] انڈیا آفس ۲۸۲۶ [4] اس کا ایک نسخہ پبلک لائبریری میں موجود ہے [5] انڈیا آفس عدد ۲۲۵۹۔ آصفیہ ج ۱۔ ص ۸۰۶ ٹیپو سلطان لائبریری۔ ص ۹۱ [6] ریو۔ ج ۲۔ ص ۴۸۲۔ کوپن ہیگن ص ۱۶۔ باڈلین۔ عدد ۱۸۶۴

چوتھا باب



مغلوں کا انحطاط

(از سنہ ۱۱۲۴ھ تا سنہ ۱۲۲۱ھ)

چوتھا باب

مُغلوں کا انحطاط

(از ۱۱۲۴ھ تا ۱۲۲۱ھ)

ہندوؤں کے فارسی ادب کا زمانۂ شباب

اس باب میں ہم ۱۱۲۴ھ سے لے کر ۱۲۲۱ھ تک کے ادب پر بحث کریں گے۔ گزشتہ باب میں ہم نے جہانگیر سے لے کر شاہ عالم اول تک ہندو قوم نے جتنا لٹریچر پیدا کیا اس کا حال بیان کیا تھا۔ اب شاہ عالم اول سے لے کر شاہ عالم ثانی تک جو لٹریچر پیدا ہوا اُس کا ذکر کریں گے۔ اورنگ زیب کی وفات کے تھوڑے عرصے بعد مغلوں کی عظیم الشان حکومت بہت سے حصّوں میں منقسم ہو گئی۔ مرکزیت کمزور ہو گئی اور صوبجاتی حکومتوں نے آزاد مستقل سلطنتیں قایم کرلیں۔ تاہم مغلوں کی گزشتہ شان و شوکت کا سکّہ بیٹھا ہوا تھا محمد شاہ کے زمانے میں کسی حد تک "عہدِ زرّیں" کی روایات کو زندہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اگرچہ وہ پُرانی شان و شوکت باقی نہ تھی تاہم ابھی مغلوں کا دربار علم و فن کا مرکز سمجھا جاتا تھا اور تعلیم یافتہ ہندو ملازمین پہلے سے زیادہ شاہی ملازمتوں میں موجود تھے۔ اس لیے یہ سمجھنا آسان ہے کہ مغلوں کے انحطاط کے زمانے میں بھی ہندوؤں نے فارسی ادب کے پیدا کرنے میں پہلے کی نسبت کوئی خاص کمی نہیں دکھائی بلکہ اس عہد میں پہلے سے کہیں زیادہ جوش کے ساتھ کتابیں لکھی گئیں۔ ہندوؤں کا لٹریچر جیسا کہ ہم آیندہ چل کر یہ بتلائیں گے

حکومت کے ملازموں کا پیدا کردہ لٹریچر ہی اور اس وقت تک کم نہ ہو سکتا تھا جب تک ایسے ناگزیر واقعات پیش نہ آجاتے جن سے مجبور ہو کر ہندو مغلوں کی ملازمت ترک کر دیتے. واقعہ یہ ہی کہ اب ہندو سرکاری ملازمتوں میں اس درجہ دخیل ہو چکے تھے کہ ان کے بغیر انتظامِ حکومت کا چلنا مشکل تھا۔ بڑے بڑے راجے، وزیر، دیوان، سپہ سالار، ہواخواہان سلطنت میں شامل تھے اور ان میں علم اور علمی سرپرستی کا وہ ملکہ موجود تھا جو مسلمان امیروں کا خاصّہ سمجھا جاتا ہی۔ مثال کے طور پر محمد شاہ کے دربار میں مرزا راجہ جے سنگھ ایک امیر اپنی جرأت و ہمت سے کہیں زیادہ علم نجوم میں مہارت کی بدولت شہرت رکھتا ہی۔ یہ شخص علم کا قدرداں تھا اور اس نے جس کاوش اور محنت سے اپنا رصد خانہ تیار کیا اس سے اس کی تحقیق و تدقیق کی روح کا پتا بخوبی چلتا ہی۔ بڑے امرا کے علاوہ معمولی ملازمین کا ذکر آیندہ اوراق میں بکثرت نظر سے گزرے گا۔

شاہانِ اودھ کا دربار

جیسا کہ لکھا جا چکا ہی مغلوں کی مرکزی سلطنت میں انحطاط کے آثار رونما ہوتے ہی اطراف و اکناف ملک میں آزاد حکومتیں قایم ہو گئیں۔ ان حکومتوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ ہر چیز میں مرکزی سلطنت کے ساتھ مشابہت پیدا کریں اس لیے لوازمِ شان و شوکت کے علاوہ علوم و معارف کی حوصلہ افزائی اور آبیاری میں بھی وہ مغلوں کی مثال کو سامنے رکھتے تھے۔ چنانچہ ان آزاد حکومتوں کے قایم ہوتے ہی لکھنؤ، حیدرآباد، عظیم آباد، مرشدآباد وغیرہ اکثر مقامات میں علمی مراکز قایم ہو گئے۔ شمالی ہندستان میں سب سے زیادہ اہم اور عظیم الشان حکومت شاہانِ اودھ[1] کی تھی۔ جہاں بہت سے علما و شعرا اکثر موجود رہتے تھے۔ شاہانِ اودھ کے دفاتر میں فارسی داں ہندو

[1] اودھ کے حالات تاریخ اودھ نجم الغنی اور عماد السعادت (قلمی) آزاد بلگرامی سے لیے گئے ہیں۔

به تعداد کثیر ملازم تھے معمولی منشیوں سے لے کر دیوان اعلیٰ کے مناصب پر ہندو تعلیم یافتہ متمکّن تھے۔ علی الخصوص بیت الانشا اور دارالانشا تو ہندوؤں کا خاص محکمہ تھا یہاں تک کہ اٹھارھویں انیسویں صدی میں لفظ 'منشی' کا اطلاق عموماً فارسی داں ہندوؤں ہی پر کیا جاتا تھا۔ اس عہد میں جو ہندو دیوان، ناظم، وزیر، بخشی وغیرہ عہدوں پر فائز ہوئے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔

نول رائے (بخشی صفدر جنگ)، راجہ جھنی بہادر (مدار المہام شجاع الدولہ)، راجہ ٹکیت رائے (مہتمم دیوانی آصف الدولہ)، راجہ نول کشن، راجہ پتر چند، راجہ میوہ رام (بعہد نصیر الدین حیدر)، امرت لعل (عرض بیگی غازی الدین حیدر)، منشی جوالا پرشاد وقار (منشی الممالک نصیر الدین حیدر)، راجہ رتن سنگھ زخمی، راجہ کندن لال اشکی، منشی صاحب رام خاموش وغیرہ ملک کے نظم و نسق پر یہی لوگ حاوی تھے اور بلا شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں جو اقتدار انھیں حاصل تھا وہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہوگا۔ یہ لوگ اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ، انتہائی درجے کے با مذاق، ذوقِ سخن سے آشنا نکتہ پرور اور نکتہ سنج ہوتے تھے۔ بیک وقت صاحب سیاست اور صاحبِ قلم تھے۔ کہتے ہیں کہ نواب سعادت علی خاں نے اپنی مملکت میں ایک دفعہ شراب کی ممانعت کر دی تو صاحب رائے خاموش نے جو دفتر بخشی گری کے منتظم تھے ایک عرض داشت بدیں الفاظ لکھی:۔

قرق می ایام ہولی ہیں کہو کیا کیجیے	جی میں آتا ہے کہ اس صورت میں کنٹھی لیجیے
گر تماشا کا بیٹھوں کا دیکھنا منظور ہو	شاہا دو دن کے لیے ہم کو اجازت دیجیے

اس پر نواب سعادت علی خاں نے لکھا ع

محتسب را درونِ خانہ چہ کار

غرض آں کہ اودھ کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ ہندو

اودھ کے نظم و نسق پر چھائے ہوئے تھے اور ان میں فارسی علم و تعلیم کا بہت چرچا تھا۔

مملکتِ حیدرآباد لکھنؤ کے بعد حیدرآباد کا نمبر آتا ہے[1]۔ ذیل کے اوراق میں ہم مصنفین کی جو فہرست پیش کریں گے ان میں ایک معتدبہ تعداد ملازمین مملکت حیدرآباد کی ہے۔ سب سے نامور اور مہتم بالشان شخصیت جو اس عہد میں گزری ہے وہ لچھمی نراین شفیق کی ہے۔ مہاراجہ چندولال ایک علم دوست امیر تھا۔ راجہ گردھاری پرشاد باقی قدردانِ علم ہونے کے علاوہ خود ایک پُرگو، طومار نویس مصنف بھی تھا۔ آج ہندستان میں نظام کی مملکت علم پروری کے اعتبار سے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس سے عہدِ ماضی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ زیرِ بحث عہد میں راجہ نرندر بہادر، راجہ گوبند بخش بہادر، راجہ رام راؤ، رائے بالا پرشاد ربط، رائے منالال بعض اہم شخصیتیں تھیں جن کی ذات میں علم اور سیاست دونوں جمع تھے۔

مرہٹے اور فارسی کرناٹک کے ہندو ملازمین نے بھی تھوڑی بہت تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ مرہٹوں کے متعلق صاف طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ انھوں نے کس حد تک فارسی زبان کی سرپرستی کی۔ بہت کم مرہٹے مصنف کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فارسی مرہٹہ حکومت کی درباری زبان تھی مگر وہ زیادہ تر اس لیے کہ فارسی کی گزشتہ عظمت اور صوبجاتی زبانوں کی تنگ دامانی کی وجہ سے یہ امر کسی حد تک ناگزیر تھا کہ فارسی ہی کو سیاسی زبان کے طور پر باقی رکھا جائے لہٰذا مراسلات و مکاتبات فارسی میں ہوتے تھے۔ معاہدات وغیرہ کی زبان بھی فارسی تھی۔ اگر مرہٹہ حکومت کے نظامِ سلطنت پر نظر ڈالی جائے تو بالکل مغل طرزِ حکومت کی نقل معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر

---

[1] حیدرآباد کے حالات گلزارِ آصفیہ سے لیے گئے ہیں۔

یہ الفاظ ملاحظہ ہوں :۔

پیشوا	یعنی	وزیر
مجموعہ دار	"	آڈیٹر
دق نویس	"	وقایع نویس
شرونویس	"	شروع نویس
دبیر	"	فارن سکریٹری
حول دار	"	حوالہ دار
ہزاری		

جمالہ دار (جمع نویس)، کارکن، میراث دار، برات، فرنویس (فرد نویس)، قلعہ دار، مقدم، دیوان، ناجر (ناظر) سرشتہ دار (سررشتہ دار) وغیرہ۔[1]

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی ایام

یہ بیان غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس باب میں بہت سے ایسے مصنفین کا ذکر ہو جنھیں ایسٹ انڈیا کمپنی[2] کے افسروں نے کتابیں لکھنے پر آمادہ کیا۔ ہم اگلے باب میں چل کر انگریزوں کی فارسی کے متعلق حکمت عملی پر بحث کریں گے لیکن یہاں اتنا بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہو کہ انگریزوں نے اپنے تسلط کے ابتدائی ایام میں فارسی کی گزشتہ حیثیت کو برقرار رکھا اُن کی درباری زبان فارسی ہی تھی۔ عدالتی کاروبار، معاہدات، خط وکتابت وغیرہ میں فارسی ہی ذریعۂ اظہار سمجھی جاتی تھی۔ ملک کی کوئی اور زبان اس کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی۔ یورپین ملازمین کو فارسی میں ماہر بنانے

---

[1] سیواجی کی لائف۔ از سر جادو ناتھ سرکار۔ ص ۴۶۰، ۴۶۶۔ اس کے علاوہ "مرہٹی پر فارسی زبان کا اثر" از ڈاکٹر مولوی عبدالحق بھی ملاحظہ ہو۔

[2] کمپنی کا ذکر آیندہ باب میں مفصل آئے گا۔

کے لیے پہلے پہل بغداد میں بھیجا جاتا تھا مگر اس کے بعد ہندستان میں ہی تعلیم و تربیت کا انتظام ہوگیا۔ انگریزوں کی ملازمت میں جو ہندو مسلمان اہلِ قلم تھے وہ اپنے حکّام کی فرمائش یا خواہش پر اکثر کتابیں لکھا کرتے تھے۔ ایسی کتابوں کا ایک کافی ذخیرہ موجود ہے جن پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔[1] انگریزوں کی یہ کوششیں اگرچہ زیادہ تر سیاسی حیثیت رکھتی ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے کافی لٹریچر پیدا ہوا جس میں ہندوؤں کا کافی حصّہ ہے۔

اِس عہد کے ادب کی مقدار یہ عہد شعرا و مؤرخین کی کثرت کے اعتبار سے سب ادوار سے بڑھا ہوا ہے۔ اس عہد میں لٹریچر کے بکثرت پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب ایک مرکز کی بجائے تصنیف و تالیف کے بے شمار مراکز پیدا ہو گئے تھے۔ اگر ایک مقام پر مُصنّفین کو مایوسی ہوتی تھی تو وہ دوسرے مراکز کی جانب چل دیتے تھے۔ ہم ذیل میں اس عہد کی ان کتابوں کی ایک سرسری سی فہرست پیش کرتے ہیں جو ہمارے علم میں آئی ہیں:۔

تاریخ کی کتابیں	۳۷
سوانح و سیر	۱۱
ریاضی	۴
تراجم	۱۱
قصص	۹
انشا	۱۹
شعرا (علاوہ معمولی شاعروں کے)	۳۵

---

[1] اس کے لیے دیکھو میرا مضمون "ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں فارسی کی حیثیت"

اِس عہد کے ادب کی بعض خصوصیات

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے ادب کی بعض امتیازی خصوصیتوں کا ذکر کیا جائے سب سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ صدی جس کے متعلق ہم بحث کر رہے ہیں "لغات" کی صدی ہے۔ اورنگ زیب کے بعد ایرانیوں کی آمد ہندستان میں پہلے کی نسبت بہت کم ہو گئی تھی۔ اس لیے روزمرّہ اور جدید محاوروں کے متعلق شدید اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ ایک گروہ جس میں ایرانی النسل اور حامیانِ ایران شامل تھے یہ کہتا تھا کہ کوئی ہندستانی صحیح معنوں میں فارسی زبان میں سند نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ ہندستانی علما و فضلا کے اقوال پر نکتہ چینی کرتے تھے اور ان کی آرا کو بے حقیقت سمجھتے تھے۔ ان نزاعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا اس پر ناتجربہ کار منشیوں کی فارسی نے اور بھی بُرے اثرات پیدا کیے اور اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہونے لگی کہ محاورات کی چھان بین کی جائے اور نئے حالات میں نئی قسم کی کتابیں تصنیف کی جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں بے شمار لغت نویس پیدا ہوئے۔ مثلاً خان آرزو، محمد افضل ثابت، رائے انند رام مخلص، سیالکوٹی مل وارستہ، ٹیک چند بہار وغیرہ۔ یہ امر بہت جاذبِ توجہ ہے کہ اس عہد کے لغت نویسوں میں ہندو لغت نویسوں کا درجہ بہت بلند ہے۔ ان کی کتابیں ہندوؤں کے تمام فارسی لٹریچر کی جان ہیں۔ ان میں تنقید، تحقیق، وسعتِ معلومات، عمقِ نظر کے بہت سے اوصاف نمایاں ہیں مصطلحات وارستہ اور بہارِ عجم دو عظیم الشان تصانیف ہیں جن کو ہندستان کے سارے فارسی لٹریچر میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ اس عہد کے لٹریچر کی سب سے شاندار خصوصیت ہے کہ اس میں بہارِ عجم اور مصطلحات منصّۂ شہود پر آتی ہیں۔ مرآۃ الاصطلاح لغت کے اعتبار سے نہ سہی مگر بعض دوسرے وجوہ

سے بہت دلچسپ کتاب ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد میں ہندوؤں میں شعر وشاعری کا ذوق بہت بڑھ گیا تھا۔

اس سو سال کے عرصے میں بہت سے مشہور اور نامور ہندو شاعر سامنے آئے جن کا ذکر تذکروں میں بہت شاندار الفاظ میں ملتا ہے شعر کی کتابوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ شعرا نے اکثر مثنویاں لکھیں جن میں مذہبی مضامین پر طبع آزمائی کی گئی۔

اس عہد کے تذکرے بھی لٹریچر میں بہت اہمیت رکھتے ہیں جو شعر وسخن کی تاریخ کے لیے معلومات کا ایک بہت بڑا سرچشمہ سمجھے جاتے ہیں مثلاً سفینۂ خوش گو، گلِ رعنا، انیس الاحبا، چمنستانِ شعرا اور ہمیشہ بہار وغیرہ۔ گلِ رعنا اور انیس الاحبا کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہندو شعرا کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے جس سے ہمیں بہت مدد ملی ہے سفینۂ خوش گو فارسی زبان کے بڑے بڑے تذکروں میں شمار ہوتا ہے تین جلدوں میں مصنّف نے فارسی کے اکثر شعرا کا تذکرہ کیا ہے حالات بہت مفصل ہیں اور اشعار کا انتخاب موزوں ہے۔ لغت کی طرح اس عہد کے تذکرے بھی ہندستان کے فارسی لٹریچر کے نمایاں عناصر میں شامل ہونے کے قابل ہیں۔

ذیل کی فہرست سے معلوم ہو جائے گا کہ تاریخ کی بہت سی کتابیں ہندوؤں نے اس عہد میں لکھیں لیکن سوائے ایک دو کتابوں کے کوئی کتاب اعلیٰ درجے کی نہیں جو خلاصۃ التواریخ کی ہم پلّہ ہو یا جسے ادب میں کوئی حیثیت یا اعتبار حاصل ہو، مگر اس میں شک نہیں کہ اس عہد میں شفیق کی شخصیت مؤرخ کی حیثیت سے بہت اہمیت رکھتی ہے شفیق نے تاریخ پر بہت سی کتابیں لکھیں جو بعض حیثیتوں سے مستند سمجھی جاتی ہیں۔ بساط الغنائم میں مرہٹوں کی ایک معاصرانہ تاریخ لکھ کر

شفیق نے بہت سے نئی معلومات کے دروازے ہم پر کھول دیے ہیں۔ اسی طرح شفیق کی کتاب مآثر حیدری بھی گمان غالب ہے کہ اکثر تواریخ کی بہ نسبت زیادہ تنقیدی ہوگی۔ اگرچہ اس کا آج کل کہیں وجود نہیں شفیق ایک ہمہ دان فاضل تھا۔ ایک کامیاب مورخ ہونے کے علاوہ بہترین تذکرہ نگار اور شاعر بھی تھا چنانچہ ہم آگے چل کر اس کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

جس طرح گزشتہ دوْر میں برہمن، سجان رائے، ہرکرن وغیرہ بے نظیر ہستیاں تھیں اسی طرح اس عہد میں شفیق، مخلص، بہار اور وارستہ علم و فضل کے لحاظ سے یکتا تھے۔ ہم ان ہندو علما و شعرا کو فارسی کے چند نامور اکابر کا ہم پلّہ مان سکتے ہیں۔

اس مختصر سی تنقید کے بعد ہم مختلف فنون کی کتابوں کا علیحدہ علیحدہ ذکر کرتے ہیں۔ پہلے تمام کتابوں کا ذکر کریں گے پھر ان میں سے بعض اہم کتابوں کو چُن کر ان پر مفصّل بحث کریں گے۔

تاریخ کی کتابیں[1]

(۱) گلشن[2] اسرار (۱۱۲۵ھ) مُصنفہ نیہ نراین ولد چین رائے کھتری، سپرہری منشی راجہ محکم سنگھ بعہد فرخ سیر۔ اس کتاب میں ہندوؤں کی تاریخ کو محققانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے اور رامائن، مہابھارت، بھگوت اور ہری بنس کو بطور ماخذ استعمال کیا ہے۔ کتاب کے چار باب ہیں

---

[1] اصل مضمون انگریزی میں ہے جہاں ہر کتاب پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ یہاں ہم اختصار کی خاطر زیادہ تفصیلات کو نظرانداز کرتے ہیں [2] ریو ج ۳ - ص ۹۱۷

(۲) سعیدنامہ[۱] (۱۱۳۵ھ) مصنفہ منشی جسونت رائے۔ یہ سعید اللہ خاں والیِ کرناٹک (متوفی ۱۱۴۵ھ) کے عہدِ حکومت کی تاریخ ہے۔ جسونت رائے منشی نے بہت سی مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ سعیدنامہ تین دفتروں میں منقسم ہے۔ ۱۱۳۵ھ تک کے حالات مرقوم ہیں۔

(۳) شاہ نامہ منوّر کلام[۲] (۱۱۳۴ھ) مصنفہ شیو داس۔ فرخ سیر اور محمد شاہ کے ابتدائی عہدِ حکومت کی تاریخ ہے نظام الملک کی وزارت کا حال قابلِ ذکر ہے۔

(۴) تذکرۃ الامرا[۳] (۱۱۴۰ھ) مصنفہ کیول رام۔ اکبر سے لے کر عالمگیر تک جتنے امرا مغلوں کے دربار میں ہوئے ہیں ان کا تذکرہ ہے۔ مآثر الامرا کے مقابلے میں اس کو خاص اہمیت حاصل نہیں۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہندو امرا کا تذکرہ علیحدہ دیا گیا ہے۔ بیانات بہت مختصر اور مجمل ہیں جن میں صرف منصب، خدمات اور ترقیات کا ذکر ہے۔

(۵) کیگوہر نامہ[۴] (۱۱۳۷ھ) مصنفہ دنی چند بالی۔ یہ گکھڑوں کی تاریخ ہے۔

(۶) تحفۃ الہند[۵] (۱۱۴۸ھ) مصنفہ لال رام۔ ہندستان کی تاریخ عمومی۔ تا عہدِ فرخ سیر۔ اس میں شاہانِ ایران کا بھی مختصر تذکرہ ہے۔

(۷) تاریخ محمد شاہی (۱۱۵۴ھ) مصنفہ خوش حال چند کایستھ۔ عہد محمد شاہی میں دفتر دیوانی دہلی میں منشی تھا۔ اس کتاب کا دوسرا نام نادر الزمانی ہے۔ [مفصل تبصرہ آگے آتا ہے]

---

۱ انڈیا آفس کیٹالاگ۔ عدد ۵۰۰: ریو۔ ج ۱ ص ۳۳۱

۲ ریو۔ ج ۱ ص ۲۷۴ ۳ بوڈلین کیٹالاگ۔ عدد ۲۵۸: ریو۔ ج ۱ ص ۳۳۹، ایلیٹ، تاریخ ہند۔ ج ۸۔ ص ۱۹۲ ۴ ریو۔ ج ۳۔ ص ۱۰۱۲: ایشیاٹک سوسائٹی بنگال عدد ۱۸۸ ۵ ریو۔ ج ۱۔ ص ۲۳۶

(۸) تاریخ احمد خانی[۱] (سنہ ۱۱۷۰ھ) مصنفہ نول رائے جو احمد خاں بنگش کا ملازم تھا۔ اس کتاب میں احمد خاں بنگش کے حالات ہیں، دوسرے باب میں مختلف مضامین پر کہانیاں ہیں۔

(۹) چہار گلشن (سنہ ۱۱۷۳ھ) مصنفہ رائے چتر من کالیستھ۔ یہ کتاب غازی الدین حیدر کی فرمایش پر لکھی گئی تھی۔

(۱۰) رسالہ نانک شاہ[۲] (سنہ ۱۱۹۷ھ) مصنفہ بدھ سنگھ منشی۔ یہ کتاب میجر جیمز مورڈنٹ کی فرمایش پر لکھی گئی تھی، یہ سکھوں کی تاریخ ہے۔

(۱۱) تواریخ حیدری[۳] (سنہ ۱۱۹۷ھ) مصنفہ بدھ سنگھ منشی۔ یہ سلطان حیدر علی والیٔ میسور کی تاریخ ہے۔

(۱۲) قصہ دریائے گومتی[۴] (سنہ ۱۱۸۱ھ) مصنفہ فتح چند منشی کالیستھ۔ ایک مسیحی پادری کی خواہش سے لکھی گئی۔

(۱۳) میزانِ دانش[۵] (سنہ ۱۱۷۲ھ) مصنفہ انند روپ برہمن۔ جو خانوجی بھونسلا کا ملازم تھا، یہ ہندستان کی ایک مختصر سی تاریخ ہے۔

(۱۴) تاریخ فیض بخش[۶] (سنہ ۱۱۹۰ھ) مصنفہ شو پرشاد۔ یہ روہیلکھنڈ کے افغانوں کی تاریخ ہے۔ شو پرشاد نواب فیض اللہ خاں کی ملازمت میں تھا جہاں وہ کرک پیٹرک سے ملا۔ موجودہ کتاب صاحب موصوف کے ایما سے لکھی گئی تھی۔ رہیلوں اور شاہانِ اودھ کے تعلقات پر خاصی روشنی ڈالتی ہے۔

---

[۱] ریو۔ ج ۳۔ ص ۱۰۰۳، [۲] ریو۔ ج ۲۔ ص ۸۶۰۔ [۳] انڈیا آفس لائبریری عدد ۵۱۶، ۵۱۷، [۴] ریو۔ ج ۲۔ ص ۸۲۷، [۵] ریو ج ۳۔ ص ۹۱۰ [۶] ریو۔ ج ۲، ص ۳۰۶: ایلیٹ۔ ج ۸۔ ص ۱۷۵

(۱۵) خط ہلکر[۱] (سنہ ۱۱۹۰ھ) مصنّفہ مکند رائے۔ یہ راجہ ہلکر کے سیاسی خطوط کا مجموعہ ہے۔

(۱۶) احوال گوالیار[۲] (سنہ ۱۱۹۴ھ کے بعد) مصنّفہ موتی رام و خوش حال۔ یہ قلعۂ گوالیار کی تاریخ ہے۔

(۱۷) تاریخ شاہ عالم[۳] (سنہ ۱۱۹۶ھ) منالال۔ یہ شاہ عالم ثانی کی تاریخ ہے۔ ولیم فرینکلن نے شاہ عالم کی تاریخ لکھتے وقت اس کو استعمال کیا ہے۔ سنہ ۱۱۸۴ھ سے لے کر سنہ ۱۱۹۶ھ تک کے واقعات ہیں۔

(۱۸) چہار گلزار شجاعی[۴] (سنہ ۱۲۰۱ھ) مصنّفہ ہرچرن داس کالیستھ۔ یہ کتاب نواب شجاع الدّولہ کے نام پر معنون کی گئی ہے اور دو بڑے حصّوں میں منقسم ہے۔ ایک حصّہ ہندو عہد اور دوسرا حصّہ اسلامی عہد سے بحث کرتا ہے۔ پہلے مسلمان بادشاہوں کے حالات فرشتہ سے ماخوذ ہیں۔

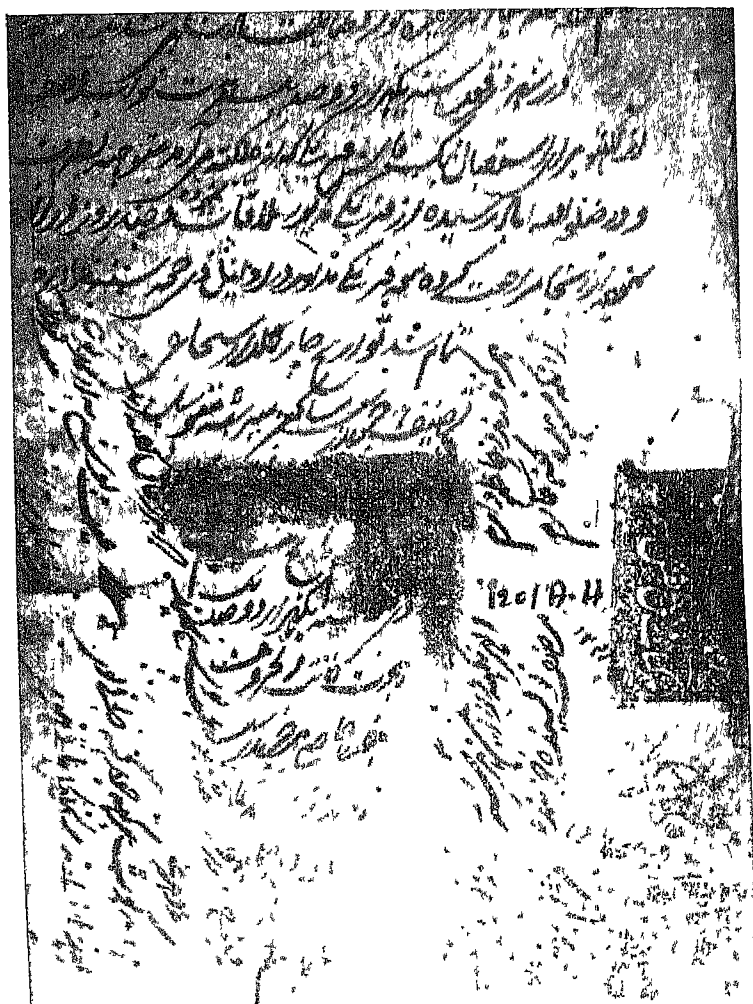
(۱۹) تاریخ جگل کشور[۵] (۱۷۷۴-۱۷۸۳ع) مصنّفہ جگل کشور۔ یہ ہندستان کی عمومی تاریخ ہے جو لارڈ چیف جسٹس سر ایلیجا امپی کی فرمایش پر لکھی گئی۔

(۲۰ تا ۲۶) مصنّفات شفیق اورنگ آبادی (ان کا ذکر مفصل آتا ہے۔

(۲۷) راج سوہاولی[۶] (سنہ ۱۲۰۷ھ کے بعد) مصنّفہ ہنی رام۔ یہ ہندستان کی تاریخ ہے جو کرنل فرنھ کے پاس خاطر سے لکھی گئی۔

---

[۱] معارف - ۱۹۱۸ [۲] ریو - ج ۱ - ص ۳۰۴ [۳] ریو - ج ۳ - ص ۹۴۳ بانکی پور لائبریری - ج ۷ - ص ۹۵ - عدد ۵۸۶: ایلیٹ [۴] اس کا ایک خود نوشت قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے [۵] ریو - ج ۳ - ص ۱۰۲۹؛ انڈیا آفس لائبریری - عدد ۲۰۸



چہار گلزار شجاعی ـ مصنف کے خود نوشت نسخے کا ایک ورق
(پنجاب یونیورسٹی لائبریری)

(۲۸) صحیح الاخبار[1] (۱۲۰۹ھ) مصنفہ سروپ چند کھتری۔ یہ ہندستان کی عمومی تاریخ ہی جو سر جان شور گورنر جنرل کے لیے تحریر کی گئی تھی۔

(۲۹) تذکرہ[2] (۱۱۵۷ھ) انندرام مخلص۔ یہ کتاب نادر شاہ کے حملے کے واقعات پر مشتمل ہی شاید اسی کا نام 'بدایع وقایع' ہی۔ یہ بہت اہم تصنیف ہی اور اس عہد کے معاشرتی حالات پر بہت کارآمد روشنی ڈالتی ہی۔ ایلیٹ کی تاریخ ہندستان میں اس تذکرے کے چیدہ چیدہ مقامات کا ترجمہ کیا گیا ہی۔ اس کا حال اور کہیں سے نہیں مل سکا۔ ہم ذیل میں تاریخ ایلیٹ کے اصلی الفاظ کا ترجمہ درج کرتے ہیں:-

"سر ایچ۔ ایس ایلیٹ کے کاغذات سے اس کتاب کا مفصل حال معلوم نہیں ہوا لفٹنٹ پرکنس کا ترجمہ دراصل ایک ہی شاہد عادل ہی۔ یہ ترجمہ نواب ضیاء الدین کے نسخے سے کیا گیا تھا۔ مصنف نادر شاہ کے واقعات کا عینی گواہ تھا۔ کتاب کے اوپر ایک یادداشت لکھی گئی ہی کہ یہ مکمل نہیں۔ آغاز اس باب سے ہوتا ہی اُن واقعات کی تاریخ جو ہندستان میں سنہ ۱۱۵۰ھ میں وقوع پزیر ہوئے، ہم نے اس باب کا ترجمہ کر دیا معلوم نہیں یہ کتاب صرف اتنی ہی ہی یا کچھ زیادہ ہی"[3]

(۳۰) فرماں روایان ہنود[3]۔ ہندو راجایان قدیم کی تاریخ علاء الدین غوری

---

[1] ایلیٹ۔ ج ۸ ص ۳۱۴؛ ریو۔ ج ۳۔ ص ۸۳۱ [2] ایلیٹ۔ ج ۸۔ ص ۷۶ بدایع کا ایک قلمی نسخہ یونیورسٹی لائبریری میں ہی جو شاید مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہی۔ کتاب کے مفصل حال کے لیے دیکھو پرنسپل محمد شفیع صاحب کا مضمون اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۲۷ء

[3] خوش دل کی تصنیفات کے لیے دیکھو نشترِ عشق (قلمی) ج ۱ ص ۱۰۷؛ معارف ۱۹۱۸؛ ریو ص ۱۰۵۲۔

کے عہد تک۔ مُصنّفہ رائے امر سنگھ خوش دل (متوفّی ۱۲۲۵ھ)

(۳۱) بزمِ خیال کے نام سے رائے امر سنگھ خوش دل نے انگریزوں کی تاریخ لکھی ہے۔

(۳۲) زبدۃ الاخبار۔ مُصنّفہ رائے امر سنگھ خوش دل۔ یہ خلاصۃ التواریخ کا خلاصہ ہے۔

(۳۳) مجمع الاخبار[۱] (۱۲۱۴ھ) مصنّفہ ہر سُکھ رائے۔ یہ ہندستان کی عمومی تاریخ ہے۔

(۳۴) حالاتِ مرہٹہ[۲] (۱۱۷۴ھ) مصنّفہ رگھو ناتھ۔ یہ مرہٹہ قوم کی تاریخ ہے۔

(۳۵) اختصار التواریخ (۱۲۱۷ھ) مصنّفہ ساون سنگھ ولد لچھمن سنگھ کالیتھ۔ یہ کتاب لب التواریخ کا خلاصہ ہے۔

(۳۶) خلاصۃ التواریخ[۳]
(۳۷) وارداتِ قاسمی

مصنّفہ کلیان سنگھ۔ یہ مغل بادشاہوں کی تاریخ ہے جس کے ساتھ ناظمانِ بنگال کی تاریخ بھی دی گئی ہے۔ خلاصۃ التواریخ کی تاریخ تصنیف ۱۱۹۸ھ ہے اور وارداتِ قاسمی ۱۲۲۷ھ میں لکھی گئی۔ یہ دراصل ایک ہی کتاب کے دو باب ہیں جنھیں علیحدہ علیحدہ نام دے دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ناظمانِ بنگال کی تاریخ کے لیے اہم خیال کی جاتی ہے۔

مندرجۂ بالا تصنیفات میں سے ع۷، ع۹، ع۲۰ تا ۲۶ اور ع۳۶ تا ۳۷ اہم ہیں۔ ہم ان میں سے بعض کے متعلق کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہیں:-

---

۱؎ ایلیٹ۔ ج ۸۔ ص ۳۵۵ ۲؎ معارف ۸ ۱۹۱ ۳؎ ریو۔ ج ۱۔ ص ۲۸۳: ج ۱۔ ص ۳۱۲

خوش حال چند کایستھ

تاریخ محمد شاہی

اِس کتاب کا مصنّف خوش حال چند کایستھ المعروف بہ نادر الزّمانی تھا۔ یہی وجہ ہی کہ اس کتاب کو تاریخ نادر الزمانی بھی کہتے ہیں مصنّف کا باپ منشی جیون[1] رام اورنگ زیب اور بہادر شاہ کے عہد میں بہت سے ذمہ داری کے عہدوں پر فائز رہا۔ انھوں نے شیخ عبدالعزیز اکبرآبادی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے اُستاد کا مقولہ ہی۔

"کہ مارا دریں مدّت بہتر ازیں شاگردے بدست نیامدہ[2]"

خوش حال چند محمد شاہ کے عہد میں دیوانی دفتر کا منشی تھا۔ مصنّف کے ذاتی حالات اس کتاب میں بہ کثرت آتے ہیں۔

تاریخ محمد شاہی دو حصّوں میں منقسم ہی۔ پہلے حصّے کا نام مجمع الاخبار ہی اور دوسرے حصّے کا نام زبدۃ الاخبار۔

ہر ایک حصّہ بہت سے چھوٹے چھوٹے مقالات، حقایق، دقایق اور کیفیات پر مشتمل ہی۔

یہ دنیا کی عمومی تاریخ ہی جس میں ہندستان کی تاریخ زیادہ شرح وبسط سے بیان کی گئی ہی۔ اس کا سنِ تصنیف سنہ ۱۱۵۴ھ ہی۔

پہلی جلد میں کوئی اہم چیز نہیں۔ کتاب کا کارآمد حصّہ صرف وہی ہی جو محمد شاہ کے حالات پر ہی۔ اس تاریخ میں غیر متعلق مضامین بہت ہیں۔ مثلاً حساب، نجوم، علم الید (پامسٹری)۔ فنِ شعر کے متعلق کئی مقالے ہیں۔

---

[1] منشی جیون رام کے حالات کے لیے دیکھو تاریخ محمد شاہی (قلمی پبلک لائبریری لاہور) ق ۱۱

[2] ایضاً ق ۶

ہندو مسلمان اولیا کا ذکر مصنف خاص دلچسپی اور عقیدت سے کرتا ہے۔ امرا، علما اور خوش نویسوں کا ذکر مختصر ہے اور پچھلے مآخذ سے حرف بہ حرف نقل کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کافی ضخیم ہے لیکن فواید کم ہیں۔ تاہم اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ مصنف نے اس کتاب کو بہت سے معلوماتِ عامہ سے لبریز کرنے کی کوشش کی ہے (دیکھو ایلیٹ۔ ج ۸۔ ص ۷۰ اور ریو۔ ج ۱۔ ص ۱۲۸) اس کا ایک نسخہ پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے۔

رائے زادہ چترمن

چہار گلشن یہ کتاب چہار گلشن، چتر گلشن، اخبار النوادر اور خلاصۃ النوادر بہت سے ناموں سے مشہور ہے۔ رائے چترمن کالیتھ المعروف بہ رائے زادہ نے یہ کتاب اپنی عمر کے آخری سال میں وزیر غازی الدین حیدر کی فرمائش پر تحریر کی۔ مصنف کے پوتے رائے خان (یا رائے بھان منشی) نے ۱۲۰۴ھ میں اس پر نظر ثانی کی۔

چہار گلشن میں چار باب ہیں:۔

(۱) صوبہ ہائے ہندستان (۲) صوبہ جات دکن (۳) دہلی سے مختلف شہروں کا فاصلہ (۴) ہندو اور مسلمان فقیروں کے حالات (مشترح فہرست مضامین ریو کی فہرست میں موجود ہے۔ ریو ج ۳۔ ص ۹۱۰)

کتاب کا تاریخی حصہ چنداں اہم نہیں۔ ہندو مسلمان فقرا کے حالات، داخل و مخارج ہند اور فاصلوں کی فہرستیں صرف کار آمد حصے ہیں۔ سر جادو ناتھ سرکار نے اس کے بعض حصوں کا ترجمہ کیا ہے جو اس کی کتاب INDIA OF AURANGZEF میں شامل ہے۔

لچھمی نراین شفیق

تصنیفاتِ شفیق[۱] اورنگ آبادی شفیق کا باپ رائے منسارام نواب نظام الملک آصف جاہ کا پیشکار تھا چنانچہ مآثر نظامی کی ابتدا میں خود کہتا ہے:۔

"کہ بندۂ عقیدت شناس منسارام آصف جاہی ابن بھوانی داس غازی الدین خانی نبیرۂ بال کشن عابد خانی نے تخمیناً مدت ۵۰ سال اس سرکار دولت مدار میں اپنی زندگی بسر کردی۔ صدارت کُل کی خدمت انجام دی اور موردِ عاطفت وشفقت رہا۔"

رائے منسارام علاوہ منتظم ہونے کے ایک مُصنّف بھی تھا۔ اس نے ۱۲۰۰ھ میں ایک کتاب مآثر نظامی کے نام سے لکھی جس میں نواب آصف جاہ کی تاریخ بیان کی ہے۔ دوسری کتاب قانونِ دربارِ آصفی کے نام سے ۱۱۷۵ھ میں لکھی جیساکہ کتاب کے نام سے معلوم ہوتا ہے اس میں حکومتِ حیدرآباد کی جہاں بانی کے اصول ہیں۔ یہ کتاب بقولِ مُصنّف دوسال میں تیار ہوئی۔

شفیق اسی قابل باپ کا بیٹا تھا ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوا، فارسی کی تعلیم شیخ عبدالقادر سے حاصل کی۔ گیارہ سال کی عمر میں شعر کہہ سکتا تھا۔ میر عبدالقادر مہربان نے جو شفیق کا پہلا اُستاد تھا صاحب تخلص دیا۔ بعدازاں جب میر غلام علی آزاد بلگرامی کی صحبت میں گیا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ فارسی میں شفیق تخلص رکھو۔ البتہ اُردو میں صاحب ہی قایم رکھنے کی اجازت دے دی۔

---

[۱] شفیق کے حالات کے لیے دیکھو مقدمہ "چمنستان شعرا" مطبوعہ انجمن ترقیٔ اُردو: معارف اکتوبر ۱۹۲۹ء وغیرہ شاعری کے لیے دیکھو نشترِ عشق (قلمی) جلد ا

شفیق آزاد بلگرامی کا بہت احترام ملحوظ رکھتا تھا۔ اپنی کتابوں میں جہاں کہیں ذکر کرتا ہے نہایت عزّت سے ان کا نام لیتا ہے۔ تذکرۂ گلِ رعنا میں میر صاحب کا بہت طویل حال لکھا ہے ایک نظم آزاد سے خطاب کرتے ہوئے یوں لکھتا ہے:۔

سرورِ ہر دو جہاں آزاد ہے　　والیٔ کون و مکاں آزاد ہے
کنت کنزاً کے معانی پر خبر　　واقفِ سرِّ نہاں آزاد ہے
مرکزِ ادوارِ چرخِ چنبری　　قطب الاقطابِ زماں آزاد ہے

شفیق ایک طومار نویس مُصنّف تھا اُس نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی تاریخی تصانیف یہ ہیں:۔

(۱) حقیقتہائے ہندستان | (سنہ ۱۲۰۴ھ) یہ ہندستان کے صوبوں کے مداخل سے بحث کرتی ہے اور ولیم پیٹرک ریزیڈنٹ کے لیے تحریر کی گئی تھی۔

(۲) مآثرِ آصفی | (سنہ ۱۲۰۸ھ) یہ خاندانِ نظام کی تاریخ ہے جو خواجہ عابد کے حال سے شروع ہو کر آصف جاہ ثانی تک پہنچتی ہے۔ اس میں مرہٹوں کی بھی مختصر سی تاریخ ہے اور امرا اور راجاؤں کے حال بھی دیے ہیں۔

(۳) تنمیق شگرف | (سنہ ۱۲۰۰ھ) یہ بھی حقیقتہائے ہندستان کی طرز کی کتاب ہے۔ فرشتہ کو مصنّف نے بعض مقامات پر حرف بہ حرف نقل کیا ہے۔

(۴) بساط الغنائم | یہ مرہٹوں کی تاریخ ہے جو جنگِ پانی پت پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔

(۵) حالاتِ حیدرآباد | (سنہ ۱۲۱۴ھ) اس میں حیدرآباد کی مختلف مساجد و مکاتب، باغات اور دوسری عمارتوں کا حال بیان

کیا گیا ہے۔

(۶) مآثر حیدری | یہ غالباً سلطان حیدر علی کی تاریخ ہے مگر اس کا مفصّل حال کہیں سے نہ مل سکا۔ شفیق تاریخ نویس تھا۔ اس کی طبیعت پر میر غلام علی آزاد کے مادۂ تحقیق وتنقید کا بہت اثر پڑا۔ یہ یاد رہے کہ آزاد مآثر الامرا کی ترتیب میں صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کا دست راست رہا ہے۔ استاد کی قابلیت اور مجتہدانہ اہلیت سے شفیق ضرور متاثر ہوا ہوگا۔ تذکرۂ ملکاپوری میں شفیق کے متعلق لکھا ہے:-

"کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے نہایت تحقیق سے لکھتا ہے۔ جس شخص یا جس چیز کی حالت لکھتا ہے اس کے مالہ وما علیہ کو پورا پورا صاف کر دیتا ہے شفیق کو یہ لیاقت آزاد کی توجہ اور عنایت کی بدولت حاصل ہوئی۔ دکن میں اگرچہ آزاد کے اکثر تلامذہ صاحب تالیف ہوئے ہیں لیکن شفیق ان کے ارشد تلامذہ میں سے تھا۔"

اِس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شفیق میں تاریخ نگاری کے اکثر اوصاف پائے جاتے ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ شفیق بعض جگہ جانب داری سے کام لیتا ہے۔ بساط الغنائم میں سیواجی اور افضل خاں کی باہمی چپقلش کے ضمن میں وعدہ خلافی کا الزام ثانی الذکر پر لگاتا ہے اور کہتا ہے کہ افضل خاں نے سیواجی پر وار کیا۔ یہ روایت بالکل خلافِ واقعہ معلوم ہوتی ہے اور اس کے ذریعے شفیق نے سیواجی کے طرزِ عمل کو جائز ثابت کرنے کی ناکام سعی کی ہے۔

شفیق علاوہ مؤرخ ہونے کے سوانح نگار اور شاعر بھی تھا۔ لیکن شفیق کی بلندیِ مرتبہ کا زیادہ تر دارومدار اس کی مؤرخانہ حیثیت پر ہے۔ اس کے تذکروں کا حال آگے آتا ہے۔

تذکرے

اس صدی میں یہ تذکرے تصنیف ہوئے۔

(۱) بھگت مالا (۱۱۱۳ھ) مصنفہ بنونیت رام سوہنی خوشابی۔ اس کتاب میں ۳۷ ہندو مسلمان فقرا کا حال دیا گیا ہے اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔

(۲) ہمیشہ بہار[۱] (۱۱۳۶ھ) مصنفہ کشن چند اخلاص۔ یہ فارسی کے ان شعرا کا تذکرہ ہے جو ہندستان میں جہانگیر کے زمانے سے لے کر محمد شاہ کے عہد تک گزرے ہیں۔ اخلاص سنہ ۱۱۶۰ھ میں بہ عہد احمد شاہ فوت ہوا۔ شعرا کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے دیے گئے ہیں۔ تذکرے کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں۔

(۳) احوال بابا لال گُرو (۱۱۵۸ھ) مصنفہ لال جی داس۔ بابا لال گرو شاہ جہاں کے عہد میں ایک ہندو صوفی ہو گزرے ہیں۔ یہ کتاب ان کے ایک عقیدت مند لال جی نے لکھی ہے جس میں ان کی زندگی اور کرامتوں کا ذکر ہے (معارف بابت جولائی سنہ ۱۹۱۸ء ص ۱۱)

(۴) سفینۂ خوشگو [مفصل ذکر آگے آتا ہے]

(۵) تذکرۃ المعاصرین از خوشگو غالباً معاصرین شعرا کا تذکرہ ہے۔ یہ کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکا۔

(۶) سفینۂ عشرت[۲] (۱۱۶۵ھ) مصنفہ درگا داس عشرت۔ تمام متقدمین

---

[۱] ریو۔ ج ۳۔ ص ۱۰۸۶: بانکی پور فہرست ج ۸۔ ص ۸۳: انڈیا آفس لائبریری عدد ۶۷۵: سپرنگر ص ۱۱۴

[۲] فہرست بانکی پور لائبریری۔ ج ۸۔ ص ۱۲۶

و متاخرین شعرا کا تذکرہ بہ ترتیب حروف تہجی ہے۔

(۷) انیس الاحبّا | (۱۱۹۷ھ) مصنفہ موہن لال انیس۔ یہ مرزا فاخر مکین اور ان کے شاگردوں کا تذکرہ ہے۔ ہم نے ہندو شعرا کے سلسلے میں اس کتاب سے بہت فایدہ اٹھایا ہے[1]۔

(۸) گلِ رعنا
(۹) شامِ غریباں
(۱۰) چمنستانِ شعرا
} مصنفہ شفیق اورنگ آبادی

(۱۱) تذکرۂ گرو نانک | مصنفہ شفیق اورنگ آبادی۔ اس کا حال معلوم نہیں ہو سکا۔

(۱۲) تحفۃ الاحباب | مصنفہ شفیق مذکور۔ یہ شاید دوستوں اور معاصروں کے حالات پر ہے۔ کسی جگہ اس کا حال نہیں پڑھا۔

(۱۳) عیار الشعرا[2] | (۱۲۴۷ھ) مصنفہ خوب چند ذکا۔ یہ اُردو کا بہت مفصل اور مشرح تذکرہ ہے لیکن تحقیق و تنقید کے جوہر سے یکسر عاری ہے۔ اس میں ۱۵۰۰ شعرا کا حال ہے لیکن اسپرنگر کے قول کے مطابق "اپنی نوعیت کی سب سے زیادہ غیر محققانہ تصنیف ہے"۔

(۱۴) سفینۂ ہندی[3] (۱۲۱۹ھ)
(۱۵) تذکرۂ حدیقۂ ہندی (۱۲۰۰ھ کے بعد)
} مصنفہ بھگوان داس ہندی

بھگوان داس نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی

---

[1] ریو۔ ج ۱۔ ص ۳۷۶: سپرنگر ص ۱۶۱: بانکی پور ج ۸۔ ص ۱۳۶ [2] انڈیا آفس لائبریری۔ عدد ۲۰۷: سپرنگر ص ۱۸۴ [3] بانکی پور لائبریری۔ ج ۸۔ عدد ۷۱۵ ص ۱۵۵

پر بھی ایک رسالہ سوانح النبوۃ کے نام سے تحریر کیا ہے۔

(۱۶) **زیب التواریخ**[1] (۱۲۵۵ھ) مصنفہ گوکل چند۔ یہ زیب النسا بیگم معروف بہ بیگم سمرو کا منظوم حال ہے۔

ان تذکروں میں ۴ و ۷ اور ۸ تا ۱۰ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہم ان کا یہاں مختصر سا حال بیان کرتے ہیں۔

بندرابن داس خوشگو

سفینۂ خوشگو اس تذکرے کے[2] مصنف کا نام بندرابن داس خوشگو ہے جو خان آرزو کا شاگرد تھا چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب مجمع النفائس میں اس کا ذکر کیا ہے۔

"از مدت بیست و پنج سال تخمیناً بایں ہیچمدان ربط کلی بہم رسانیدہ و ایں عاجز ہم در تربیت ادبہ تقصیر از خود راضی نشدہ و نیست"

سفینہ عمدۃ الملک امیر خان انجام کے نام پر معنون کیا گیا تھا۔ یہ تمام قدیم و جدید شعرا کا تذکرہ ہے جو تین جلدوں میں منقسم کیا گیا ہے۔

پہلی جلد میں متقدمین کا حال ہے۔

دوسری جلد میں متوسطین کو لیا گیا ہے۔

تیسری جلد میں معاصرین کا بیان ہے۔ فہرست نگار بانکی پور لائبریری کا بیان ہے کہ خوشگو ۱۱۵۵ھ میں اس کتاب کو ختم کر چکا تھا۔ اس میں خان آرزو نے

---

[1] ریو۔ ج ۲۔ ص ۷۲۴ [2] بانکی پور لائبریری۔ ج ۸۔ ص ۸۳: باڈلین۔ عدد ۳۷۶: مجمع النفائس (قلمی)

کچھ ترمیمیں بھی کی ہیں اور حواشی کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اس تذکرے میں خان آرزو کو "خان صاحب قبلۂ نیازمندان" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

یہ تذکرہ بہت مشرح و مفصل ہے۔ شعرا کے کلام کا نمونہ بھی کافی دیا ہے مصنف کی تنقیدی حیثیت بہت اچھی ہے اور ترتیب سنین کے لحاظ سے ہے۔ معاصرین کا جو حال لکھا ہے وہ بہت مستند ہے اس لیے کہ مصنف کو اپنی ملازمت کے دوران میں ہندستان کے اکثر بڑے بڑے شہروں میں رہنے کا اتفاق ہوا وہاں اس نے اکثر شعرا سے ملاقاتیں کیں چنانچہ وہ بار بار ان ملاقاتوں کا ذکر کرتا ہے۔

سفینہ کی دوسری جلد باڈلین لائبریری میں ہے اور وہی حصّہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بھی ہے۔ تیسری جلد بانکی پور لائبریری میں ہے جس میں سے ہمیں اکثر ہندو شاعروں کے حالات ملے ہیں۔ افسوس ہے کہ تذکرۃ المعاصرین ہمیں کہیں سے بھی نہ مل سکا ورنہ وہ ہم عصر شعرا کا بہترین تذکرہ ثابت ہوتا۔

شفیق اورنگ آبادی کے تذکرے

(۱) گُل رعنا[1] (۱۱۸۷ھ) دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلی فصل میں فارسی کے مسلمان شاعروں کا ذکر ہے، دوسری فصل میں فارسی کے ہندو شاعروں کا حال ہے۔ دیباچے میں مصنف نے دس ماخذ کا ذکر کیا ہے۔ نشترِ عشق کے مصنف نے گُل رعنا کی بہت تعریف کی ہے۔ کتاب کی دوسری فصل ہمارے لیے خاص طور پر اہم ہے کیونکہ اس میں فارسی کے ہندو شعرا کے حالات دیے گئے ہیں۔

---

[1] بانکی پور۔ ج ۸۔ عدد ۷۰۱، ص ۱۲۸؛ ریو۔ ج ۳۔ ص ۹۷۷۔ جرنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی۔ ج ۹، ص ۱۶۳

(۲) شامِ غریباں | اس تذکرے میں اُن شعرا کا ذکر ہی جو ہندستان میں مسافر کی حیثیت سے وارد ہوئے۔ اس میں تراجم بہت مختصر ہیں۔ لطایف و ظرایف بہت ہیں۔ اشعار کا انتخاب موزوں اور عمدہ ہی۔ بعض اوقات مصنف نے مختلف شعرا کے مشکل اشعار کی تشریح بھی کی ہی۔

گل رعنا اور شامِ غریباں میں سے اوّل الذکر زیادہ اہم اور کارآمد ہی۔ اس کا دایرہ بھی وسیع ہی کیونکہ اس میں ہندستانی اور ایرانی شعرا کو جامعیت کے ساتھ لیا گیا ہی۔ ثانی الذکر صرف ایران کے ان شعرا سے بحث کرتا ہی جو ہندستان میں وارد ہوئے۔ گل رعنا میں تراجم بھی مُفصّل ہیں۔ آزاد بلگرامی کا حال بہت طویل ہی۔ شاہنشاہ اکبر کے ذکر میں ۴۶ صفحات صرف کیے ہیں۔ اگرچہ حالات زیادہ تر تاریخ بدایونی سے ماخوذ ہیں۔ گل رعنا ایک لحاظ سے سفینۂ خوشگو سے زیادہ اچھا ہی۔ یعنی گل رعنا کی ترتیب بہ لحاظ حروفِ تہجّی ہی - یہ ہر دو تذکرے (سفینہ اور گل رعنا) واقعات کی تاریخیں درج کرنے میں بہت کوتاہی سے کام لیتے ہیں مگر خوشگو شفیق کی نسبت زیادہ محتاط معلوم ہوتا ہی۔

(۳) چمنستانِ شعرا | یہ شفیق کا تیسرا تذکرہ ہی جس کی زبان فارسی ہی لیکن اردو شعرا کے حالات دیتا ہی۔ انجمن ترقیٔ اُردو نے حال ہی میں اس کو شایع کیا ہی جس کی ابتدا میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا مبسوط مقدمہ ہی۔ ہم نے شفیق کے حالات میں اس مقدّمے سے بہت فایدہ اُٹھایا ہی۔ اس تذکرے کی ایک خصوصیت یہ ہی کہ اس میں شعرا کی ترتیب ابجد کے لحاظ سے ہی۔ تراجم مختصر ہیں، زبان کسی حد تک منشیانہ ہی۔ ۱۱۷۵ھ میں جب شفیق کی عمر ۱۷ سال تھی اس وقت یہ تذکرہ لکھا گیا لیکن اشعار کا انتخاب، تحقیق و تنقید بتلاتی ہی کہ یہ کسی سن رسیدہ مُصنّف کا لکھا ہُوا ہی۔ اس میں مصنّف میر تقی میر کی مخالفت کرتا ہی اور نکات الشعرا

کے بعض بیانات کی تردید کرتا ہے۔

فنِ انشا کی کتابیں

(۱) طراز الانشا[1] (سنہ ۱۱۳۰ھ) مصنفہ انند جیت محقر

(۲) گلدستۂ فیض[2] سنہ ۱۱۳۹ھ کے بعد، مصنفہ تہوری مل تمکین

(۳) رقعات رائے چھبیلا رام[3] (سنہ ۱۱۴۰ھ)

(۴) دقائق الانشا[4] (سنہ ۱۱۴۶ھ) مصنفہ رنچھور داس۔ یہ فنِ انشا پر ایک جامع کتاب ہے جس میں شعر، بلاغت، عروض، انشا کے تمام شعبوں پر بحث ہے مصنف کا بیان ہے کہ میں نے اس کتاب کے لیے ۱۹ کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔

(۵) انشاءِ دین دیال[5] (سنہ ۱۱۵۴ھ) مصنفہ دین دیال فتح پوری

(۶) گلشنِ عجائب[6] (سنہ ۱۱۶۲ھ) مصنفہ رائے سنگھ منشی

(۷) مسوداتِ کیول رام[7] (سنہ ۱۱۵۶ھ کے بعد)

(۸) رقعاتِ صاحب رام[8] (سنہ ۱۱۵۶ھ کے بعد)

(۹) غریب الانشا[9] (سنہ ۱۱۵۷ھ) مصنفہ کشن سنگھ نشاط

(۱۰) رقعاتِ مخلص (سنہ ۱۱۶۴ھ) مصنفہ انند رام مخلص۔ ایک نسخہ یونیورسٹی لائبریری لاہور میں ہے۔ اس کتاب کا ذکر انند رام مخلص کے مفصل تذکرے میں آگے آتا ہے۔

---

[1] ریو۔ ج ۳۔ ص ۱۰۴۴ [2] ریو۔ ج ۳۔ ص ۹۸۷ [3] رائے چھبیلا رام کے حالات کے لیے دیکھو مآثر الامرا۔ ج ۲۔ ص ۳۲۸؛ کتاب کے لیے دیکھو ریو۔ ج ۳۔ ص ۹۸۹ [4] انڈیا آفس۔ عدد ۲۱۲۳؛ باڈلین عدد ۱۲۰۳ وغیرہ [5] ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (کرزن کالکشن) عدد ۱۴۷ [6] معارف ۱۹۱۸ [7] ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (کرزن کالکشن) عدد ۱۵۷ [8] ریو۔ ج ۳۔ ص ۹۸۶ [9] ریو۔ ج ۲۔ ص ۷۹۵

(۱۱) نیاز نامہ[۱] (۱۱۶۷ھ یا ۱۱۸۸ھ) مصنّفہ سبحان رائے پوری
(۱۲) گلشن بہار[۲] (۱۱۸۲ھ) مصنّفہ جسونت رائے منشی۔ یہ کتاب کسی قدر اہم خیال کی جاتی ہے۔
(۱۳) صفاتِ کائنات[۳] (۱۱۷۱ھ) مصنّفہ سیالکوٹی مل وارستہ
(۱۴) بہار نثر[۴] (۱۱۸۷ھ) مصنّفہ آیامل
(۱۵) طلسمات خیال[۵] (تقریباً سنہ ۱۲۰۰ھ) مصنّفہ نول کشور نزاکت۔ یہ کتاب کسی قدر اہم ہے۔
(۱۶) بہار معنی[۶] (بارھویں صدی ہجری) مصنّفہ اندرجیت
(۱۷) رقعات[۷] (۱۲۰۵ھ) مصنّفہ منشی لچھمی نراین۔ اس مجموعے کا مرتب محمد فیض بخش ہے۔
(۱۸) دستورالامتیاز[۸] (۱۲۰۳ھ) مصنّفہ خوش حال رائے
(۱۹) خلاصۃ الانشا[۹] (۱۲۲۵ھ) مصنّفہ لچھمی رام دہلوی
(۲۰) منتخب الحقائق (۱۲۰۹ھ) مصنّفہ امیر چند منشی۔ اس مجموعے میں مصنّف کے ذاتی خطوط ہیں، کچھ خط مہاراجا رنجیت سنگھ، زماں شاہ اور تیمور شاہ کے نام ہیں۔
(۲۱) منشآتِ منشی (تیرھویں صدی ہجری) مصنّفہ گنیش داس۔ اس کتاب میں چار فصلیں ہیں۔

---

[۱] ریو۔ ج ۳۔ ص ۹۸۸ [۲] ریو۔ ج ۳۔ ص ۹۸۷ [۳] ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (کرزن کالیکشن) عدد ۱۵۷، [۴] ایک نسخہ پنجاب پبلک لائبریری میں ہے۔ [۵] ایشیاٹک سوسائٹی بنگال عدد ۴۰۳ [۶] ایضاً (کرزن کالیکشن) عدد ۲۴۷ [۷] ریو۔ ج ۲۔ ص ۹۳۷ [۸] آصفیہ۔ ج ۱۔ ص ۱۲۲ [۹] ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (کرزن کالیکشن) عدد ۱۶۴

سب سے پہلا خط خدا کے نام ایک عریضہ ہے۔ یہ کتاب مغلوں کے طرزِ حکومت سے بحث کرتی ہے۔ کاغذاتِ دفتری کی مختلف اصطلاحیں اس کتاب میں موجود ہیں۔ ان کی تشریح و توضیح کی گئی ہے مثلاً التماس، رقم، فرمان تعلیقچہ، پروانہ، اعلام، سند، پروانۂ براۃ وغیرہ۔

اس کتاب میں عہدۂ قانون گو کی ابتدا اور اس کے فرائض پر بحث ہے اس کے بعد بہت سے اداروں کی کیفیت بیان کی گئی ہے مثلاً اربابِ التحاویل، سررشتۂ بخشی گری، سررشتۂ استیفا۔

چوتھی فصل "سیاق" کے متعلق ہے۔ یہ رسالہ اگرچہ مختصر سا ہے لیکن کارآمد ہے۔ گنبش داس قانون گو نے اس رسالے کے علاوہ راج درشنی، تاریخ پنجاب وغیرہ کے نام سے تاریخ کی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ منشآتِ منشی کا ایک نسخہ استاد محترم پروفیسر محمود شیرانی صاحب کے پاس ہے۔

انندرام مخلص کی نثر

انندرام مخلص کا مفصل حال "لغات" کے سلسلے میں دیا جائے گا۔ یہاں ہم سیاق کی رعایت سے مخلص کی نثر پر بحث کرنا مناسب خیال کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے ایک دو افسانوں کو بھی زیرِ بحث لے آتے ہیں۔

بانکی پور لائبریری میں انندرام کے منثورات کا ایک نسخہ موجود ہے جس کے چھ حصے ہیں۔ ہم یہاں اسی نسخے کی ترتیب کو مدِنظر رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے رقعات ہیں۔ مصنف نے دیباچے میں لکھا ہے کہ ۱۱۴۹ھ میں اسے چند اوراق پریشان کے دیکھنے کا اتفاق ہوا جو اس کے پرانے خطوط اور رقعوں کے مسودات تھے۔ چنانچہ اس نے ان سب کو ایک مقام پر جمع کیا جس سے کہ موجودہ مجموعۂ رقعات مرتب

ہوا۔ یہ خطوط زیادہ تر دوستوں کے نام لکھے گئے ہیں جن میں سے آرزو، پیام، آفریں لاہوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کچھ خطوط اعتماد الدولہ چین بہادر نصرت جنگ کے نام بھی ہیں۔ اس مجموعے میں ایک خط ہی جو کسی دوست کو ۱۱۵۵ھ میں لکھا گیا ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ اس میں ۱۱۴۹ھ کے بعد کے خطوط بھی ہیں (تفصیلی فہرست کے لیے دیکھو بانکی پور لائبریری، فہرست ج ۹۔ ص ۱۱۰)

رقعات کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہی۔ ان سے صرف مخلص کے تعلقات و روابط دوستانہ کا پتا چلتا ہی اور بس البتہ ادب کے لحاظ سے ان کو کچھ اہمیت حاصل ہی مخلص کے خطوط نہایت عمدہ ہیں۔ ان میں جا بجا مخلص کی غزلیات ہیں۔ خطوط نہایت باموقعہ اور مختصر ہیں۔ انشا میں زمانے کے مطابق مشکل عبارات کا ہجوم ہی۔ نثر کا نمونہ یہ ہی:۔

"سرشک فشانیہائے صبح و شام جگر گداختگان محبت اگر بہ گل زمین قبول تخم تاثیرنمے کاشت، مقلب القلوب از چہ عطف عنانے بیاد نواب مستطاب نے داد۔"

پری خانہ فہرست نگار بانکی پور لائبریری کا بیان ہی کہ یہ ایک مرقع کا دیباچہ[1] ہی جس میں میر عماد، میر علی وغیرہ مشہور خوش نویسوں کی خطاطی کے نمونے تھے اور ان کے علاوہ عمدہ اور دل فریب تصاویر بھی تھیں۔ آخر میں لکھا ہی کہ یہ دیباچہ ۱۱۴۴ھ میں تحریر کیا گیا ان جملوں سے تاریخ نکلتی ہی:۔

"زہے مرقع تصویرہا" اور "بے بہا مرقع از تصویر"

---

[1] یہی گل رعنا میں ہی۔ دیکھو فہرست بانکی پور ۸ : ۱۳۲

اسی طرح کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کرزن کلکشن[1] میں بھی ہے۔ فہرست نگار کا بیان ہے کہ مرقع تصویر نثرِ مسجّع کا ایک مجموعہ ہے جس میں کسی خاص موضوع کے متعلق بحث نہیں۔ ابتدا میں صفویوں کی تعریف و توصیف میں کچھ ٹکڑے موجود ہیں۔ پھر ہندستان کے امرا و عمائد کی مدح و ثنا ہے۔ کتاب میں مصنف کا نام نہیں ہے۔ صرف تخلص ہے۔ وہاں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنہ ۱۱۴۳ھ میں لکھا گیا تھا۔ تاریخ ان دو جملوں سے نکلتی ہے: "بے بہا مرقع از تصویر" اور "زہے مرقع تصویر ہا" غالباً یہ انند رام مخلص کی تصنیف ہے۔ فہرست نگار نے اس کو غلطی سے رقعاتِ انند رام کا مماثل سمجھا ہے۔ حالانکہ رقعات تو سنہ ۱۱۴۹ھ میں مرتب ہوتے ہیں اور رقعات کے مضامین کی نوعیت بھی بالکل مختلف ہے۔ قیاساً یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ یہ وہی دیباچہ پری خانہ یا اس کا کوئی حصہ ہے جس کا ذکر بانکی پور لائبریری کی فہرست میں آچکا ہے۔

منشوراتِ انند رام میں (نسخہ بانکی پور لائبریری ق ۶ ۵ - ۶۷) ایک طویل مکتوب بھی درج ہے جو انند رام نے حسب الحکم محمد شاہ غازی، ایران کے صفوی بادشاہ کو اس کی تخت نشینی کے موقع پر لکھا تھا اس کا آغاز یہ ہے:۔

سرِ نامہ بنام بادشاہیست
کہ پیشش جبہہ سا ہر کج کلاہیست

یہ آغاز سوسائٹی کے پری خانے کے آغاز کے مطابق ہے اور قیاس یہ ہے کہ سوسائٹی کے نسخے میں اور اس پری خانے میں کوئی فرق نہیں۔

چمنستان[2] مصنف کے اپنے بیان کے مطابق چمنستان سنہ ۱۱۵۹ھ میں مرتب ہو چکی تھی۔ کتاب کے آخر میں ایک شعر سے بھی یہی تاریخ

---

[1] ایوناف (کرزن کالیکشن) عدد ۱۵۶ [2] فہرست بانکی پور لائبریری ج ۹۔ ص ۱۱۱

نکلتی ہے ؎

چوں بہ پایاں رسید تاریخش
نسخۂ دل نشیں نوشت قلم

چمنستان میں نہایت مفید اور عمدہ عجائب و غرائب کو جمع کیا گیا ہے جو مرآۃ الاصطلاح میں بھی آچکے ہیں۔ مرآۃ الاصطلاح اس سے پہلے ۱۱۵۸ھ میں لکھی جا چکی تھی۔ اسی کے نکات اور فوائد، لطائف و حکایات کو چمنستان کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے۔ ایک شخص جو مرآۃ الاصطلاح سے فائدہ اٹھا لیتا ہے اس کو چمنستان کے دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اگر مطالب و مضامین کا مقابلہ کیا جائے تو اکثر مضامین دونوں کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ چمن دوم کا گلدستہ دوم بہ لحاظ نُدرت کے عجیب و غریب چیز ہے۔ اس میں پھولوں، درختوں اور پھلوں کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ کتاب میں چار چمن ہیں، ہر چمن میں دو گُل دستے۔ آخری گُل دستوں میں مخلص نے اپنے جدِ امجد اور والد کے نصائح بزرگانہ کو درج کیا ہے۔ بہرحال دل چسپی کے لحاظ سے کتاب عمدہ ہے۔ مفصل فہرست مضامین، فہرست بانکی پور لائبریری میں دی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۷۷ء میں بہ مقام لکھنؤ طبع ہو چکی ہے۔

ہنگامۂ عشق[1] یہ کنور سندر سین کرناٹکی اور رانی چند پربھا کا افسانۂ عشق و محبت ہے۔ دیباچے میں لکھا ہے کہ ۱۱۵۲ھ میں جب کہ مخلص کا قیام شاہ جہاں آباد میں تھا، وہ اپنے چند دوستوں کی معیت میں جن میں سے آرزو، محمد علی خاں معنی یاب خاں شاعر، راؤ کرپا رام، فتح سنگھ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں شاہ مدار کے میلے پر گیا۔ انھی ایام میں ایک رات مخلص کو نیند نہ آئی تو اس نے اپنے دکنی ملازم سے کہانی سنانے کی فرمائش کی۔ ملازم نے یہ کہانی سنائی جس کو محمد جائسی پدماوت

---

[1] ایضاً ص ۱۱۲ گُل رعنا میں غالباً اسی قصّے کی طرف اشارہ ہے (دیکھو فہرست بانکی پور ۸: ۱۳۲)

میں بیان کر چکا ہے۔ مخلص نے اسی کہانی کو فارسی میں منتقل کیا۔
اس کی تاریخ تصنیف ۱۱۵۲ھ ہے جو نغمۂ چند سے نکلتی ہے ؎

چو ایں نغمۂ چند نقاش شوق   بایں رنگ بر صفحہ تصویر کرد
بہ تحریک دل سال اتمام آں   قلم "نغمۂ چند" تحریر کرد

اس نسخے کے آخر میں ایک نوٹ ہے جو مخلص نے لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۵۵ھ میں اس نے خود کتاب پر نظر ثانی کی تھی اور مناسب ترمیم و اضافہ بھی ہوا۔

کارنامۂ عشق[1] یہ شاہزادہ گوہر اور ملکۂ مملوکات کے حسن و عشق کی داستان ہے۔ دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۴۲ھ میں مرتب ہوئی مگر "چہ شور انگیز رنگیں قصہ بود" سے جو تاریخ نکلتی ہے وہ ۱۱۳۹ھ ہے۔

افسوس کہ ان دونوں کہانیوں کا کوئی نسخہ ہمارے پاس نہیں اس لیے ان کے تفصیلی حالات نہیں لکھے جا سکتے۔

ان کتابوں کے علاوہ ہنگامۂ عشق کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلص نے کم از کم ایک اور کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام "بدائع و وقائع" ہے۔ یہ نادر تصنیف ہے۔ ایلیٹ نے اس کا نام "تذکرہ" لکھا ہے۔ اس کا مفصل حال حال ہی میں پرنسپل محمد شفیع صاحب نے لکھا ہے۔

قصص و حکایات

(۱) فرح بخش[2] (قبل از ۱۱۳۵ھ) مصنفہ لچھمی رام ابراہیم آبادی ضلع غازی پور۔ یہ کتاب عاقل خاں رازی کی "شمع و پروانہ" پر مبنی ہے۔

---

[1] فہرست بانکی پور۔ ج ۹۔ ص ۱۱۳ [2] ریو۔ ج ۲۔ ص ۷۶۸

(۲) داستانِ لال پری[۱] (سنہ ۱۱۲۴ھ) مُصنّفہ رنجیت رائے

(۳) رنگین بہار[۲] (سنہ ۱۱۵۵ھ) مُصنّفہ کرپا دیال۔ شاہزادہ بہرام اور دخترِ شاہ داراب کے معاشقے کا قصّہ

(۴) ہیر رانجھا[۳] (سنہ ۱۱۵۷ھ) مصنّفہ منسا رام منشی

(۵) قِصّۂ نوروز شاہ[۴] (سنہ ۱۱۵۷ھ) مُصنّفہ اودت چند عزیز کایستھ

(۶) ملاحت مقال[۵] (سنہ ۱۱۸۱ھ) مصنّفہ دلپت رائے۔ یہ تاریخی حکایات کا مجموعہ ہے جس میں مغل شاہنشاہوں اور امیروں کے متعلق کہانیاں جمع ہیں۔ یہ کتاب مہاراجا مادھو سنگھ کی فرمائش پر مرتّب کی گئی تھی (مہاراجا کی زندگی کے لیے دیکھو ٹاڈ راجستان ج ۲۔ ص ۳۶۹) اس کتاب کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ دلپت رائے نے دیوانِ حافظ کا ہندی میں ترجمہ کیا ہے۔

(۷) نخلستان[۶] (سنہ ۱۲۱۸ھ) مُصنّفہ شفیق اورنگ آبادی

(۸) پرورشِ نرورتی[۷] (۱۳ صدی ہجری) مصنّفہ لالہ رنجیت

(۹) قصّۂ ملک محمّد و شہربانو[۸] (۱۲ صدی ہجری) مُصنّفہ لچھمن سنگھ غیوری۔ اصل کتاب اُردو میں تھی غیوری نے شاہ عالم ثانی کی فرمائش پر اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

مُترجمات

(۱) مخزن العرفان[۹] (سنہ ۱۱۲۹ھ) مُصنّفہ روپ نراین ولد ہری نراین کھتری سیالکوٹی۔ یہ کتاب برج اور مقاماتِ متبرکۂ ہنود کی تاریخ ہے۔ اصل میں اس کتاب کا نام

---

[۱] ایوانوف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ عدد ۳۰۴ [۲] ریو۔ ج ۲۔ ص ۷۷۰، [۳] ریو۔ ج ۲۔ ص ۷۷۰، [۴] ایضاً [۵] ریو۔ ج ۳۔ ص ۱۰۰۵ [۶] انڈیا آفس کیٹالاگ (راس براؤن) ۱۵۳؛ انڈیا آفس عدد ۸۵۵ [۷] انڈیا آفس عدد ۸۷۵ [۸] انڈیا آفس عدد ۸۴۴ [۹] ریو۔ ج ۱ ص ۶۲

"برج مہاتم" ہے۔

(۲) گلشن اسرار[1] (سنہ ۱۱۳۴ھ) مصنفہ نیم نراین۔ اس کا ذکر کتب تاریخ میں آچکا ہے۔

(۳) رسالہ در مدحِ شیوجی
(۴) عینُ الظّہور
} مصنفہ کشن سنگھ نشاط[2]۔ بنارس کی برکات سے بحث کرتی ہے۔

(۵) بھگت مالا[3] (سنہ ۱۱۶۳ھ) مصنفہ لال جی داس

(۶) محیطِ معرفت[4] (سنہ ۱۱۶۷ھ) مصنفہ بستی داس عارف

(۷) پوران ناتھ پرکاش[5] (سنہ ۱۱۹۰ھ) مصنفہ دورآور سنگھ۔ اصل کتاب پنڈت رادھا کنٹھ ترکھا کی لکھی ہوئی ہے اور ہندوؤں کے ستین سے بحث کرتی ہے۔

(۸) رسالہ کرپارام[6] (سنہ ۱۱۹۰ھ) مصنفہ منشی کرپارام کا لیستھ

(۹) چھتر مہاتم[7] (سنہ ۱۲۱۸ھ) مصنفہ کرن سنگھ

(۱۰) کرم کانڈ[8]
(۱۱) پنچاست کاے
} مصنفہ منشی ولا رام

(۱۲) گنگیا مہاتم[9] (سنہ ۱۲۰۶ھ) انند کاہن خوش

علم الحساب

(۱) دستور الحساب (سنہ ۱۱۸۰ھ) مصنفہ اندر من منشی

(۲) زبدۃ القوانین[10] (سنہ ۱۲۱۱ھ) مصنفہ ہرسکھ رائے

---

[1] ریو۔ ج ۳۔ ص ۹۱۷ [2] ریو۔ ج ۲۔ ص ۷۹۵؛ انڈیا آفس عدد ۱۹۵۸؛ ایضاً عدد ۱۹۶۱
[3] ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کرزن کالکشن عدد ۶۹۳ [4] راس براؤن ص ۹۰ [5] ریو ج ۱ ص ۶۳ [6] باڈلین لائبریری عدد ۱۹۵۹ و ۱۹۶۲ [7] باڈلیں عدد ۱۹۶۰ [8] ریو۔ ج ۱ ص ۶۴
[9] ریو۔ ج ۱۔ ص ۶۳ [10] ریو۔ ج ۱۔ ص ۹۹۵

(۳) مجمع الحساب (سنہ ۱۲۰۲ھ) مصنفہ گھاسی رام۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔

(۴) رسالۂ حساب (زمانہ معلوم نہیں) مصنفہ انند رام کالیستھ۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔

ہیئت و نجوم

زیج محمد شاہی (سنہ ۱۱۴۰ھ) مصنفہ راجا جی سنگھ کچھواہہ۔ اس راجا کا اصل نام راجا بجو سنگھ تھا، اورنگ زیب کے زمانے میں بہت سے ذمے داری کے عہدوں پر سرفراز رہا۔ محمد شاہ کے زمانے میں آگرہ کا صوبے دار تھا۔ عام طور پر اسے مرزا راجا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ راجا نے جب محسوس کیا کہ مروجہ تقاویم میں بہت سے نقائص ہیں تو اس نے اس معاملے میں محمد شاہ بادشاہ سے گفتگو کی، بادشاہ نے راجا کے ساتھ اتفاق کیا اور اصلاح و ترمیم کا مشورہ دیا۔ راجا نے بہت سے ہیئت دانوں کو بلایا اور بہت سی الواح (TABLES) تیار کروائیں پھر مینول کے ساتھ بعض قابل ماہرین ہیئت کو یورپ روانہ کیا تاکہ وہاں کی الواح سے مقابلہ کیا جا سکے۔ یہ لوگ جب یورپ سے واپس آئے تو اس کے بعد یہ زیج تیار کی گئی۔ کتاب تین مقالات پر مشتمل ہے اس کے دیباچے کا ترجمہ ڈاکٹر ہنٹر نے کیا ہے اور ایشیاٹک ریسرچز (ج ۵۔ ص ۱۷۷) میں موجود ہے [راجا اور زیج کے لیے دیکھو ٹاڈ راجستان۔ ج ۲، ص ۳۵۶۔ مآثر عالمگیری۔ ص ۳۲۴؛ ریو۔ ج ۲۔ ص ۴۶۰]

لغات

اس عہد میں بعض نہایت مستند اور ضخیم لغات تیار ہوئیں۔ اس زمانے میں

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے مفردات الفاظ کی بجائے محاورات و اصطلاحات کی طرف زیادہ توجہ تھی چنانچہ مرآۃ الاصطلاح، مصطلحاتِ وارستہ اور بہارِ عجم ہر سہ محاورات و مصطلحات پر مشتمل ہیں۔ اس عہد میں یہ پانچ کتابیں لُغت کی لکھی گئی ہیں:۔

(۱) مرآۃ الاصطلاح مُصنفہ انند رام مخلص
(۲) مُصطلحاتِ وارستہ مُصنفہ سیالکوٹی مل وارستہ
(۳) بہارِ عجم مُصنفہ ٹیک چند بہار
(۴) ہفت اختر[۱] (سنہ ۱۱۸۲ھ) مصنفہ کاشی
(۵) آمدن نامہ[۲] (بعد از سنہ ۱۲۱۴ھ) مُصنفہ سکھ رام داس

ان میں نمبر ۱، نمبر ۲، نمبر ۳ بہت اہم ہیں اس لیے ہم ان پر تفصیلی تبصرہ کرتے ہیں اور ان کے سلسلے میں ان مصنفین کے مفصل حالات بھی درج کرتے ہیں چنانچہ سب سے پہلے انند رام مخلص اور اس کی کتاب مرآۃ الاصطلاح کو لیا جاتا ہے۔

انند رام مخلص

حالاتِ زندگی انند رام مخلص دراصل سودھرہ (ضلع سیالکوٹ) کا رہنے والا تھا۔ وہ ذات کا کھتری تھا فارسی وغیرہ میں اُسے اعلیٰ استعداد حاصل تھی۔ بچپن میں گنجفے کا بہت زیادہ شائق تھا[۳]۔ لیکن جب اس کے والد راجا ہردی رام[۴] نے سختی سے فہمایش کی تو اس نے پھر گنجفے وغیرہ کی طرف توجہ نہ کی۔

---

[۱] ریو۔ ج ۳۔ ص ۱۰۱۲ [۲] ریو۔ ج ۳۔ ص ۵۲۱ [۳] چمنستانِ مخلص۔ طبع لکھنؤ۔ ص ۶۲

[۴] ریو (ج ۲۔ ص ۹۹۶ الف) اور اس کے تتبع میں ایتھے (انڈیا آفس۔ عدد ۱۷۰۰) نے بھی غلطی سے مخلص کے باپ کا نام مردی رام لکھا ہے لیکن دیکھو گل رعنا (فہرست بانکی پور۔ ج ۸ ص ۱۳۳ و مرآۃ الاصطلاح ق ۷۵)

وہ محمد شاہ کے زمانے میں وزیر اعتماد الدولہ کا وکیل تھا۔ سیف الدولہ عبدالصمد خاں صوبہ لاہور و ملتان کے وکیل کی حیثیت سے کام کرتا رہا چنانچہ اس کے حُسن کارکردگی کی وجہ سے اس کو رائے رایان کا خطاب ملا[1]۔

شعر و شاعری میں پہلے پہل مرزا بیدل سے اصلاح لی پھر جب خان آرزو ۱۱۳۲ھ میں دارالخلافہ شاہ جہاں آباد میں آئے تو انندرام مخلص سے اتفاقِ مصاحبت ہو گیا پھر مناسبت مزاج کی بنا پر ان میں اتنا کامل اتحاد ہو گیا کہ اس نے خان آرزو کے لیے جاگیر، منصب اور خطاب خانی بادشاہ سے حاصل کیا[2]۔ سراج الدین آرزو اپنے تذکرہ موسوم بہ مجمع النفائس میں لکھتے ہیں کہ" انندرام بے حد خوش خلاق آدمی ہیں تیس سال سے میرا قیام دہلی میں ہے اس کی وجہ صرف مخلص کی عنایات ہیں"۔ رقعات اور دوسری تصنیفات بھی سراج الدین آرزو اور مخلص کے تعلقات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ میر شرف الدین پیام کے ساتھ بھی دوستانہ روابط تھے۔ مرآۃ الاصطلاح، رقعات اور چمنستان سے مخلص کے معاصرین کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ معلوم ہو سکتے ہیں۔ مخلص مدت تک نفث الدم[3] میں مبتلا رہ کر ۱۱۶۴ھ میں چل بسا۔

مخلص کا پایۂ علمی مخلص کا ذکر تقریباً سب تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ مخزن الغرائب بھی جس کے متعلق بجا طور پر یہ شکایت ہو سکتی ہے کہ وہ ہندو شاعروں کا ذکر کم کرتا ہے مخلص کو باقاعدہ اپنے شعرا کی فہرست

---

[1] دیکھو۔ لکھا ہے کہ ۱۱۳۲ھ میں آرزو کی خواہش اور کوشش سے مخلص کو رائے رایان کا خطاب ملا۔ یہ صحیح نہیں بلکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔ دیکھو خزانۂ عامرہ نیز نشتر عشق ج ا۔ ق ۹۴ ۔ تذکرۂ آرزو

مخزن الغرائب میں لکھا ہے کہ مخلص بوجہ فربہی کے خود کام نہ کر سکتا تھا اس لیے اس نے اپنا کام ایک اور شخص کے سپرد کر دیا تھا۔ [2] نشتر عشق (رق پنجاب یونیورسٹی) ج ا، ق ۹۴ [3] تذکرۂ میر ص ۸۹

میں داخل کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مخلص اپنے معاصرین کے لیے شمعِ محفل تھا۔ علم و شعر میں قدرت رکھنے کے علاوہ اہلِ علم کے لیے ملجا و ماوی بھی تھا۔ سیّد غلام علی نسیم امروہوی نے ایک شعر مخلص کے متعلق خوب لکھا ہے ؎

آں سپہرِ سخنوری مخلص فخرِ عرفی و انوری مخلص[1]

آرزو کا قول ہے کہ "مخلص از منتخبانِ روزگار ست، در انشاء و فنِ شعر کتب متعددہ دارد۔ اشعارش نہایت مرغوب[2]"۔ والہ داغستانی کا قول ہے کہ "برابرِ فکر او در ہنود کسی نیست" اور حق یہ ہے کہ نہایت مناسب اور موزوں تعریف کی ہے۔ غلام علی آزاد نے خزانۂ عامرہ[3] میں حکیم حسین شہرت کا قول نقل کیا ہے کہ "دو مخلص اند یکے کاشی، دوم ماشی"

مخلص کی عجائب پسندی مخلص کی طبیعت کی افتاد کچھ ایسی تھی کہ وہ عجائب و غرائب کو بہت زیادہ پسند کرتا تھا۔ لُغت جیسی ٹھوس اور جامد چیز کو وہ نہایت دل چسپ بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں کامیاب ہوتا ہے۔ لطائف، نکات وغیرہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ طبیعت نہایت شگفتہ تھی۔ قہوہ کا استعمال عام کیا کرتا تھا اور بزم کا اتنا شائق تھا کہ دہلی میں شام کے وقت ایک چار یا قہوے کی دُکان پر اپنے احباب سمیت جا بیٹھتا اور خوش وقت ہوتا۔ امیرانہ زندگی بسر کرتا اور اپنے اوقات کو علمی مشاغل میں صرف کرتا تھا۔

مخلص کی فارسی جس ملک کی علمی زبان اجنبی ہو وہاں ایک ایسے شخص کو جس کا مبلغ علم صرف چند کتابوں اور بعض اہلِ زبان کے

---

[1] نشترِ عشق (ق) ج ۲ - ق ۳۲۲ د [2] مجمع النفائس (ق پنجاب یونیورسٹی) ص ۸۳۵

[3] خزانۂ عامرہ ص ۴۲۵

ساتھ گفتگو تک ہی محدود ہو، زباں داں ہونے کا دعویٰ کرنا اور زباں دانوں کے ساتھ مقابلہ کرنا بہت کم ممکن ہوسکتا ہے اور اس حیثیت سے مخلص کا اول ہندستانی ہونا اور پھر ہندو ہونا اس امر کی ایک وجہ ہوسکتی تھی کہ اس کو زبان کے ٹھیٹھ روزمرّہ محاورات میں زباں دانانہ دعویٰ نہ ہوسکتا لیکن مخلص کے حالات معلوم کرنے سے اس امر کا پتا چلتا ہے کہ مخلص ادبی مذاکروں میں اہلِ زبان کے ساتھ حریفانہ اور ہم چشمانہ گفتگو کرسکتا تھا۔

مخلص زبان دانوں کے اشعار پر تنقید بھی کیا کرتا تھا۔ اکثر اوقات خان آرزو کے ساتھ بعض محاورات کی صحت و سقم کے معاملے میں اختلاف ہوجاتا تھا حالانکہ خان آرزو کی بزرگی کو سب تسلیم کرتے تھے۔

زوالِ سلطنتِ مغلیہ کے وقت فارسی زبان میں بھی کافی زوال آچکا تھا۔ انشاپردازی میں مختلف قسم کی بحثیں اور نزاعیں پیدا ہوگئی تھیں۔ چنانچہ انھی میں سے ایک نزاع "استعمالِ الفاظِ ہندی در فارسی" کے متعلق تھی۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ فارسی میں ہندی الفاظ کی آمیزش، فصاحت میں فرق پیدا کردیتی ہے، اور دوسری جماعت کا یہ خیال تھا کہ جب ترکی، تورانی وغیرہ زبانوں کی آمیزش اس رنگ کو بدمزہ نہیں کرسکتی تو ہندی جو بہت حد تک فارسی سے متحد الاصل ہے کس طرح اس الزام کا شکار ہوسکتی ہے۔ اس گروہ کے امام سراج المحققین خان آرزو تھے۔ مخلص اس بارے میں خان آرزو کا پیرو تھا۔ مرآۃ الاصطلاح میں ایک مقام پہ لکھا ہے کہ "اعتقادِ بعض عزیزان است کہ الفاظِ ہندی در اشعارِ فارسی آوردن درست نیست الا لاشعلّم ایں چیزہا برائے خانان و مبتدیان مضائقہ دارد، اہلِ قدرت و استعداد مختار اند"۔ بعینہٖ اسی طرح کا خیال چمنستان[1] میں ظاہر کیا ہے کہ فارسی میں ہندی الفاظ

---

[1] چمنستان ص ۵۷

کا استعمال قادر الکلام لوگوں کے لیے جائز ہے۔

مخلص کا اندازِ تحریر مخلص کی نثر کی خصوصیات کے متعلق ہم پہلے بھی لکھ آئے ہیں۔ اس نے فارسی میں ایک نیا انداز نکالا ہے نشترِ عشق[1] میں لکھا ہے " درفارسی روشِ مخصوص بدست آوردہ"۔ مخلص کے طرزِ انشا میں زیادہ تکلف نہیں لیکن وہ مشکل نویسی کے الزام سے بالکل بری نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بعض اوقات عبارت میں وہی رنگ نمایاں ہو جاتا ہے جو اس زمانے کے اکثر مشکل پسند انشا پردازوں کی خصوصیت تھی اور درحقیقت اس زمانے میں ہر شخص کا منتہائے نظر یہی تھا۔

کسی واقعے یا منظر کا صحیح نقشہ کھینچنے میں مخلص کمال کر دکھاتا تھا۔ کلام میں متانت اور روانی تھی، اس کو زبان پر کافی قدرت حاصل تھی، وہ انشا میں بلا تکلف اہلِ زبان کے محاورات استعمال کرتا ہے۔ نثر کے کچھ فقروں کے بعد شعر لاتا ہے اور برمحل لاتا ہے، وہ عبارتوں میں ہندی الفاظ کو بھی کبھی کبھی استعمال کرتا ہے۔ چمنستان کی نثر سادہ اور شگفتہ معلوم ہوتی ہے۔ چمنستان اور رقعات کے علاوہ مخلص کی انشائے نثر کا جو نمونہ ہمیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اس کی بنا پر یہ امر بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ مخلص فارسی کے بلند پایہ ادیبوں میں سے تھا اور ادبیاتِ فارسی کی کوئی تاریخ اس کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔

مخلص کی شاعری اب ہمیں مخلص کی شاعری کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے پاس اس کا دیوان موجود نہیں لیکن مجمع النفائس[2] میں اس کے کلام کا نمونہ درج ہے۔ رقعات میں بھی اس کی کچھ غزلیں، ایک دو

---

[1] نشترِ عشق (قلمی پنجاب یونیورسٹی) ج ۲، ص ۵۳۲ ب [2] مجمع النفائس (قلمی پنجاب یونیورسٹی)، ق ص ۴۳۵ ا

قطعے ایک آدھ مختصر مثنوی ہی۔ خزانۂ عامرہ اور مخزن الغرائب میں بھی اس کے کلام کا نمونہ موجود ہی۔ نشترِ عشق میں بہت سے اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہی کہ ہم مخلص کے کلام پر اس وقت تک مجموعی حیثیت سے کوئی جامع تبصرہ نہیں کرسکتے جب تک کہ پورا کلام پیشِ نظر نہ ہو۔

طرزِ خیال مخلص نے مرزا بیدل سے اصلاح لی ہی مگر اس کا کلام سادگی اور روانی سے متصف ہی۔ متاخرین میں "طرزِ خیال" کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہی اس کا اثر ہمارے شاعر پر پورے طور پر نہیں پڑا، ورنہ اس زمانے میں علوِ فکر اس امر کے مرادف تھا کہ شعر میں وہ دقیق خیال پیدا کیا جائے کہ اس کا سمجھنا عام افہام و اذہان سے باہر ہو "نظم را بحدِ اعتدال رسانیدہ"[1] نشترِ عشق کا مقولہ ہی اور یہ واقعہ ہی کہ اس کا کلام سلاست کی طرف مائل ہی۔ غلام علی آزاد[2] لکھتے ہیں کہ "سخن اندرام قشقۂ قبول بر جبیں دارد" اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہی کہ مخلص کے کلام میں تمثیل زیادہ ہی اور اس چیز سے اس کے کلام میں ایک شوخی پیدا ہوگئی ہی آرزو[3] کہتے ہیں کہ "اشعارش نہایت مرغوب" دیوان کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری[4] میں محفوظ ہی لیکن اس کے علاوہ کہیں پتا نہیں چلتا۔ گلِ رعنا میں ہی کہ مخلص کا دیوان دس ہزار ابیات پر مشتمل[5] ہی۔ انڈیا آفس لائبریری میں جو نسخہ ہی اس میں رباعیات بھی ہیں۔ اُس نسخے کی ایک خصوصیت یہ ہی کہ وہ مصنف کی زندگی میں لکھا گیا تھا اس لیے کہ اس کی تاریخ کتابت ۱۰ ربیع الثانی ۱۱۵۸ھ ہی۔ غلام علی آزاد نے بھی مخلص کا دیوان اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا اور کلام کا جو نمونہ پیش کیا ہی وہ مجمع النفائس سے نقل کیا ہی۔ ہم اب مخلص کے کلام کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

---

[1] نشترِ عشق [2] ایضاً ۔ خزانۂ عامرہ ص ۴۲۵ [3] مجمع النفائس [4] ایضاً [4] انڈیا آفس لائبریری کیٹیلاگ، عدد ۱۷۰۰ [5] دیکھو فہرست بانکی پور ۲۱۸ ۱۳ نشترِ عشق میں بھی یہی تعداد ابیات کی دی ہی۔

ے میازار ای محبت باز چوں من ناتوانے را — غریبے دردمندے بیکسے آزردہ جانے را

زحالِ بلبلِ مسکیں ندارم اطلاع امّا — بپائے گلبنے دیدیم مشتِ استخوانے را

ے بردسودائے سرِ زلفت تو از خویش مرا — سفرِ دُور و دراز آمدہ در پیش مرا

ے حُسن در قید تماشائے تو افگند مرا — کرد در خانۂ آئینہ نظر بند مرا

ے گزشتی از نظر و بے تو زندہ ایم ہنوز — زشرم آب نگشتیم، خاک بر سرِ ما

ے ای بلبلاں اگر دہ سفر جانبِ قفس — تنہا گزاشتید دریں گلستاں مرا

با بلبلاں شریکِ فغاں مے شدم ولے — نگزاشت فصلِ گُل بچمن باغباں مرا

ے قصّۂ کوہ کن بود گویا — بوئے خوں آید از فسانۂ ما

ے از خطت شور در جہاں افتاد — بندہ پرور ہنوز آغاز ست

ے ماجرائے بلبل و گُل شاہدِ احوالِ ماست — از تو مخلص نالہ و از یار تشنیدن بس ست

ے ماندیدیم بچشمِ خود آہ — گریہ گو بید اثر داشتہ است

ے گرفتم ارتکابِ مے گناہ است — بہار از جانبِ ما عذر خواہ است

ے توبہ شوم است فصلِ گُل، گفتم — بعد ازیں اختیار یاراں ست

ے نبود قابلِ صحبت مخلص — بگزارید کہ سودا دارد

ے از قدش بر من قیامت در جہاں — گر نشد امروز، فردا مے شود

ے سیہ مستانہ اشکِ من بکوئے یار مے گردد — چو آں آبے کہ وقتِ شام در گلزار مے گردد

ے خوش نشینانِ چمن بارِ سفر مے بندند — عندلیباں ہمہ یکجا شدہ فریاد کنند

ے گر مناسب نبود آمدنم در کوئیت — بندہ پرور! سرِ بازار سلامت باشد

ے چوں منجّم دید طالع نامرا مِ خندید و گفت — ایں پسر قائم مقامِ حضرتِ مجنوں شود

ے بلبلِ شوریدہ چوں من ندارد ایں چمن — بعد بہار آخر شد و من ہمچناں دیوانہ ام

ے ازاں ہر لحظہ در بر میکشم سروِ گلستاں را — کہ ایں رعنا جواں بسیار مے ماند بیارِ من

۵ عکس چشم خوشست درآئینہ است یا شنامے کند در آب آہو
۵ حقوق صحبت گل بر تو بسیارست ای بلبل مبادا از چمن غافل در ایام خزاں باشی

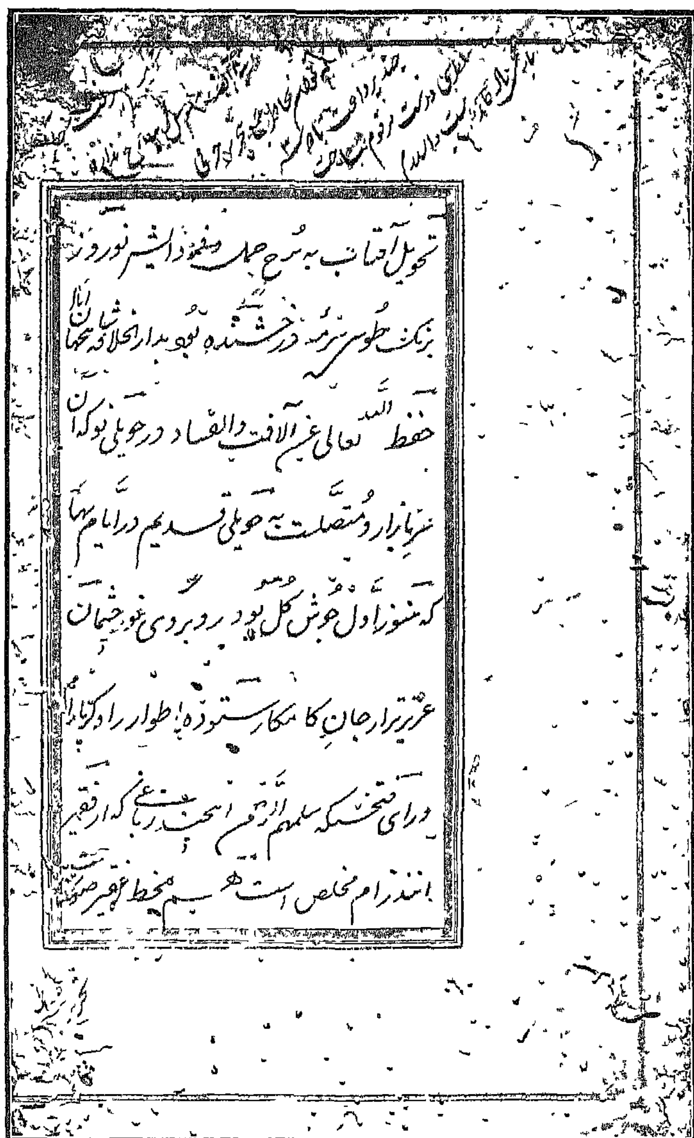
اُستاد محترم پروفیسر شیرانی صاحب کے کُتب خانے میں مخلص کی رُباعیات محفوظ ہیں۔ یہ نسخہ شاید خود مُصنّف کے قلم سے لکھا گیا ہو۔ اس کے ایک صفحے کا عکس موجود کتاب میں شامل ہے۔

مخلص کی تصنیفات آرزو لکھتے ہیں کہ "در انشاء و فنِ شعر کتب متعددہ دارد" افسوس کہ آرزو نے "کتب متعددہ" کی تفصیل نہیں لکھی۔ ہمیں اپنی کوشش سے صرف ذیل کی کتابوں کا پتا چل سکا ہے:-

۱۔ مرآۃ الاصطلاح
۲۔ چمنستان
۳۔ رُقعات
۴۔ ہنگامۂ عشق
۵۔ کارنامۂ عشق
۶۔ تذکرہ
۷۔ پری خانہ۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ایک کتاب "مرقعِ تصویر" ہے ہمارا خیال ہے کہ پری خانہ اور مرقعِ تصویر ایک ہی چیز کے دو حصّے ہیں۔
۸۔ دیوان نظم

ان میں سے بعض تصنیفات کا ذکر پہلے آچکا ہے یہاں ہم صرف مرآۃ الاصطلاح کو لیتے ہیں جو بلحاظِ قدر و قیمت مخلص کی تصنیفات میں سب سے اہم ہے۔

مرآۃ الاصطلاح مغلوں کے آخری عہدِ حکومت میں صحیح اور مستند فارسی کا معیار تلاش کرنا پڑتا تھا، خود ہندستان کے مسلمان بھی صحیح فارسی کے



رباعیات مخلص کے ایک خود نوشتہ نسخے کا ایک ورق
(پنجاب یونیورسٹی شیرانی کلکشن)

لیے سند نہ سمجھے جاتے تھے، اس لیے کہ فارسی کا اصلی ماہر صحیح معنوں میں ایک ایرانی ہی ہو سکتا ہے نہ کہ ہر مسلمان۔ اس عہد میں صحیح فارسی کا معیار قائم کرنے کی مزید ضرورت اس لیے بھی تھی کہ شاہی دفاتر کے ملازمین کی زبان صاف نہ تھی اور اسی ناصاف اور غیر شستہ زبان کا رواج مُصنّفین تک بھی جا پہنچا تھا۔ اس ضرورت کی بنا پر اس عہد میں بے شمار لُغت نویس پیدا ہوئے جن میں خان آرزو، ہمارا مُصنّف، وارستہ اور ٹیک چند بہار قابلِ ذکر ہیں۔

ان لغات کی ایک بڑی ضرورت یہ تھی کہ عام لوگ صرف کتابی فارسی سے آشنا ہوتے تھے اور ان روزمرہ و محاورات سے جو نئے لوگوں میں ایران کے اندر رائج ہوتے تھے محض ناواقف ہوتے تھے۔ چنانچہ قتیلؔ نے اپنی تصنیفات میں اس کا بارہا ذکر کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اگر ہندستانیوں میں سے کسی کو ایرانیوں کے ساتھ گفتگو کا موقعہ ہوتا تو افہام و تفہیم سے بھی قاصر رہتا۔ اِس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کئی ایسی لُغات لکھی گئیں جن میں صرف ان الفاظ کا اندراج ہوا جن سے ہندستانی فارسی داں ناآشنا ہوتے۔ اس کام کی تکمیل کے لیے لغت نویسوں کو زباں دانوں کی کتابوں اور ان کی گفتگو سے استناد کرنا پڑتا چنانچہ مصنّف نے خود دیباچے میں بیان کیا ہے[۱]۔

"برخلاف فرہنگ نویساں کہ بتحریر لغات قدیم مصروف بودہ بتحقیق مصطلحات فارسی گویان تازہ توجہے نمودہ آید...... واز خدمت زباں دان معتبر بپایۂ تحقیق رسید"

تاریخِ تصنیف | تصنیف کی تاریخ خود مصنّف نے دیباچے میں لکھی ہے جو کہ "تحقیق اصطلاحات" کے اعداد کے برابر ہے یعنی ۱۱۵۸ھ ہجری

---

[۱] مرآۃ الاصطلاح (قلمی مملوکہ یونیورسٹی لائبریری لاہور) ورق ۱

بانکی پور لائبریری کا فہرست نگار لکھتا ہی[1] کہ "کتاب کے آخر میں ۱۱۵۸ھ ہجری کی بجائے ۱۱۵۷ھ ہجری مرقوم ہی۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے نسخے میں ایسی کوئی عبارت نہیں ملی۔ کتاب میں جابجا واقعات کو سنوں کے ساتھ مقید کیا گیا ہی چنانچہ ۱۱۵۸ھ کا ذکر بھی کتاب میں موجود ہی۔[2] مثلاً ورق ۹۹ بذیل خلعت۔

کتاب کے مآخذ مصنف نے دیباچے میں اپنے مآخذ کا ذکر نہیں کیا صرف اتنا کہا ہی "واز خدمت زبان دانان معتبہ بپایۂ تحقیق رسید" مصنف نے شدت کے ساتھ اس امر کی پابندی کی ہی کہ اپنے زمانے کے تازہ گو لوگوں کے اشعار اور عبارات کو بطور سند پیش کرے۔ سراج الدین آرزو، سعید اشرف، فصاحت علی خاں راضی، شرف الدین پیام، علی حزیں، صائب، رضی دانش، مرزا نجات وغیرہ کے اشعار عام طور پر ملتے ہیں اور حقیقت یہ ہی کہ یہ طریقہ مصنف نے نہایت دقت نظر کے ساتھ اختیار کیا ہی اور کتاب کی غرض اصلی اسی امر کی متقاضی تھی۔ مخلص خود ایک مقام پر لکھتا ہی کہ بعض لوگوں کو اس طرز عمل پر اعتراض ہی "صاحبان این فن بر راقم حروف خورده گیرند که این چه قسم اسناد است که گاه از ظفر خان بنویسد و گاه از عنایت خان" پھر اس کا جواب یوں دیا ہی "معلوم باد که یکے اینہا اہل ایرانند و زبان داں ہستند، دوم آں کسان اند که مثل مرزا صائب و طالب کلیم و قدسی و سلیم رفیق شاں بودند۔"[3]

مخلص نے اپنے مسلمات کی بنا اہل زباں دانوں کے اشعار پر رکھی ہی

---

[1] فہرست بانکی پور ج ۹۔ ص ۳۱۔ عدد ۸۱۰ [2] زر اکبر بر سپر فولاد نہی توام شو (کی شرح پر) مخلص نے ایک قصّہ دیا ہی جس کا آغاز یوں ہی "حالا کہ سال ۱۱۵۷ است" اور "طرح پنستان" میں اسی واقعہ پر ۱۱۵۸ لکھا ہی۔ بذیل چوب دست نا بھی ہی "درین روزہا کہ سال ہجری ۱۱۵۷ است"

[3] مرآۃ الاصطلاح۔ ورق ۳۴۱ ب (بذیل سرپوشی)

یا ان کی کتابوں پر یا ان کی گفتگو پر، چراغِ ہدایت، امثال مرزا محمد فروتنی، سراج اللغہ حجت ساطع ملا ساطع، تحفۂ سامی، تذکرہ طاہر نصرآبادی، فرہنگ جہانگیری، واقعاتِ بابری وغیرہ کا ذکر کتاب میں آیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخلص نے زیادہ تر سراج اللغہ، حجت ساطع اور امثال مرزا محمد فروتنی کی طرف توجہ کی ہے۔

ترتیب لغات کو حروفِ تہجی کی بنا پر مرتب کیا ہے۔ صرف محاورات اور استعارات وغیرہ کا اندراج کیا گیا ہے۔ ہر ردیف کے آخر میں مثالوں کو پیش کیا گیا ہے جن میں سے بعض مصرعوں اور شعروں کی صورت میں ہیں جن کو "امثال موزوں" کہا گیا ہے اور کچھ نثر میں ہیں ان کو "امثال غیر موزوں" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ بعض اوقات الفاظ کے ضمن میں بعض اور چیزوں کا ذکر آجاتا ہے جن کا بظاہر اس ردیف سے کوئی تعلق نہیں ہوتا مثلاً نیشکر ایک لفظ ہے اس کے ضمن میں خوش نویسی کا ذکر آگیا ہے اور ساتھ ہی ہدایت اللہ خوش نویس کا تذکرہ ہے۔ بعض اوقات الفاظ کی تشریح کے طور پر کہانیوں اور لطیفوں کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جن میں گاہے گاہے اپنے تجربات پیش کیے ہیں۔ غرض کتاب کی ترتیب و تدوین میں یہ انوکھی طرز ملحوظ رکھی گئی ہے جو اس کو دوسری لغات سے ممتاز کرتی ہے۔

مرآۃ الاصطلاح کی خصوصیات اگرچہ یہ بہار کی طرح تفصیلی لغت نہیں اور صرف بعض اصطلاحات تک ہی محدود ہے، تاہم اس کی دل چسپ طرز ترتیب اس کے لیے باعثِ امتیاز ہے۔ مرآۃ جہاں ایک لغت کی کتاب ہے وہاں ایک بیاض بھی ہے جو ہر مذاق کے آدمی کے لیے جاذبِ توجہ ہے۔ مصنف کے ذاتی حالات بھی اس کتاب سے بکثرت مل سکتے ہیں۔ سراج الدین آرزو کے ساتھ اس کے تعلقات کا حال اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے اور اس کے علاوہ اکثر حقائق اس سے منکشف ہوتے ہیں جن سے مخلص کے واقعاتِ زندگی کی

ترتیب میں فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

۴۔ یہ کتاب اس کمی کو کسی حد تک پورا کرتی ہے جو ہماری سیاسی تاریخوں میں موجود ہے۔ معاشرتی حالات کا ملنا اس قدر دشوار ہے کہ ان کے متعلق معمولی واقعات کا معلوم کر لینا بھی غنیمت ہے۔ انتظاماتِ سلطنت، ہندستانیوں کے رسوم اور دیگر مشاغل کا حال ہمیں دوسری تاریخوں سے بہت کم ملتا ہے اور اسی کمی کو مرآۃ الاصطلاح کسی حد تک پورا کرتی ہے۔ ہم ذیل میں مثال کے طور پر بعض چیزوں کو پیش کرتے ہیں تاکہ اس سے ہمارے مقصد کی تشریح ہو جائے۔

۱۔ ضوابط۔ یعنی تمام وہ رواج جو حکومت کا دستور العمل تھے، ان کے متعلق کتاب میں جا بجا منتشر طور پر ذکر آیا ہے۔ منصب کی تفصیل (ق[1] ۱۵ ذیل منصب) جاگیر کی اقسام مثلاً خالصہ شریفہ، صرف خاص، جاگیر تنبول، برگ بہا اور ان میں فرق (ق ۱۴: اقطاع) احوال دستور اعظم (ق ۱۷: احوال دستور اعظم) احوال تنخواہ (ق ۱۶: احوال تنخواہ) وزیر کے تقرر کا قانون، عالمگیر کے عہد سے وزیر کے تقرر کے لیے کوئی ضابطہ نہ تھا (ق ۱۷: احوال دستور اعظم) دیوان تن کا ذکر اور اس کے منصب کی تشریح۔ القاب وخطابات کا تفصیلی حال۔ وکیل مطلق کے خطابات (ق ۱۷: احوال القاب) سلطنت مغلیہ کے بعض اُمرا کا حال (ق ۱۸: القاب نواب آصف جاہ) تنخواہ کا چک جس کو "برات" کہتے تھے (ق ۳۶: برات) ہندستان میں سرکاری خط و کتابت کے متعلق مختلف ضوابط (ق ۲۷: تعلیق) ہندستان میں دفترِ تنخواہ کو دفترِ تن کہتے ہیں۔ تنخواہ کے متعلق بعض قوانین و ضوابط (ق ۶۵: تنخواہ) درباروں میں لباس کی تخصیص (ق ۸۱: چارقب) داروغہ۔ خان، صدر کا

[1] علامت ق سے مراد ورق ہے۔

مفہوم، خان ساماں میر ساماں کا منصب رق ۹۳ : خان ساماں) بادشاہوں کی طرف سے اُمراکو جو "بالا پوش" یعنی خلعت ملتی ہے رق ۹۹ : خلعت) زنجیرِ عدالت کا حال رق ۱۲۲ : زنجیرِ عدالت) کوائف کے متعلق ضابطہ رق ۱۴۴ : سرنشین قافلہ) میر توزک اول، میر توزک دوم کا بیان (رق ۱۵۵ : صحبت یساول) طغرا یعنی فرمان نویسی کے مختلف طریقے رق ۱۶۱ : طغرا) شاہی خیمے وغیرہ کے متعلق بیان (رق ۱۶۲ : طناب قورق) درخواست یا عرضداشت کا ضابطہ رق ۱۶۵ : عرضداشت) فرمان بالمشافہہ (رق ۱۷۰ فرمان بالمشافہہ) لباس کی تخصیص شاہی درباروں میں رق ۱۷۰ : قرقاول) میر شکار کا عہدہ (رق ۱۷۰ : قرقاول) غرض اس طرح کے حالات منتشر صورت میں ملتے ہیں جو مغلیہ سلطنت کے عہدِ آخر کے درباری نظم و نسق پر خاطر خواہ روشنی ڈالتے ہیں۔

ب ۔ رسوم کا تذکرہ، مثلاً "بیڑہ و پان" کے زیرِ عنوان شادی کی رسوم پر تبصرہ (رق ۴۴) "بیضۂ الوان" کے زیرِ عنوان، جشن نوروز کا حال (رق ۴۴)۔ سویمبر کا حال رق ۶۱ : ترنج طلا) ہندستان میں یہ رسم ہے کہ جس دروازے سے آتے ہیں اس سے واپس نہیں جاتے۔ یہ بادشاہوں کا طریقہ ہے رق ۶۲ : تغیرِ دادن راہ) سالگرہ کی رسم (رق ۱۲۷ : سالگرہ) باممارگیوں کی رسوم رق ۱۴۵ : شربِ الیہود) "سنی" کا ذکر رق ۱۲۹ : سنی) وغیرہ۔

ج ۔ مفید معلومات :۔ شیشے کے آلات پٹنے میں نہایت عمدہ بنتے ہیں رق ۲۹ : بادۂ شیراز) نیشکر کا حال، قلم نیشکر اور خوش نویسی پر تبصرہ (رق ۳۸ : بستۂ نیشکر) تختِ طاؤس کا مفصل حال رق ۵۰ تا ۶۰ : تختِ طاؤس) قلم فرنگی یعنی پنسل پر دلچسپ تبصرہ (رق ۶۸ : توتیا قلم) جمعہ بازار کی کیفیت رق ۷۷ : جمعہ بازار) خطِ شکستہ کا حال رق ۸۹ : زربفت) زربفت احمدآباد

میں نہایت عمدہ تیار ہوتا تھا (ق ۱۲۰: زربفت) نمک کی کانیں ہندستان میں (ق ۱۳۷: سنگ نمک) گھٹنا بہری کا شکار۔ نہایت عمدہ حال (ق ۱۴۷: شکار قمرغہ) فنِ تصویرکشی (ق ۱۵۷، ۱۵۸: صورت جادو) عطرِ گلاب پشاور میں بکثرت ہوتا تھا (ق ۱۶۵: عطرِ گلاب) قہوہ کا دلچسپ بیان (ق ۱۷۴، ۱۷۵: قہوہ) پھولوں کی مختلف اقسام جو اُس وقت ہندستان میں موجود تھے (ق ۱۹۷، ۱۹۸: لالۂ عباسی) فنِ میناکاری (ق ۲۰۵: میناکار) اس زمانے کے لباس کا مختصر سا حال (ق ۲۱۹: بیاز پیراہن)

۴۔ چوتھی خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ اس میں معاصرین کا حال بھی ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ حالات اتنے زیادہ تفصیلی نہیں جتنے کہ دوسرے تذکروں میں ملتے ہیں۔ مگر ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ ایک لغت کی کتاب اس قدر تفصیل کی متحمل بھی نہیں ہوسکتی اور جو سرسری حالات مرآة میں ملتے ہیں وہ بوجہ عینی ہونے کے نہایت ہی مستند اور معتبر سمجھے جانے کے قابل ہیں۔ ذیل کے حالات اس کتاب سے ملتے ہیں:۔

ذکر بعض اُمرائے سلطنت بضمنِ مقدمہ (ق ۸: القاب نواب آصف جاہ) قزلباش خاں اُمید کا حال (ق ۱۹: اُمید) راجا دیا رام عم مصنّف (ق ۲۰: انگشتر زنہار) زاہد علی خاں سخا (ق ۳۱ ب: بپائے خود گرفتن) ہدایت اللہ خوش نویس کا حال (ق ۳۸: بستہ نیشکر) راجا ہردے رام والد مصنف کا تھوڑا سا حال (ق ۵۶: تحت الحنک) مرزا صائب کا مختصر حال (ق ۶۹: تہ کردن) راجا ہری سنگھ تیرانداز (ق ۷۱: تیر) محمد احسن ساتع (ق ۷۹: جنون دوری) شکستہ نویسوں کا حال (ق ۹۰: خط شکستہ) رائے زادہ ہرکرن (ق ۱۰۸: دشت لالہ) راجا جے سنگھ کا حال (ق ۱۲۰: زربفت؛ جہاں آرا بیگم (ق ۱۲۱: زرگل) ارادت خاں (ق ۱۲۲: زلو) معز خاں آتش (ق ۱۲۴: زیر و زبر)

ہاشم خاں مخزوں (ق ۱۳۲: سرخ شدن) محمد علی حزیں (ق ۱۴۰: شکار جرگہ) مرزا عبدالغنی بیگ قبول و پسرش گرامی (ق ۱۵۱، ۱۵۲: شیر حاجی) میر شرف الدین پیام حشمت (ق ۱۵۶، ۱۵۷: صندل رنگ) دو مصوروں کا حال جن کے نام گوردھن و چرن داس تھے (ق ۱۵۸: صورت نویسی) نعمت اللہ خاں مرحوم (ق ۱۶۳: طومار و اصلات) محمد خاں دیوانہ! فیوئی (ق ۱۹۰: کوکنار) اس فہرست میں اکثر لوگ مخلص کے معاصر ہیں۔

(۵) اس کی ترتیب انوکھی ہی جس کا تھوڑا سا حال پہلے آچکا ہی۔

بہار عجم نے مخلص کی لغت سے کافی فائدہ اٹھایا ہی۔ اکثر الفاظ بہار عجم نے بالکل حرف بہ حرف نقل کر لیے ہیں مثلاً چجز رسعد وغیرہ۔ بعض اوقات بہار مخلص کی عبارت نقل کرتا ہی اور اپنی طرف سے بھی معلومات کا اضافہ کرتا ہی البتہ مخلص کے بعض الفاظ کو حذف کر دیتا ہی۔

بہار عجم کی آخری ایڈیشن میں (سنہ ۱۹۱۶ء نولکشور دیباچہ صفحہ ۳ پر) مآخذ میں انند رام مخلص کی بجائے مخلص کاشی کا ذکر آتا ہی حالانکہ یہ صحیح نہیں مخلص کاشی کا کوئی رسالہ لغت میں ہم تک نہیں آیا اور نہ مخلص اتنا متاخر ہی ہی کہ بہار نے اس کو اپنے آخری ایڈیشن میں استعمال کیا ہو لیکن ابتدائی نسخوں میں اس کا ذکر تک بھی نہ کیا ہو۔ اس کی تردید اس بات سے بھی ہوتی ہی کہ بانکی پور لائبریری میں اندر من کا جو خلاصہ بہار عجم موجود ہی اس میں صاف طور پر "انند رام مخلص" مرقوم ہی۔ نیز خود صاحب بہار عجم کتاب کی اثنا میں انند رام کے فرہنگ کا ذکر کرتا ہی پس ان حالات میں محولہ بالا عبارت طباعت کی غلطی سے زیادہ کیا حیثیت رکھتی ہی۔

وارستہ اس کتاب کا ذکر نہیں کرتا اور کوئی تعجب نہیں کہ وارستہ نے

دیدہ و دانستہ اس کے ذکر سے اعراض کیا ہو۔ ان لغات کی تقابلی حیثیت پر ہم بہار کے ذکر میں روشنی ڈالیں گے۔

سیالکوٹی مل وآرستہ

مُصطلحاتِ وارستہ

حالاتِ زندگی وارستہ، سیالکوٹی مل، سیالکوٹ کا رہنے والا تھا[1]۔ بعض مصنف اُسے لاہوری بھی کہتے ہیں[2]۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ اس کا مقام پیدائش لاہور تھا[3]۔ وارستہ کا نام ہی اس کے مقام پیدائش پر دلالت کرتا ہے۔ ہندوؤں میں سیالکوٹی مل، پشاوری مل، امرتسری لال وغیرہ ناموں کا رواج عام ہے لہٰذا اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ سیالکوٹی مل کا یہ نام اس کے سیالکوٹ میں پیدا ہونے کی وجہ سے رکھا گیا ہوگا۔

وارستہ کے تعلیمی، خاندانی اور دیگر حالات پر تاریکی کا ایک پردہ چھایا ہوا ہے۔ وارستہ کی تصنیفات[4] سے اس امر کا پتا چلتا ہے کہ میر محمد علی رائج سیالکوٹی اس کے اُستاد تھے۔ میر محمد علی ۱۱۵۰ھ میں فوت ہوئے اور بقول سرخوش اپنے وقت کے اچھے شاعروں میں سے تھے۔ ان کے حالات خزانۂ عامرہ اور تذکرۂ سرخوش اور نشترِ عشق میں مل سکتے ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وارستہ نے میر محمد علی سے کس شعبۂ علم میں استفادہ کیا، شاید شعر و شاعری کا ذوق ان سے پایا ہو اس لیے کہ باقی اصناف علم میں ان کو کوئی خاص شہرت حاصل نہ تھی۔

---

[1] گل رعنا (بانکی پور لائبریری فہرست۔ ج ۸۔ ص ۱۳۳) [2] موید برہان۔ ص ۹

[3] بلوخمن کنٹری بیوشنز ص ۳۰۔ [4] مثلاً مصطلحات و مطلع السعدین

عمر کا آخری حصّہ وارستہ نے ڈیرہ غازی خاں میں بسر کیا اور اسی مقام پر ۱۱۸۰ھ میں چل بسا۔[1]

سیاحتِ ایران رسالہ معارف[2] میں ایک مضمون کے سلسلے میں وارستہ کے متعلق یہ درج ہے کہ وہ تیس سال تک ایران میں رہا جہاں وہ اربابِ علم وفضل کی صحبت سے علمی فائدہ اُٹھاتا رہا۔ اسی طرح بلوخمن صاحب نے کنٹر بیوشنز میں وارستہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے ایران کی سیاحت کی اور وہاں عرصہ دراز تک قیام پذیر رہ کر محاورات کی تحقیق میں مصروف رہا۔ ہم اس بارے میں کوئی حتمی رائے پیش نہیں کر سکتے۔ سید سلیمان صاحب نے اپنے بیان کا مآخذ نہیں بتایا۔ اسی طرح بلوخمن صاحب نے بھی کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔ "مصطلحات الشعراءِ وارستہ" کے دیباچے کے ان الفاظ سے شبہہ پیدا ہوسکتا ہے:

"ناچار رجوع بزبان دانانِ ایراں دیار نمودم و پنجدہ سال دریں تلاش بسر بُردم"

لیکن ہمارے خیال میں ان الفاظ سے وارستہ کی سیاحتِ ایران پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ کون نہیں جانتا کہ ہندستان میں رہ کر بھی محاورہ دانانِ ایران سے بعض محاورات کے بارے میں استصواب کیا جا سکتا تھا اس لیے کہ اس وقت یہاں ایرانیوں کی بہت بڑی تعداد مقیم تھی۔ غرض یہ کہ ہماری رائے میں وارستہ کے ایران جانے کا بیان معتبر نہیں کم از کم ہماری نظر سے کوئی معتبر حوالہ نہیں گزرا۔

حالات کی کمی کی وجہ تعجب کا مقام ہے کہ وارستہ کے حالاتِ زندگی بہت کم ملتے ہیں۔ صرف "گلِ رعنا" میں مختصر سا تذکرہ ہے۔ باقی تذکرے اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وارستہ

---

[1] گل رعنا ایضاً [2] معارف ۱۹۱۸۔ اکتوبر۔ ص ۱۸۱ و بلوخمن کنٹر بیوشنز

شاعری میں بلند پایہ نہ رکھتا تھا چنانچہ اس کے کلام کا کوئی نمونہ ہمارے پاس موجود نہیں۔ اس کی سب سے بڑی فضیلت اس کی انشا پردازی اور محاورہ دانی ہے۔ اکثر تذکرے چونکہ شعرا کے حالات پر مشتمل ہیں اس لیے ان میں وارستہ کا ذکر نہ آنا بالکل قدرتی امر معلوم ہوتا ہے۔ وارستہ کے مشہور نہ ہوسکنے کی وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ وارستہ نے اپنی عمر پنجاب ہی میں بسر کی ہے اور مراکز علمی مثلاً دہلی و لکھنؤ میں اُسے آنے کا کم اتفاق ہوا ہے اس لیے تذکرہ نویسوں کی نگاہ سے اوجھل ہی رہا۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ جب تذکروں میں معمولی معمولی لوگوں کے حالات مل سکتے ہوں تو وارستہ جیسا محقق اور انشا پرداز اس طرح پردۂ گمنامی میں رہتا۔ اُسے جس قدر بھی شہرت حاصل ہوئی وہ مصطلحات کی بنا پر ہے۔

حزیں کی پیروی شیخ محمد علی حزیںؔ جب ہندستان میں وارد ہوئے تو کچھ سفر کی تکالیف اور کچھ اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر ہندستان کی ہجو میں مصروف ہو گئے۔ یہاں کے شعرا کی مذمت کی، اور بقول واغستانی[1] باوجود منت سماجت و فہمایش کے بھی اس مشغلے کو نہ چھوڑا۔ ان کی اس حرکت سے ہندستان کے اہلِ علم و فضل میں اُن کے خلاف غیظ و غضب کا ایک طوفان بپا ہو گیا۔ شیخ محمد علی حزیںؔ نے محمد افضل ثابتؔ کے کلام پر بھی مخالفانہ نکتہ چینی کی تھی اس پر ثابتؔ کے بیٹے ثباتؔ نے برافروختہ ہو کر حزیںؔ کی شاعری پر صدہا اعتراض کیے۔ خان آرزوؔ نے بھی حزیںؔ کے دیوان میں سے سقیم اشعار نکال کر ان پر سختی کے ساتھ جرح کی ہے۔ حزیںؔ چونکہ علم و فضل کے علاوہ زہد و تقویٰ میں بھی لاثانی تھے اس لیے خود ہندستان میں اُن کے بہت سے عقیدت مند پیدا ہو گئے تھے چنانچہ وارستہ بھی کسی حد تک ان کی سلک ارادت میں منسلک تھا۔ اُس نے

---

[1] ریاض الشعرا (قلمی نسخہ یونیورسٹی لائبریری) ورق ۶۵

خان آرزو کی کتاب تنبیہ الغافلین کے مقابلے میں "رجم الشیاطین" نام ایک رسالہ لکھا جس میں خان آرزو کے اعتراضات کی تردید کی ہے۔ اس بات سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وارستہ کے نزدیک ایرانی شعرا زیادہ قابلِ سند تھے۔ بہ نسبت ہندستانیوں کے خواہ وہ خان آرزو کا منصب ہی کیوں نہ رکھتے ہوں۔ "ایرانیت پسندی" کے جوش میں وارستہ مصطلحات میں خان آرزو اور دوسرے ہندستانی شعرا کے اشعار بطورِ سند پیش کرنے میں احتیاط سے کام لیتا ہے۔ تاہم اپنی دوسری کتاب مطلع السعدین میں کہیں کہیں "سراج المحققین" کے قول کو تسلیم کرتا ہے اور "مثمر" کا ذکر بھی کرتا ہے۔ (دیکھو مطلع السعدین ص ۳۶)

وارستہ کا علمی ماحول وارستہ ایک ایسے شہر میں پیدا ہوا تھا جو اپنی علمی سرگرمیوں کے لحاظ سے عہدِ اکبری سے لے کر سلطنتِ مغلیہ کے خاتمے اور زوال تک پنجاب بھر میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ اکبر کے زمانے میں مولانا کمال الدین حسین اور شاہ جہاں کے زمانے میں مولانا عبدالحکیم اور اُن کے فرزند مولانا عبداللہ کا علم و فضل تمام طلبۂ علم کے لیے باعثِ کشش رہ چکا تھا۔ اس کے علاوہ سیالکوٹ کے مان سنگھی حریری اور جہانگیری کاغذ بھی مشہور تھے۔[1] وارستہ کے اُستاد میر محمد علی رائج بھی سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ وارستہ کی ابتدائی تربیت پر اس ماحول کا اثر ضرور پڑا ہوگا۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ وارستہ کی طبیعت میں سطحیت کی بجائے عمق اور تنگ خیالی کی بجائے وسیع النظری موجود ہے جو عام منشیوں کے حصّے میں کبھی نہیں آئی۔

قوتِ تنقید وارستہ اپنے زمانے کا بہترین محقق تھا۔ اس کی قوتِ تنقید بے نظیر ہے۔ محقق رشیدی نے علم لغت میں جو راستہ تجویز کیا تھا وارستہ

---

[1] خلاصۃ التواریخ سجان رائے۔ ص ۲

نے اس راستے پر چل کر اس کی تکمیل کی کوشش کی۔ متاخرین وآرستہ کو اُستاد تسلیم کرتے ہیں۔ علم شعر کو وارستہ نے نئی ترکیب سے مدون کیا چنانچہ "مطلع السعدین" کے ذکر میں ہم قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔ وارستہ انشا میں خاص قسم کے خیالات کا پابند تھا، وہ "تصرف" کو شعر میں جائز نہ سمجھتا تھا نعمت خان عالی نے محاصرۂ حیدرآباد میں جو انداز اختیار کیا ہے وآرستہ اس کا مخالف تھا چنانچہ مطلع السعدین (ص ۶۸) میں لکھا ہے: "خان عالی نثرے کہ متضمن جہل ملائی انشا کردہ قابل وثوق نیست".........الخ

نثری نمونہ ہم اس کی کتاب "صفات کائنات" سے اس کی نثر کا نمونہ پیش کرتے ہیں:۔

"در صفت روز جمعہ: جمعہ بادشاہیست نامور کہ در مساجد خطبہ بنامش خوانند و در مدارس خط آزادی بفرمانش می نگارند نے نے۔ ریاضت کیشے ست کہ امام آیۂ سجدہ مے خواند، سورۂ توبہ بزبان می راند، آدینہ بازاریست کہ یک بدر متاع در راستہ اش مہیا ست واز کثرت اسباب کرامت رشک بازار مینا از سطوت احتسابش پیمانۂ رنداں پُر و پیمانہا خالی ست" (صفات کائنات ص ۱۲)

دیوان نہیں اس کے دیوان کا کہیں ذکر نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ دیوان نہیں تھا۔ اس کے کچھ اشعار مصطلحات میں ملتے ہیں لیکن وہ نمونے کا کام نہیں دے سکتے اس لیے ہم نظر انداز کرتے ہیں۔

وآرستہ کی تصنیفات یہ ہیں:۔

(۱) مصطلحات الشعرا

(۲) مطلع السعدین

(۳) صفاتِ کائنات یا عجائب و غرائب

(۴) جوابِ شافی یا رجم الشیاطین

(۵) جنگِ زنگا رنگ یا تذکرۂ وارستہ

اس مقام پر ہم صرف مصطلحات کا ذکر تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں۔ نمبر ۲ تا ۵ کے لیے حاشیہ ملاحظہ ہو۔[۱]

---

[۱] **مطلع السعدین** سنہ ۱۱۶۸ھ میں لکھی گئی۔ اس میں فن انشا و شعر کی مختلف شاخوں پر بحث کی گئی ہے۔ اس فن پر رشید الدین وطواط کی کتاب "حدائق السحر" سے لے کر وارستہ تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں وطواط کی پیروی کی گئی ہے۔ وطواط نے جو اشعار تمثیلی طور پر بیان کیے ہیں سب نے انھیں اشعار کو قائم رکھا۔ وارستہ کی جدت آفریں طبیعت نے اس میدان میں بھی جدت کو مدنظر رکھا اور اُس نے مطلع السعدین میں متاخرین کے اشعار کو بطور سند پیش کیا۔ مطلع السعدین کے مطالعے سے ہماری یہ رائے اور بھی مضبوط ہو جاتی ہے کہ وارستہ کی نظر تقلید اور کورانہ پیروی کے خلاف ہے۔ وہ ہر معاملے میں اپنی رائے رکھتا ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اسلاف کی رائے کے مطابق ہی ہو۔ یہ کتاب سنہ ۱۸۸۰ء میں طبع ہو چکی ہے اور اس کا ایک نسخہ پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے۔

صفاتِ کائنات یا عجائب و غرائب ہندستان کے فارسی انشا پردازوں کی تصنیفات سے مختلف مواقع اور مختلف تقاریب کے مطابق نثر کے نمونے نکال کر ایک جا جمع کر دیے ہیں۔ ان میں وارستہ کی اپنی نثر بھی ملتی ہے۔ آنند رام مخلص کی نثر کے ٹکڑے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ہر بیان "در صفت" کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ اس کتاب کا مختصر سا حال ریو نے بھی دیا ہے (ریو ج ۳ ص ۱۰۰۶) اس کا ایک مطبوعہ نسخہ پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے۔

مصطلحات الشعرا جدید محاورات اور جدید مصطلحات کا مجموعہ ہے کہیں کہیں مفردات بھی ہیں لیکن بالعموم اصطلاحات اور محاورات ہی کو جمع کرنے پر اکتفا کی گئی ہے۔ دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ کتاب ۱۱۸۰ھ میں ختم ہوئی۔ یہ تاریخ کتاب کے نام سے نکلتی ہے۔ مؤلف دیباچے میں لکھتا ہے کہ "میں عہدِ طفلی سے فصحا اور شعرا کے دواوین کا مطالعہ کرتا رہا اس سلسلے میں فارسی کے نادر اور غریب الاستعمال محاورات کا علم ہوا جن کے حل کرنے کا خیال پیدا ہوا میں نے لغت کی کتابوں کو دیکھا بھالا لیکن کوئی خاص امداد نہ ملی۔ بالآخر مجبور ہو کر ایرانی زبان دانوں کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ اس شغل میں پندرہ برس گزر گئے۔ اس کے بعد یہ مجموعہ تیار ہوا۔ بعض محاورے اگرچہ پہلی لغتوں میں موجود تھے لیکن اس خیال سے کہ ان کا فائدہ عام ہو ان کو بھی شامل کر لیا گیا۔ وہ الفاظ جنھیں جدید محاوروں میں متروک قرار دیا گیا ہے شامل نہیں کیے گئے۔"[1]

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۷

جنگِ رنگا رنگ اس کا حال ہمیں اودھ کٹیلاگ (سپرنگر ص ۱۴۶) سے معلوم ہوا ہے۔ سپرنگر لکھتا ہے کہ یہ وارستہ کی بیاض ہے جس میں مختلف شعرا کے عمدہ اشعار جمع ہیں۔ مضامین کے لحاظ سے ۲۰ عنوان مقرر کیے گئے ہیں۔ شعرا کے سوانح کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔ گُلِ رعنا (بانکی پور، ج ۸، ص ۱۳۳) میں غالباً اسی کتاب کو "تذکرے" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

رجم الشیاطین خان آرزو کی کتاب تنبیہ الغافلین کا جواب ہے۔ اس کتاب میں اُن اعتراضات کی تردید کی گئی ہے جو خان آرزو نے علی حزیں کی شاعری پر کیے ہیں۔ گُلِ رعنا میں "جوابِ شافی" نام ایک کتاب وارستہ کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ رجم الشیاطین اور جوابِ شافی ایک ہی کتاب کے دو نام ہوں۔ [1] اصل عبارت فارسی میں ہے۔

مُصطلحات کے مآخذ یہ ہیں:-

فرہنگِ جہانگیری، کشف اللغات، مؤیدالفضلا، مدارالافاضل، قاموس، تاج المصادر، شرح دیوانِ خاقانی از شادی آبادی، شرح قصائدِ انوری از فراہانی، لطائف مثنوی معنوی، صراح، مجموعۂ ابراہیم شاہی، منتخب اللغات۔ ان کے علاوہ "محاورہ دانانِ ایران" سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ریو[1] کا خیال ہے کہ "محاورہ دانانِ ایران" بھی لُغت کی کوئی کتاب ہے جس کا مصنف معلوم نہیں۔ ہماری رائے میں یہ کسی کتاب کا نام نہیں بلکہ اس سے صرف یہ مُراد ہے کہ مختلف محاورہ داں علما سے بعض محاورات کے بارے میں استصواب کیا گیا ہے۔ اور بس۔

مُصطلحات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے دیباچے میں اپنے سارے مآخذ کا نام نہیں لیا۔ بہارِ عجم اور سراج اللغۃ کا ذکر کتاب میں بارہا آتا ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ وارستہ نے مرآۃ الاصطلاح مخلص کو بھی دیکھا ہو۔ لیکن جہاں بہارِ عجم اور سراج اللغۃ درخورِ اعتنا نہیں وہاں مرآۃ الاصطلاح کا کیا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ رسالۂ نجوم طوسی، تاریخ عالم آرائے عباسی، ظفرنامۂ شرف الدین یزدی، تذکرۂ دولت شاہی، واقعاتِ بابری، آئینِ اکبری، تصنیفاتِ ملا منیر و ملا ظہوری وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔ ایک کتاب "لُغتِ ترکی" سے بھی فائدہ حاصل کیا ہے۔

یہ امر قابلِ تعجّب ہے کہ وارستہ نے منتخب اللغات (عربی) اور قاموس کو بھی اپنے مستقل مآخذ میں شامل کیا ہے۔ حالانکہ بظاہر ان کتابوں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا۔

مُصطلحات کی خصوصیت وارستہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ متاخرین میں محقق اور نقاد کی حیثیت سے

---

[1] ریو۔ ج ۲۔ ص ۵۰۳

بہت شہرت رکھتا ہے۔ رشیدی نے لغت میں سب سے پہلے تنقید و جرح کا قاعدہ نکالا۔ خان آرزو نے بھی اس طریقے کو استعمال کیا ہے اور یہ ہمارے مصنّف کا بھی وصف خاص معلوم ہوتا ہے۔ وہ صرف محاورات اور اصطلاحات کو اِدھر اُدھر سے جمع ہی نہیں کرتا بلکہ ہر ہر لفظ، ہر ہر محاورے پر ایک نظر ڈال لیتا ہے اس کے بند بند کو جدا کرتا ہے۔ ٹھیٹھ اور خالص ایرانی کے نقطۂ نگاہ سے اس کا پرکھتا ہے۔ اس کے بعد کتاب میں شامل کرتا ہے۔ ہمارے خیال میں وارستہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تحقیق کا شیدائی اور تنقید کا عادی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مصطلحات میں فارسی محاوروں پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔ وہ بزرگوں کے ذخیرۂ علم کو لیتا ہے کہیں ان کے مسلّمات پر اعتراض کرتا ہے، کہیں اُن کو قبول کرتا ہے۔ لیکن نئے زمانے کے مطابق اس پر اضافہ کرتا ہے، کہیں تردید کرتا ہے، کہیں تائید۔ غرض اسی طرح ایک خاص معیار کے مطابق نقد و جرح کا حق ادا کرتا ہے۔ ہم ذیل کی سطور میں وارستہ کے اس وصف خاص کے مختلف پہلوؤں کی تشریح کرتے ہیں۔

چراغِ ہدایت سے مقابلہ وارستہ الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے کئی سندیں لاتا ہے۔ مثلاً ہم یہاں چراغِ ہدایت کے ساتھ وارستہ کا مقابلہ کرتے ہیں:-

چراغِ ہدایت	وارستہ
آب بر آئینہ زدن و ریختن: رسمے ست کہ در قفائے شخصے کہ بسفر می رود، آب بر آئینہ بریزند کہ بسلامت باز آید و ایں را شگون دانند۔	چوں کسے بعزمِ سفر از خانہ برآید، کس در کوئے او چند برگِ سبز بر آئینہ گزاشتہ آب برآں ریزند و ایں را شگون زود بہم رسیدنہا دانند (محاورہ دانانِ ایران)

چراغِ ہدایت

طغرا ؎
کوے تو منزلگہ است درسفر آشنا
بر رُخِ آئینہ آب از پیٔ بیگانہ ریز
(اس کے بعد تاثیر کا شعر دیا ہے)

وارستہ

نظام دستِ غیب ؎
دیدہ را تر کنم از اشک چو رفتی از بزم
در قفائے سفرے آب بر آئینہ زنند

طغرا ؎
کوئے تو منزلگہ است درسفر آشنا
بر رخ آئینہ آب از پیٔ بیگانہ ریز
گریستن آئینہ و چشم تر کردن، آئینہ از پی داشتن و آب از پی ریختن ہمانست۔

صائب ؎
کیست آں کس کہ براحوال مسافر گرید
چشم آئینہ بدنبال مسافر گرید

ہم اوراست ؎
چناں افتادم از طاقِ دل بدصحبتاں صائب
کہ وقت رفتنم آئینہ چشم ترنے سازد

سنجر کاشی ؎
سکندر از پیم آئینہ داشت حینِ وداع
جم ز بادہ جنیبت کشید وقتِ شدن

یحییٰ کاشی رُباعی ؎
آنانکہ بدامانِ حیات آویزند

مردن سفریست چند ازاں بگریزند
اشکے کہ بریزند عزیزاں در مرگ
آبے ست کہ در پئے مسافر ریزند

اسی طرح "بادہ، وآبہ، وا کشیدن کی تشریح نہایت تفصیلی ہے۔ ان الفاظ واصطلاحات کی تشریح میں جیسا کہ اوپر کی مثال سے واضح ہوگیا ہوگا۔ بہت سے اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں "چراغِ ہدایت" کا بیان مختصر اور اجمالی ہے اور اشعار بھی ایک دو ہیں۔

اکثر اوقات وارستہ چراغِ ہدایت کے کسی مضمون کو لیتا ہے اور پھر اس پر جرح کرتا ہے، اس کے سقم کو واضح کرتا ہے۔

چراغِ ہدایت	وارستہ
آب بپوست افگندن میوہ۔ آنست کہ چوں میوہ بہ پختگی رسد آب از جوہر میوہ بپوست آید و پوست از خشکی بہ رطوبت گراید و لہذا طفلے راکہ بالغ شود، باصطلاح رنداں گویند کہ آب بپوست افگندہ است و مثل میوہ رسیدہ۔ سعید اشرف ؎ میوہ شیریں نشود چوں آب انداز د بپوست الخ۔	اکثرے برآنند کہ کنایہ از بالیدن است مطلقاً و ماخذ آں بالیدن دلو و مشک پر آبست و بعضے گویند کہ چوں میوہ بہ پختگی رسد آب از جوہر میوہ بپوست آید و بالیدہ شود اینہا اطلاق آں را بر میوہ دانند خصوصاً۔ الاول ہو الاقوی (پھر سند میں ظہوری کی رُباعی سلیم کا شعر اور ساطع کا فقرہ لاتا ہے)

آں بردن ماجرا: کنایہ از نہایت اشکال واستعجاب واستغراب حالتے (پھر تاثیر	کنایہ است از نہایت اشکال و غرابت آں (پھر سند میں عبدالغفور خاں خاص

چراغ ہدایت کے قلمی نسخے کا ایک ورق جس پر وارستہ نے اپنے ہاتھ سے تنقیدی حاشیے چڑھائے ہیں

اور عالی کے اشعار پیش کیے ہیں)

عالی، محسن، تاثیر کے اشعار پیش کیے ہیں۔ اس کے بعد اعتراض کیا ہے کہ) وبعضے اعزّہ کہ ماجرا را جزو محاورہ فہمیدہ اند غرابت دارد۔

چراغِ ہدایت میں "آبِ شیراز" کے دو معنی درج ہیں:- (۱) نہر شیراز (۲) شراب شیراز۔

وارستہ کہتا ہے آب شیراز را نام نہر گفتن آب درمیان دارد زیرا کہ جمہور ایرانیہ ازاں منکرند۔

چراغِ ہدایت میں وآیہ کے معنی "میعاد ہر روزہ" لکھے ہیں اور وحید کے اس شعر سے استدلال کیا ہے ؎

گر کام وحید از تو طلب کرد، نرنجی
جز سوختن خویش دگر وایہ ندارد

وارستہ کہتا ہے کہ "بخلاف اہل لغت وآیہ بمعنے میعاد گفتن وبشعر مذکور کہ بمعنے مراد دراں درست می شود متمسک شدن پر غریب است" اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس شعر میں "مراد" زیادہ صحیح ہے۔

چراغِ ہدایت نے "باجی" کے معنے میں یہ عبارت لکھی ہے "خراجی نیز ہمشیرہ و خواہر وایں از اہل زباں بتحقیق پیوستہ"

وارستہ اس پر اعتراض کرتا ہے اور کہتا ہے "کہ باج گزار وکنایہ خواہر نیز لیکن از ثقات ایران مسموع شد کہ ایں لفظ مخصوص بخطاب خواہر است و الّا مرادف نیست"

بعض صورتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ وارستہ کا بیان زیادہ معتبر اور زیادہ

پُراز معلومات ہوتا ہے مثلاً

چراغِ ہدایت: بتِ اشرفی، صورتیست که بر اشرفی سکّه کنند، وظاہر اُمراد از اشرفی "ہون" است که رائج دکن است، با آنکه مطلق طلائے مسکوک را اشرفی خوانند۔

اشرف ؎

اشرف از حرص چه چسپی بزر و سیم مگر
چوں بتِ اشرفی از بہر زرت ساخته اند

وارسته: بتِ اشرفی یا بتِ زر صورتی که بر اشرفی مسکوک کنند۔ در عہد اکبری و جہانگیری در ہند بیک روی اشرفی صورت گاؤ و آہو و امثال آں نقش مے کردند، مؤلف ازیں قسم اشرفی دیده۔

اشرف ؎

اشرف از حرص چه چسپی بزر و سیم مگر
چوں بتِ اشرفی از بہر زرت ساخته اند

طغرا ؎

رخسار بتِ زر که نبودش مژه یک مو
تا گشته نظر کردهٔ آں روٗ مژه دارد

واشرفی که ہر دو رویش صورت مسکوک باشد آں را دو بتی گویند۔ صادق دست غیب ؎

از سکّهٔ مہر شاں ببازار وفا
قلبم چو طلائے دوبتی گشت عزیز

یہاں مؤلف کی جہانگیر کے ۱۰۱۴ھ، ۱۰۳۷ھ کے اُن طلائی[1] اور نقرئی سکوں سے مراد ہے جو بروج دوازدہ گانہ کی تصاویر کے حامل ہوتے تھے۔ اس قسم کے سکّے احمد آباد اور آگرہ کی ٹکسالوں سے زیادہ نکلے ہیں۔

---

[1] ان معلومات کے لیے میں فاضل اجل پروفیسر شیرانی صاحب کا ممنون ہوں۔

اس کے علاوہ بعض سُنہری سکّوں پر خود جہانگیر کی اپنی تصویر بھی ہوا کرتی تھی۔ خان آرزو اس کو "ہون" کا مرادف کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ دکن میں رائج تھا۔ ہمارے خیال میں وارستہ کا بیان بمقابلہ خان آرزو کے زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کے کچھ سکّے اُستاد محترم پروفیسر محمود خاں صاحب شیرانی کے پاس بھی ہیں۔

وارستہ اور خان آرزو ہم نے اب تک وارستہ کی حیرت انگیز قوت تنقید کو ثابت کرنے کے لیے اس کا چراغ ہدایت کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ اب ہم بعض اور پہلوؤں سے اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وارستہ نے تنقید کے سلسلے میں سب سے زیادہ سراج اللغۃ اور بہارِ عجم پر توجہ کی ہے۔ خان آرزو اگرچہ مقتدائے روزگار تھے لیکن وارستہ کی محققانہ نظر سے خان آرزو بھی نہیں بچے۔ وہ نہایت بے تکلفی سے سراج اللغۃ کا نام لیتا ہے، اس کے بیانات کو توڑتا ہے، ان پر جرح کرتا ہے۔ سراج اللغۃ کے بیانات کو تسلیم نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ وارستہ کے نزدیک ہندستانی، زبان فارسی کے لیے سند نہیں مانے جا سکتے۔ وہ خان آرزو کے اشعار کو مثال کے طور پر پیش کرنے سے بالعموم احتراز کرتا ہے۔ ایک جگہ "خطِ آتش خواں" کے بیان میں خان آرزو کا ایک شعر سنداً پیش کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ لکھ دیا ہے کہ "در اشعار شعرائے ولایت دیدہ نشد"۔ ایک موقعے پر لکھتا ہے کہ "ای کاش بشعرائے ایرانی کہ زبان دانی حق ایشان ست، تمسک می جست تا تردد از میان برخاست" افسوس ہے کہ ہمارے پاس سراج اللغۃ موجود نہیں ورنہ ہم آسانی سے وارستہ کے ساتھ اس کا مقابلہ کرسکتے۔ مجبوراً خود وارستہ کے بیانات پر اعتماد کرتے ہوئے وہ الفاظ پیش کیے جاتے ہیں جن کے سلسلے میں وارستہ نے خان آرزو کے بیان پر اعتراض کیے ہیں:۔

"روز گار است" کے زیر عنوان "آرزو" کی تشریح پر نکتہ چینی کرتا ہی جس کا خلاصہ یہ ہی کہ آرزو نے سالک یزدی کے اس شعر پر شرح گلستاں میں اعتراض کیا ہی سے

سالک منشیں بنامُرادی   نومید مباش روزگار است

آرزو کو لفظ نامُرادی پر اعتراض ہی۔ اس کا خیال ہی کہ "سلب بلفظ 'نا' در مواضع است کہ محمول بطریق مواطات باشد"۔ وارستہ اس کے جواب میں لکھتا ہی "گوییم چوں باشد کہ کلام پیشینیان کہ امام فن ایشاں اند بصحت آں دال است حکم بغلط کردن از اغلاط فاحش است"

"آل" کے زیر عنوان لکھتا ہی "کہ صاحب سراج اللغۃ در فصل میم، دفتر دوم بتقریب مئ شیراز نوشتہ کہ شراب خصوصیتے بہ شیراز ندارد، بل شیشۂ خوب، در آں جا بہم می رسد، بر نشاء یاب بادہ سخن پیدا است کہ جمیع شعرائے ایران دیار بتوصیف شراب شیراز، ترزبان گشتہ اند چنانچہ .... (اشعار بطور سند) .... الخ فعلی ہذا التقدیر، تفئ خوبئ شراب شیراز بخلاف جمہور از مردم ہندی الاصل غرابت دارد"۔

وارستہ اور بہارِ عجم وارستہ نے ۱۱۸۰ھ میں اپنی مصطلحات کو مُرتب کر لیا تھا اس لیے اس کو بہارِ عجم کی پہلی ایڈیشن سے فائدہ اٹھانے کا کافی موقعہ ملا ہوگا مقابلہ بتلاتا ہی کہ وارستہ نے بہار عجم کو بطور ماخذ استعمال کیا ہی لیکن بہار عجم کے بیانات اور تشریح کو نہایت تنقیدی نظر سے دیکھا ہی ہم یہاں ایک مثال پیش کرتے ہیں جس سے یہ بتلانا مقصود ہی کہ وارستہ محاورے سے زیادہ واقف ہی اور اہلِ ایران کے اطوار و عادات سے بخوبی آشنا ہی۔

بہارِ عجم نے لفظ ترک کی تشریح میں لکھا ہی "کہ بعضے شارحین در معنئ بیت مذکور | بندہ وارستہ از ثقات ایران شنیدہ کہ چوں کسے خواہد خود را بدیگرے تشنا سائد

شیخ گنجہ [یعنی ؎

زسر ترک برداشت گفتا منم
ہنر بری کہ زیں گو نہ شیر افگنم]

نوشتہ اند کہ وقت خوشی و مفاخرت
کلاہ از سر برداشتن رسم ولایت است
امّا ایں معنی از ہیچ کتاب ظاہر نیست،
بل آنچہ دیدہ شد ہنگام تواضع از فرنگیاں
چنیں رسم سر مے زند، بہتر آنست کہ
کلاہ از سر مخالف برداشتن بود، یعنی
کلاہ از سر خصم مقتول برداشتہ بمردم
نمود کہ از من چنیں کار بوقوع آمدہ و
ایں از راہ مفاخرت باشد، انتہی کلامہ

کلاہ را از مقدم سر یکسو کند و لمؤخر
سر برساند، و ایں کنایہ است از پیدا
کردن سر و روئے خود و گویدہاں مرا
بشناس کہ من بایں بزرگی و شجاعتم
در شعر حکیم شفائی بتصریح دیدہ شد
واللہ اعلم بالصواب

ہمارے خیال میں وارستہ کا بیان زیادہ صحیح ہی اور اس معاملے میں بہارِ عجم کی بے خبری کا پتا چلتا ہی۔ حالانکہ یہ قاعدہ عرب (اور شاید عجم میں بھی) از منۂ قدیمہ سے موجود ہی۔ سب کو معلوم ہی کہ حجّاج نے ذیل کا شعر کوفے کے منبر پر پڑھا تھا[1]

انا ابنُ جلا وطلّاعُ الثّنایا
اذا اَضعُ العمامۃَ تعرِفُونی

لالہ ٹیک چند بہار نے جب دوسری ایڈیشن تیار کی تو اُس وقت وارستہ کی مُصطلحات سے بہت فائدہ اُٹھایا۔ چنانچہ خود دیباچۂ بہارِ عجم میں لکھتے ہیں کہ مجھے رسالہ میرافضل ثابت، مصطلحاتِ وارستہ اور رسالہ مخلص

---

[1] ان معلومات کے لیے میں پرنسپل محمد شفیع صاحب کا ممنون ہوں۔

تک پہلی ایڈیشن تیار کر چکنے کے بعد رسائی ہوئی۔ بلوخمن کنٹریبوشنز میں لکھتے ہیں کہ "بہار نے اس کتاب کو کاملاً بہارِ عجم میں شامل کر لیا یہی وجہ ہو کہ یہ رسالہ زیادہ مشہور نہیں ہو سکا" ہم نے خود بھی بہارِ عجم کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا ہو اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بہار بالعموم وارستہ کی تمام عبارتوں کو حرف بہ حرف بہارِ عجم میں نقل کر لیتا ہو اور بہت کم اس پر تنقید کرتا ہو۔ ذیل میں ہم بعض الفاظ و محاورات پیش کرتے ہیں جو بہار نے وارستہ سے حرف بہ حرف نقل کیے ہیں:۔

وارستہ: آب از آتش بروں آوردن و برکشیدن امرِ غریب غیرِ ممکن بظہور آوردن۔ شفیع اثر ؎

آب از آتش بروں آرد برنگِ شیشہ گر	در گداز دل عجب دستی ست مژگان ترا

میر معزی ؎

او چو خواہد خورد تشویر آتش افروز از آب	من چو خواہم کرد فریاد آب از آتش برکشم

بہارِ عجم: ایضاً

وارستہ: آبی شدن معاملہ: برہم شدن معاملہ واز نظام افتادن۔ کار نعمت خان عالی در محاصرۂ حیدرآباد گوید "فقرہ" طائفہ را بمقتضائے فَاَغْرَقْنٰاهُمْ فِی الْیَمِّ۔ معاملہ چنداں آبی شد کہ دست از حیات مستعار شستند۔

بہارِ عجم: ایضاً

اس کے علاوہ یہ اصطلاحات حرف بہ حرف بہارِ عجم اور وارستہ میں (تناظرِ الف مع منظرِ الف) ملتی ہیں:۔

آب دادن تیغ و خنجر، آب بر لبیاں بستن، آبدانی، آبلۂ پستان، آتش تاک، آتش تاک، آتش کش، آتش گیر، آتش گیرہ، آتش خوردن، آچار، آخر ندارد، آدم بہ آدم می رسد، آزاد درخت، آستین از چشم برداشتن و از مژہ جدا کردن،

آستین برخ کشیدن، آستین بر چیزے زدن، آستین بر گنہ زگر بہ سودن، آستین بر چشم و جبین و دیدہ و دل کشیدن، آستین نداشتن، آستین از دور بر داشتن، آسیائے فلاں بآب چشمۂ خضر و از آب طلائی گردد، آسیائے فلانے از بے آبروئی دائر است، آفتابگر، آفتاب مغربی، آلکی، آوردن آب چیزے را، آواز بآواز رسانیدن، آہار، آئینہ حبابی، آئینہ بر پیشانی بستن، آیات متشابہات، آیات محکمات، آئینہ پیش نفس و بر نفس داشتن و پیش لب گرفتن، آئینہ طاؤس آیۂ بلا آئینہ تمثال دار، آئینہ تصویر نما، آئینہ بر انگشتری نشاندن، آئینہ دار، آیۂ حجابی و حجاب وغیرہ۔

اس میں شک نہیں کہ بہارِ عجم نے کہیں کہیں کاٹ چھانٹ بھی کی ہے۔ بعض اوقات وارستہ کی نسبت زیادہ اشعار سند میں پیش کیے ہیں اور کبھی کبھی وارستہ سے مختلف بیان بھی دیتا ہے تاہم ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ بہار نے مصطلحاتِ وارستہ کو کاملاً بہارِ عجم میں شامل کر لیا ہے۔ بہار نے وارستہ کے بیانات اور معانی پر بہت کم تنقید کی ہے اور جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں محاورات کی فہرست دے کر واضح کر دیا ہے بہار نے وارستہ کی کتاب کو حرف بہ حرف نقل کیا ہے۔ بلاشبہ بہارِ عجم زیادہ ضخیم ہے اور بہت زیادہ محاورات و مصطلحات کی حامل ہے۔ تاہم وقتِ نظر، صحتِ الفاظ، تشریح و تنقید کے اعتبار سے ہم وارستہ کو بہتر خیال کرتے ہیں ہم اس مسئلے پر زیادہ تفصیل کے ساتھ بہارِ عجم کے بیان میں روشنی ڈالیں گے۔

"فرہنگ جہانگیری" وارستہ کے مستقل ماخذ میں شامل ہے اور ہندستان میں لغت کی ایک نہایت ہی مستند اور معتبر کتاب خیال کی جاتی ہے۔ مؤلف نے ایک مقام پر فرہنگ جہانگیری کے بیان کو ناقابل قبول قرار دیا ہے:-

پیر ہنیبہ: فراہانی از صاحب اصطلاحات نقل نمود کہ آں علامتے ست کہ کنار مزروعات نصبیہ کنند تا طیور بر منند۔ کمال اسمٰعیل ؎

در خانقاہ باغ نہ صادر نہ وارداست تا پیر پنبہ کشت حریف گران برف

ایضاً

اگر نیست اندر چمن پیر پنبہ چرا زاغ را پر کند ہر شگوفہ

پر نہادن پس سر کردن و آوارہ ساختن و صاحب فرہنگ جہانگیری معنیٔ "پیر پنبہ" پیرے کہ در تمام بدنش موئے سیاہ نماندہ باشد، نوشتہ و بیت اوّل آوردہ۔ گرفتم در بیت مذکور بتکلّف ایں معنی راست تواں نمود لیکن در بیت دوم اصلاً درست نمے شود، فلامحالہ قول شارح انوری صحیح ست فتامّل۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ صاحب جہانگیری نے اس شعر کے اندر ذرا تکلّف کے ساتھ یہ معنی پیدا کیے ہیں ورنہ دوسرے معنی نہایت باموقعہ اور مناسب ہیں۔

وارستہ کے بعض اور پہلو

جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں وارستہ کی بہت بڑی صفت اس کی تنقیدی قابلیت ہے۔ مصطلحات میں اس صفت کو ہم بوجہ اتم جلوہ گر پاتے ہیں۔ اس کی نظر بہت وسیع ہے، اس کی معلومات بہت زیادہ ہیں اور پھر اس کا تنقیدی مطالعہ ہماری نظروں میں اس کی وقعت کو اور بھی زیادہ کر دیتا ہے۔ مصطلحات میں مختلف پیشہ وروں کی اصطلاحات بھی ملتی ہیں۔ جو "زبان" میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک صاحب علم اہل زبان اور غیر اہل زبان میں یہی فرق ہوتا ہے کہ اہل زبان کو اپنے ملک کی تمام اصطلاحات، عام لوگوں کے محاورات، آلات و مصنوعات، تشبیہات و کنایات کا علم ہوتا ہے۔ فارسی زبان کا روزمرّہ سب زندہ زبانوں کی طرح کچھ مدت کے بعد تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک اہل زبان کو اس متروک زبان کا حال معلوم ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ ایسے محاورات و الفاظ کے استعمال کرنے سے احتراز کرتا ہے جنھیں ملک نے متروک

قرار دیا ہو اُسے اہلِ حرفہ کی اصطلاحات اور ان کے خاص الفاظ پر عبور ہوتا ہے بخلاف اس کے غیر اہلِ زبان کو صرف کتابی فارسی سے واقفیت ہوتی ہے اس لیے وہ علمی زبان کے سوا کوئی اور محاورہ نہیں جانتا۔ وارستہ نے پیشہ وروں کی اصطلاحات کا خاص خیال رکھا ہے منشیوں، پہلوانوں، بازی گروں وغیرہم کے خاص الفاظ و اصطلاحات بھی موجود ہیں جن کی تفصیل کو ہم بخوف طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔

ہندی الاصل محاورات وارستہ نے ہندی الاصل محاورات کو بالکل تسلیم نہیں کیا اور اپنی ان معلومات کی بنا پر جو اس کو ایرانیوں کے اختلاط سے حاصل ہو گئی تھیں وہ ہندی الاصل محاورات کی سختی کے ساتھ مخالفت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہندستانی شعرا کے اشعار کو بھی بطور سند نہیں پیش کرتا اس لیے کہ اس کے نزدیک استعمالِ ہند، بلاغت اور فصاحت کے خلاف ہے اور یہ چیز ہندستانی شعرائے فارسی کے ہاں بہت زیادہ ہے۔

نادر محاورات مرزا محمد حسن قتیل نے چہار شربت میں نادر محاورات فارسی کی ایک فہرست پیش کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ محاورے ہندستان میں بہت کم لوگوں کی زبان پر ہیں۔ حالانکہ ایران میں ان کو شیوع حاصل ہے۔ مثلاً بہ ہند رفتن حنا، آب بدست و پائے کسے ریختن، آب آئینہ ریختن، آبی شدن معاملہ، آب گردش چشمۂ سلسبیل، بانگِ خلیل اللّٰہی وغیرہ۔ ان میں سے اکثر محاورات ہمیں وارستہ کی مصطلحات میں ملتے ہیں۔

ہندی یا پنجابی مرادفات بعض الفاظ کی تشریح کرتے وقت وارستہ ہندی مرادفات لاتا ہے۔

مثلاً:-

تنفتان = پراٹھا جامۂ ناشوی = کورا

چارسو = چوہٹہ　　　　فازہ = جنبائی
چاہ میرزہ = سنڈاس
چراغ ہندوافروختن = دوالیہ　　　　کچہ = چہلہ
جوق = پنچالی　　　　لوطی = بانکہ
خط جواز = دستک　　　　قزّاز = پٹوہ
وغیرہ۔

بعض لطیفے وارستہ نے جن الفاظ میں تنقید کی ہے ان میں بلاغت کا ایک خاص رنگ ہے۔ ہم یہاں ایک دو فقرے بطور تفنن پیش کرتے ہیں:۔

اہل لغت کے ایک گروہ نے "آب شیراز" کے ایک معنی "نہر شیراز" بھی لکھے ہیں اس کے متعلق وارستہ لکھتا ہے:۔

آب شیراز را نام نہر گفتن "آب درمیان دارد" بعض لوگ "دودکش" کو ہندی فارسی کہتے ہیں۔ وارستہ کو اس خیال سے اختلاف ہے چنانچہ لکھتا ہے؛ "وایں را فارسی ساختۂ اہل ہند گفتن، دود از نہاد فارسی بر آوردن ست"

بعض خامیاں مصطلحاتِ وارستہ میں بعض محاورات کی تشریح بہت تشنہ ہوتی ہے۔ علی الخصوص جبکہ وہ الفاظ و اصطلاحات کسی تاریخی واقعہ یا جغرافیہ کے ساتھ وابستہ ہوں مثلاً 'حروفی' کی تشریح بہت ناقص ہے "حروفی فرقہ الیست کہ احداث عقائد کنند، الحروفیون المحدثون"۔ وحید ؎

ایں رقصیاں بنام صوفی　　　　یا نقطوی اند یا حروفی

یہ نہیں بتلایا کہ یہ فرقہ کونسی قوم اور ملک میں پیدا ہوا؟ ان کو حروفی کیوں کہتے ہیں؟ ان کے عقائد کیا ہیں؟ وارستہ نے جو بیان دیا ہے اس سے تو مطلق کسی بات کا پتا نہیں چلتا۔ حسن بن صباح کے متعلق لکھتا ہے:۔

"نام مزدّرلیست کہ تفصیل مکاریٔ او درکتب تواریخ مفصلاً و درتذکرۂ دولت شاہی مجملاً مسطوراست نعمت خاں عالی درمحاصرۂ حیدرآباد گوید فقرہ۔ کفایت خاں کہ درامور ملکی رسیدنش از حسن صباح بیش ست دہقاناں راطلبیدہ گفت کہ أَنتُمْ تَزْرَعُونَ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ" یہ امر قابلِ تعجب ہے کہ حسن بن صباح کا حال نعمت خاں عالی کے فقرے کے ذریعے کس طرح اور کیوں بیان کیا۔ یہ ایک تاریخی چیز تھی اس کی تشریح کتب تواریخ سے ہونی چاہیے تھی نہ کہ عالی کے فقرے سے۔ اسی طرح بعض جغرافیائی الفاظ کی ادب کی کتابوں سے تشریح کی گئی ہے۔ حالانکہ ان کے لیے کتبِ تواریخ وجغرافیہ کو استعمال کرنا چاہیے تھا۔

وارستہ کا علمی مرتبہ

بہرحال مصطلحاتِ وارستہ لغت کی کتابوں میں بہت بلند درجہ رکھتی ہے۔ خان آرزو کے بعد جو لغت کی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں تنقید اور تحقیق کے نقطۂ نگاہ سے ہمارے مصنّف کو صفِ اوّل میں جگہ حاصل ہے۔ اگرچہ یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے لیکن بقول بلوخمن اُسے "ہم" اور "یخبل" کہہ سکتے ہیں[1] "بقامت کہتر بقیمت بہتر"۔ اس کی قدروقیمت کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ بعد کے آنے والے لغت نویسوں نے وارستہ کی کتاب کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھا۔ قتیل نے اپنی کتابوں میں وارستہ سے استناد کیا ہے۔ آغا احمد علی مؤید برہان میں لکھتے ہیں کہ "مصطلحات دربیان لغات ومحاورات تازہ گویاں نسبت، از سیالکوٹی مل لاہوری وایں دانش پژوہ نخست پانزدہ سال از زبان دانانِ ایراں دیار محاورات اخذ کردہ :........ الخ" (مؤید برہان ص م)، صاحب آصف اللغات لکھتے ہیں "کتابے ست مختصر ومفید در تعریف مصطلحات فارسی پابند سند ست وخال خال مفردات را ہم ذکر مے کند، ترتیب الفاظش مسلسل

---

[1] بلوخمن۔ کنٹر بیوشنز ص ۳

نیست کہ اکثر پیشینیاں اعتنا باین نے فرمودند۔ وارستہ بہ تحقیق الفاظ مذاق خاص دارد، تالیفش اگرچہ مختصر است لیکن نیکلے معتبر۔ (آصف اللغات ج ۱، ص ۱۲)

ان کتابوں کے علاوہ بہارِ عجم، فرہنگ انندراج، ہفت قلزم وغیرہ کی ترتیب میں مصطلحاتِ وارستہ سے بے حد فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ اس قبول عام سے صرف یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ مصطلحات کی تحقیق کو تمام علما و فضلا وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

منشی ٹیک چند بہار

بہارِ عجم

سوانح حیات سب سے آخر میں بہارِ عجم کا نمبر آتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ بہارِ عجم کو ہندستان میں بہت قبول عام حاصل ہوا لیکن رائے ٹیک چند بہار کے حالات کم ملتے ہیں۔ ہم عصر تذکرہ نویس بھی نہایت ہی معمولی اور مختصر واقعات دے رہے ہیں اور ہم ان سب کی ورق گردانی کے بعد بھی کسی حد تک تاریکی میں رہتے ہیں تاہم بہار کے حالاتِ منتشرہ کو ہم یہاں ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔[1]

رائے ٹیک چند بہار دہلی کا باشندہ تھا۔ سراج الدین آرزو اور شیخ ابوالخیر خیر اللہ وفائی کے شاگردوں میں سے تھا وہ بہارِ عجم میں اول الذکر کو سراج المحققین اور ثانی الذکر کو خیر المدققین کے نام سے یاد کرتا ہے۔

فتح علی حسینی گردیزی[2] کے ساتھ بہار کے تعلقات و روابط دوستانہ تھے۔

---

[1] بہار کی زندگی کے کچھ اور واقعات مجموعۂ نغز یا تذکرۂ شعرائے اردو میر قدرت اللہ قاسم سے ملے ہیں۔ انگریزی مضمون میں غلطی سے رہ گئے ہیں۔ [2] دتاسی ہندستانی لٹریچر ج ۱ ص ۲۰۱

میر تقی میر[۱] بھی اُسے دوستوں میں شمار کرتا ہی۔

تذکرۂ گلزارِ ابراہیم[۲] کے مصنّف کا بیان ہی کہ بہارؔ نے ایران کی بھی سیاحت کی تھی۔

بہارؔ کو دربارِ دہلی کی جانب سے رائے یا راجا کا خطاب بھی ملا تھا۔ گمان غالب یہ ہی کہ یہ فاضل دہر ۱۱۸۰ھ میں دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

تصانیف میر حسن[۳] اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں:۔

"از مستعدانِ روزگار شاعر فارسی بود۔ از اصطلاحاتِ فارسی بسیار خبر داشت از یارانِ سراج الدین علی خان صاحب بود۔ تصانیف بسیارے داشت"

لیکن کاش وہ اپنی اختصار پسندی سے تھوڑا سا ہٹ کر ذرا "تصانیف بسیار" کی فہرست دے دیتے۔ ہم صرف ذیل کی کتابوں سے واقف ہیں:۔

(۱) بہارِ عجم (۲) جواہر الحروف
(۳) نوادر المصادر (۴) ابطالِ ضرورت
(۵) جواہر الترکیب

ایک اور مصنّف[۴] کا بیان ہی کہ "بہار ہندی، اُردو اور خصوصاً فارسی میں بہت سی کتابیں چھوڑ کر مرا" لیکن بدقسمتی سے مندرجۂ بالا کتابوں کے علاوہ کوئی اور کتاب بہارؔ کے ذکر میں نہیں مل سکی۔ اب ہم بہارِ عجم پر تبصرہ کرتے ہیں۔

بہارِ عجم بلوخمن صاحب[۵] کی رائے ہی کہ "بہارِ عجم ایک آدمی کے قلم سے نکلی ہوئی سب سے بڑی لغت ہی" یہ متواتر بیس سال کی کوششوں کے بعد لکھی گئی ہی۔ یکے بعد دیگرے سات نسخے اصلاح و ترمیم کے بعد شائع ہوئے۔ پہلا نسخہ ۱۱۵۲ھ میں

---

[۱] نکات الشعراص ۱۴۱ [۲] سپرنگر ص ۲۱۱ [۳] تذکرہ میر حسن ص ۹۰ [۴] تذکرہ کریم الدین ص ۵۶
[۵] کنٹری بیوشنز ص ۲۰

میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا اور آخری نسخہ ۱۸۸۲ء میں چھپا جو اندرمن کا تصحیح کردہ ہی۔ آج کل جو نسخے بازار میں بکتے ہیں وہ اسی اندرمن کے ہیں جس نے پہلے سارے نسخوں کے مقابلے کے بعد اسے ایک خلاصے کے طور پر شائع کیا ہی۔ بہار نے ایک موقع پر شکایت کی ہی کہ اس کے ایک شاگرد نے اس کی کتاب کے مضامین کا سرقہ کر لیا تھا اور مصنّف کو ساری شہرت سے محروم کرنے کا عزم کر لیا تھا لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون سا شاگرد تھا جس نے اپنے اُستاد کا حق خدمت اس طریق سے ادا کیا تھا اور غالباً وہ کتاب بہارِ عجم ہی تھی .... جسے اس حق ناشناس شاگرد نے اپنانے کی کوشش کی تھی۔

بہارِ عجم کے مآخذ مصنف نے دیباچے میں سو سے زیادہ کتابیں گنائی ہیں جو مصنّف کے زیرِ مطالعہ رہی ہیں اور ان سے وقتِ ضرورت استناد کیا گیا ہی۔ ان میں بہت سے دواوین و شروح اور بے شمار کتب انشا و تاریخ درج ہیں۔ مصنّف نے دیباچے میں لکھا ہی کہ پہلے اڈیشن کے شائع ہو چکنے کے بعد اسے بعض اور کتابیں بھی دستیاب ہوئیں مثلاً مصطلحات الشعرا، رسالۂ مخلص[1] اور ایک اور رسالہ۔ ان کے علاوہ تنبیہ الغافلین اور رسالۂ میر افضل ثابت سے بھی کافی فائدہ اُٹھایا گیا ہی۔

ترتیب۔ کتاب کی ترتیب میں کوئی خاص جدّت نہیں "استعمال متاخرین" کے نمونے پیش کرنے کی خاطر عموماً جامی کے بعد کے شعرا کے اشعار بطور سند لائے گئے ہیں۔ اگرچہ متقدمین کے اشعار بھی بالکل نظر انداز نہیں کیے گئے۔ ایک ایک اصطلاح کے ماتحت کئی کئی اشعار پیش کیے گئے ہیں۔

ہمارا مصنّف عام طور پر متقدمین اور متاخرین کے مسلّمات پر تنقید کرتا ہی۔ ان

[1] رسالۂ مخلص سے مراد مرآۃ الاصطلاح ہی۔ بعض کتابوں میں مخلص کاشی لکھا ہوا ہی یہ صحیح نہیں۔

کے اقوال کی صحت کو پرکھتا ہے۔ اپنے معیار پر ان کو لاتا ہے اس کے بعد انھیں کتاب میں درج کرتا ہے جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں خان آرزو کو اپنے فاضل شاگرد کی اس حیثیت کا اعتراف ہے چنانچہ لکھتا ہے:[1]

"و بہارِ عجم وغیرہ کہ از یاران فقیر آرزو ست و مثل او دریں عصر بہم نرسیدہ و دریں کتاب گاہے با او صلح است و گاہے جنگ است"

مصطلحاتِ وارستہ اگرچہ ایک مختصر سا مجموعۂ محاورات ہے لیکن اس کے اوریجنل ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ بہار کا اپنا بیان ہے کہ یہ رسالہ پہلے ایڈیشن کے ختم ہونے کے بعد دستیاب ہوا اور دوسرے ایڈیشن میں اس کو بتمامہ شامل کرلیا گیا ہے۔ مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہار جن مصطلحات کو وارستہ سے لیتا ہے انھیں بہت کم تبدیلی اور تغیر کے ساتھ نقل کرلیتا ہے۔ اگر ہمارے پاس بہارِ عجم کا پہلا ایڈیشن ہوتا تو ہم زیادہ تیقن اور وثوق کے ساتھ اپنے اس خیال کو پیش کرسکتے۔ اگر وارستہ کے مضامین اس میں شامل نہ ہوتے تو بہارِ عجم مقابلتاً ناقص کتاب ہوتی۔ بہرحال چونکہ پہلا ایڈیشن ہمارے پاس موجود نہیں اس لیے ہم بجز اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اکثر محاورات کی تشریح بہارِ عجم اور وارستہ میں یکساں ہے ممکن ہے کہ ان ہر دو مصنفوں کا مآخذ ایک ہی ہو۔

افسوس ہے کہ بہارِ عجم کے سارے ایڈیشنوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہم ہر نسخے کی خصوصیتوں، ابتدائی نسخوں کے نقائص اور خامیوں اور مصنف کی آرا و معلومات کی پے در پے تبدیلیوں سے پورے طور پر واقف نہیں ہوسکتے۔ یہی ایک چیز تھی جو مصنف کی حقیقی عظمت اور کتاب کی اصلی حقیقت کو ہماری

---

[1] مثمر خان آرزو (قلمی پنجاب یونیورسٹی) ق ۱۳۴

نگاہوں میں متعین کر سکتی تھی۔ ان حالات میں ہمارے لیے بجز اس کے کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہتا کہ ہم اپنی تفصیلی رائے کو کسی ایسے وقت کے لیے محفوظ رکھ چھوڑیں جب اندرونِ ملک یا بیرونی دنیا کا کوئی کتب خانہ بہار کے سارے نسخوں کو بے نقاب کر دے۔

بہار کی جامعیت۔ موجودہ معلومات کی بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بہارِ عجم مصطلحات و محاورات کی ایک جامع لغت ہی جو قدما، متوسطین و متاخرین کے مختلف مجموعوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہی۔ بلوخمن صاحب کی رائے ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ "یہ ایک فردِ واحد کے قلم سے نکلی ہوئی سب سے بڑی لغت ہی"۔ غالباً بہار کی جامعیت ہی اس کے لیے ایک طرۂ امتیاز ہی آصف اللغات کے مصنف[1] نے اس کتاب پر بہت اچھا تبصرہ کیا ہی:-

"مفردات چند و مرکبات بسیار را شامل، ودر اکثر الفاظ از نظائر متعددۂ متقدمین و متاخرین سند گرفتہ کہ اکثر آں مرکبات تازہ رانشان می دہد طرفہ تر تیبے دارد کہ اصطلاحات بسیار در شیرازۂ ایں کتاب مضمر باشند و بیان اکثر استعمالات بروں از بیان و در خفای نظائر پنہان است۔ اکثر تمثیلات برخلاف اصطلاح بنیۂ بنظر آمدہ۔ من وجہ جامعیتش پیدا است کہ بسیارے از کلام اساتذہ در یک شیرازہ جمع فرمودہ است"

بہار اور قوتِ تنقید۔ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ اپنے تمام معاصرین میں وارستہ ہی ایک ایسا شخص ہی جو زبردست تنقیدی نظر کا مالک ہی اور ہم اس خیال کی طرف مائل ہو رہے ہیں کہ بہار اس کے مقابلے میں پست درجہ رکھتا ہی۔ تاہم اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ بہار اس جوہر سے سراسر خالی تھا۔ وہ

---

[1] آصف اللغات۔ ج ۱۔ ص ۵

بقول خان آرزو اپنے مسلمات پر اصرار کرنے والا اور دوسروں کے اقوال و آرا کو پوری تنقید کے ساتھ قبول کرنے والا شخص ہے۔

بہارِ عجم کی خصوصیت: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی خصوصیتیں ہیں جن کی بدولت بہارِ عجم کو اقران و اماثل میں اتنا امتیاز حاصل ہوا اور بعد میں آنے والے لوگوں نے اسے قبولِ عام کی عزت بخشی؟ ہمارے خیال میں سب سے بڑی خصوصیت بہارِ عجم کی جامعیت ہے۔ ہمیں بہارِ عجم کے علاوہ کوئی ایسی کتاب معلوم نہیں جس میں فارسی کی اصطلاحوں کو اس استیعاب و احاطہ کے ساتھ جمع کیا گیا ہو وارستہ اعلیٰ ناقد سہی مگر تھوڑے سے جدید و قدیم محاورات کی چھان بین اسے ایک جامع لغت کا رتبہ دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی اور اس پر طرہ یہ کہ وارستہ تقریباً سارے کا سارا بہارِ عجم کے صفحات میں آگیا ہے جس شخص کے پاس بہارِ عجم ہو اُسے وارستہ کی ضرورت کہاں باقی رہتی ہے؟ گویا دوسرے الفاظ میں یہ ایک بڑا دریا ہے جس میں سب چھوٹے دریاؤں کا پانی مل جاتا ہے۔ بہار تیس سال کے طویل زمانے تک تحقیق و تنقید و جمع و ترتیب میں مشغول رہا اور بقول بعض اس نے ایران تک کا سفر اختیار کیا تاکہ وہاں جاکر جدید محاورات فراہم کر سکے۔ یہ تمام واقعات اربابِ نظر سے چھپے ہوئے نہ رہ سکتے تھے۔ بہار نے کتاب کی ترتیب سے بہت پہلے اپنے علمی شوق اور ذوقِ جستجو کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھالیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت تھوڑے عرصے میں بہارِ عجم کا شہرہ ہندستان کے گوشے گوشے میں پہنچ گیا۔

اس کتاب کو اتنی شہرتِ عام حاصل ہوئی کہ ہم اپنے اس خیال کو بغیر کسی تذبذب کے پیش کر سکتے ہیں کہ اگر ہندستان میں اس کتاب کے علاوہ کسی ہندو اہلِ قلم کی اور کوئی قلمی کوشش موجود نہ ہوتی تو بھی بہارِ عجم سارے فارسی لٹریچر

میں اپنی جگہ تلاش کر ہی لیتی اور اس کی بنا پر ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصّہ گراں قدر سمجھا جاتا۔

آصف اللغات کے مصنف نے اپنی لغت کی ترتیب میں اس کتاب سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ بعض صورتوں میں بہارِ عجم کی عبارتوں پر جرح کرتا ہے اور بہارِ عجم کے مسلمات کی تردید کرتا ہے۔ علاوہ ازیں بعد کے آنے والے جملہ مصنفین نے اس لغت سے فائدہ اٹھایا ہے۔

اس عہد کے شعرا

ہم مندرجہ بالا سطور میں لکھ آئے ہیں کہ اس عہد میں بہت سے شاعر پیدا ہوئے جن میں سے بعض کا نام دنیائے ادب میں خاص عزت و امتیاز کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ہم ذیل میں تمام شعرا کی فہرست پیش کرتے ہیں ان میں سے اکابر شعرا کا قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کریں گے۔

(۱) جسونت رائے منشی (م ۱۲۰۰ھ) یہ صاحبِ دیوان تھا اس کے دیوان میں غزلیات اور رباعیات ہیں۔ ایک مثنوی سسّی پنوں کے نام سے سپرنگر نے اس کی طرف منسوب کی ہے۔ اسی شاعر نے "گلشن بہار" کے نام سے ایک کتاب فن انشا پر لکھی ہے۔ دیوان کا ایک نسخہ انڈیا آفس[1] میں موجود ہے۔ شاعر کی وفات ۱۲۰۰ھ میں واقع ہوئی۔

(۲) سبقت[2]۔ لالہ دھن راج برہانپوری (۱۱۲۶ھ پیدایش) کالیتھ

---

[1] انڈیا آفس عدد ۱۶۹۵: سپرنگر۔ ص ۵۰۷، ۵۰۸

[2] گل رعنا (بانکی پور لائبریری۔ ج ۸۔ ص ۱۲۲)

(۳) بے تکلف[۱]۔ لالہ سدانند عمّ بندرا بن داس خوشگو (متوفی ۱۱۲۹ھ) صاحب دیوان اس کے آبا و اجداد لکھنؤ ہی کے رہنے والے تھے اور دارا شکوہ کی سلک ملازمت میں تھے۔ ہمارا شاعر زیب بانو بیگم زوجہ شاہ زادہ محمد اعظم کا ملازم تھا۔

(۴) بیغم۔ سوامی بھوپت رائے بیراگی از قانون گویان پنجاب متوطن پٹن از سرکار جموں (متوفی ۱۱۳۲ھ) اس شاعر کا حال ایک مستقل مضمون کی صورت میں سپرد قلم کر چکے ہیں (ضمیمہ الف میں ملاحظہ ہو)

(۵) ہاتف[۲] (۱۱۳۶ھ میں بقید حیات تھا) رائے راجی نام قوم کھتری ساکن انبالہ

(۶) اخلاص[۳]۔ کشن چند کھتری دہلوی ولد اچل داس کھتری (۱۱۳۶ھ) تذکرۂ ہمیشہ بہار اسی شاعر کی تصنیف ہے۔ عبدالغنی بیگ قبول کشمیری کا شاگرد تھا۔ صاحب مخزن الغرائب لکھتا ہے "ہندوے بود در دہلی از معقولیت نبودہ" شفیق نے گل رعنا میں اس کا ذکر کیا ہے۔

(۷) بہار۔ اودے بھان دہلوی تلمیذ کشن چند اخلاص (۱۱۳۶ھ) ہمیشہ بہار (سپرنگر ۱۱۹) روز روشن میں اس کا یہ شعر درج ہے

برسر بازار سودائے دکانے داشتم   باوجود آنکہ برکف غیر نقد جاں نبود

(۸) سبقت[۵]۔ لالہ سکھ راج کا بیٹا (متوفی ۱۱۳۸ھ) بڑا ہمہ دان فاضل تھا۔ شاعری میں مرزا بیدل کا شاگرد تھا۔ سید اسد اللہ خاں المعروف بہ نواب الاولیا اور امیر الاولیا سید حسین علی خاں کی ملازمت میں عمر بسر

---

[۱] سفینۂ خوشگو (رامپور۔ ج ۰۔ ص ۹۴)؛ گل رعنا رامپور۔ ج ۰۔ ص ۱۲۹)؛ نشتر عشق (قلمی پنجاب یونیورسٹی لائبریری) ج ۱۔ ق ۸۹ [۲] ہمیشہ بہار (سپرنگر ص ۱۳۰)

[۴] سپرنگر ص ۱۱۷۔ روز روشن۔ ص ۲۹؛ مخزن الغرائب (قلمی مملوکہ پروفیسر شیرانی)

[۵] نشتر عشق (قلمی) ج ۱۔ ق ۲۳۲

کی۔ آخری عمر راجا گردھر بہادر گجراتی کے ہاں کاٹی اور وہیں کسی معمولی چپقلش کی بنا پر راجا کے ساتھ جنگ کی اور قتل ہوگیا "جنگ نامہ فتح" کے نام سے ایک مثنوی سید حسین علی خاں کے اعزاز میں شاہ نامے کی طرز پر لکھی۔

پنج صدی منصب رکھتا تھا علم صرف، تاریخ، عروض، معانی، طب، ریاضی، تصوف و علم اصطلاحاتِ تصوف میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔ نشترِ عشق میں اس کے اشعار کا یہ نمونہ دیا گیا ہے ؎

چہ خوں کہ در دل قمری نہ کردۂ ظالم — بباغ رفتی و شمشاد سرو قد برخاست

چو نقش پا بسر کوئے انتظار کسے — نشستہ ام کہ شوم خاک رہگزار کسے

بہ بزم وصل بتاں بہ کہ شمع ساں سبقت — کنیم نقد دل و جان خود نثار کسے

(۹) باقیہ۔ بہوپت رائے (متوفی ۱۱۳۹ھ)[۱]

(۱۰) مخلص۔ گلاب رائے (متوفی ۱۱۳۹ھ)[۲]

(۱۱) حیا۔ لالہ شیو رام کایستھ (متوفی ۱۱۴۴ھ)[۳] رائے بھکتی مل (یا بھگتی مل) کا دوسرا لڑکا تھا۔ مرزا بیدل کا شاگرد اور اسد خان وزیر عالمگیر کے ملازمین میں سے تھا۔ شاعر ہونے کے علاوہ نثر میں طرز خاص کا مالک تھا۔ "گلگشت بہار ارم" نام کتاب شعرا کی توصیف میں اور چہار عنصر مرزا بیدل کی طرز پر لکھی۔ ہمیشہ بہار کے بیان کے مطابق وہ صاحبِ دیوان تھا۔ نشترِ عشق میں اس کے یہ اشعار دیے گئے ہیں ؎

بیاد چشم تو داریم مے پرستی ہا — رساندہ ایم بہ گردوں دماغ مستی ہا

---

[۱] گل رعنا قلمی (بانکی پور۔ ج ۸ ص ۱۳۰)؛ سفینۂ خوشگو (بانکی پور ج ۸ ص ۹۷)

[۲] سفینۂ خوشگو۔ ج ۳ (بانکی پور۔ ج ۸ ص ۹۷) [۳] ایضاً ص ۹۹۔ نشترِ عشق (قلمی) ج ۱۔ ق ۱۵۹؛ گل رعنا (بانکی پور۔ ج ۸۔ ص ۱۳۰) ہمیشہ بہار (اسپرنگر ص ۱۲۱)

تنہا نہ ہمیں بر سرِ مژگان ترآید — از ہر بن مویم چو عرق اشک برآید

(۱۲) امانت[۱] - لالہ امانت رائے (۱۱۴۵ھ) بڑا پُرگو شاعر تھا۔ بھگت مالا[۱]، بھگوت یا جلوۂ ذات[۲]، ترجمۂ منظوم رامائن، مثنوی نایک[۳]، وید وغیرہ اسی کی تصانیف ہیں۔ اکثر کتابیں مذہبیات و تصوف سے متعلق ہیں۔ بہ حیثیت شاعر بہت بلند پایہ نہیں رکھتا۔ اس کی ایک مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے:-

ای رفیقاں قصہ نی بشنوید — نالۂ درد دل وی بشنوید

اسے پڑھ کر مولانا رومؒ کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ~

بشنو از نی چوں حکایت می کند — وز جدائیہا شکایت می کند

تذکرۂ حسینی میں امانت کے یہ اشعار دیے گئے ہیں:-

راست کیشاں را غمے از انقلاب دہر نیست

در نگیں حرفِ الف از راستی واژوں نشد

بسکہ خوں در جگر از دست نگارے دارم

در دل خود چو حنا جوشش بہارے دارم

در تمنائے تو ای سرو رواں برلب جو

ہم چو ساحل تہی از خویش کنارے دارم

دل پُر سوز خود از سینہ گر بیروں بر اندازم

درون خرمن آرام مردم اخگر اندازم

---

[۱] تذکرۂ حسینی (قلمی پنجاب یونیورسٹی) ق ۳۷، انڈیا آفس عدد ۱۶۹۶

صاحب نشترِ عشق نے مندرجۂ ذیل اشعار کا انتخاب کیا ہے:

نمے گردد بلند از خاک ہم گردِ مزارِ ما — کہ بنشیند مبادا بر دلِ خوباں غبارِ ما

خاک بر سر مے کنیم از روزگارِ ما مپرس — گردبا دیم از عروج و اعتبارِ ما مپرس

(۱۳) فرحت[1]۔ لالہ خوش حال چند (متوفی ۱۱۴۷ھ) عم لالہ دولت رائے بیدار

(۱۴) بیدار[2]۔ منشی بساون لال (رائے) تلمیذ مظہر جان جاں (متوفی مابعد ۱۱۴۷ھ) مصنف تذکرۂ عشقی کا بیان ہے کہ بیدار نے پٹنے میں وفات پائی اور ایک فارسی دیوان یادگار چھوڑا۔

روزِ روشن میں یہ اشعار بطورِ نمونہ درج ہیں:۔

پیوستہ چوں مسافرِ دریا کنارہ جوست — در عشق او کسے کہ بود آشنائے ما
بفرزندان مردمِ دل غلط بستم، ندانستم — کہ ہرگز دیگرے مالک نگردد شعرِ تضمیں را
گر بود خورشید روے در نظر تا روزِ حشر — مے تواں بے آب و ناں مانند عیسیٰ زیستن

(۱۵) تمیز[3]۔ صاحب دیوان سری گوپال برہمن (۱۱۴۷ھ) المعروف بہ آفتاب زادہ۔ ہندی اور فارسی دونوں زبانوں میں ماہر تھا۔ متھرا کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی۔ یہ شعر اس کے ہیں:۔

رفتی و جلوۂ تو نہ رفت از برم ہنوز — یک خرمنِ گل است ز پا تا سرم ہنوز
یک جرعہ مے بیادِ تو خوردم برنگِ گل — خونِ بہار مے چکد از ساغرم ہنوز

---

[1] گلِ رعنا (بانکی پور۔ ج ۸۔ ص ۱۳۲)

[2] روزِ روشن۔ ص ۱۱۳۔ سفینۂ خوشگو۔ ج ۳ (بانکی پور۔ ج ۸۔ ص ۱۱۲)، تذکرۂ عشقی (سپرنگر ص ۲۱۲)، گلِ رعنا (بانکی پور۔ ج ۸۔ ص ۱۳۰)

[3] روزِ روشن۔ ص ۱۳۵، خوشگو۔ ج ۳ (بانکی پور۔ ج ۸۔ ص ۱۱۳)

(۱۶) مخلص[1]۔ انبے داس (۱۱۴۲ھ) اروڑہ ساکن لاہور۔ بٹالے میں نواب ابوالبرکات خان صوفی کا منشی تھا۔

(۱۷) اُلفت[2]۔ لالہ اجاگر چند کایستھ (۱۱۴۷ھ) عظیم آبادی۔ پہلے غربت تخلص کیا کرتا تھا اس کے اشعار پر میر محمد عالم تحقیق نے نظر ثانی کی نشترِ عشق میں یہ اشعار اس کی طرف منسوب ہیں:۔

گشت گل جام شراب و شد دل بلبل کباب | کیست یا رب درچمن امروز مہمان بہار
در آمد شام غم در سینہ حسرت نام مہمانے | ز داغ دل کشیدم بے تکلف پیش او خوانے

(۱۸) شہود[3]۔ بابو بالمکند (۱۱۴۷ھ) رائے عالم چند کا رشتہ دار تھا اور مانک پور الہ آباد کا رہنے والا تھا۔ خوشگو نے پٹنے میں اس سے ملاقات کی خان آرزو شہود کی تمیز اور دانشمندی کی بہت تعریف کرتا ہے۔ یہ شعر اس کا ہے:

مکن اشک مرا بے قدر اے مژگاں ترحمے | بریں طفلِ غذا پروردۂ خون جگر رحمے

(۱۹) حضوری[4]۔ گوربخش (۱۱۴۷ھ) میر معصوم مشرب کا شاگرد تھا۔ آخر میں مرزا بیدل کی شاگردی اختیار کی۔

(۲۰) ندرت[5]۔ لالہ حاکم چند (۱۱۴۷ھ) بڑا شاعر تھا۔ بھگوت کا منظوم ترجمہ، مثنوی ذرہ و خورشید اور ساقی نامہ اس کی تصانیف ہیں۔

(۲۱) موزوں[6]۔ راجا رام نراین عظیم آبادی (متوفی ۱۱۷۷ھ) شاعر اور شعرا کا

---

[1] خوشگو۔ ج ۳ (بانکی پور۔ ج ۸۔ ص ۱۱۳)؛ گل رعنا (بانکی پور۔ ج ۸۔ ص ۱۳۲)

[2] خوشگو (بانکی پور۔ ج ۸۔ ص ۱۱۴)؛ گل رعنا (بانکی پور۔ ج ۸۔ ص ۱۲۹)؛ روز روشن۔ ص ۶۸؛ نشترِ عشق (قلمی) ج ۱۔ ق ۲۷ [3] خوشگو۔ ایضاً؛ مجمع النفائس (قلمی) ص ۸۷۴؛ گل رعنا (بانکی پور ج ۸۔ ص ۱۳۱) [4] خوشگو ایضاً۔ گل رعنا ایضاً۔ روز روشن۔ ص ۱۸۱ [5] خوشگو و گل رعنا

[6] ایضاً؛ نشترِ عشق (قلمی) ج ۲۔ ق ۶۴؛ گلزار ابراہیم قلمی (سپرنگر ص ۲۵۶)

قدر دان تھا۔ کہتے ہیں یہ شعر اسی کا ہے ؎

محروم ماند از تو لب تشنۂ حسین ای آب خاک شو کہ ترا آبرو نماند

یہ اشعار بھی اسی کے ہیں :-

خون در جگر نماند و خدنگ تو می رسد حیف است این کہ تشنہ رود میہمان ما

ضعیف نالیم آخر بکار من آمد کہ یار از اثر نالہ ام شناخت مرا

می خواستم کنم دل و جاں را نثار دوست حیف است این کہ ہر دو نیاید بکار دوست

(۲۲) خاکستر[۵۱] منشی سرب سکھ کایستھ (۱۱۴۷ھ)

(۲۳) مخلص - انند رام (متوفی ۱۱۶۴ھ) اپنے زمانے کا بہت بڑا فاضل تھا۔ اس کا حال مرآۃ الاصطلاح کے بیان میں لکھ آئے ہیں جس میں اس کی شاعری پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ مخلص ایک متوسط درجے کا شاعر تھا اور ہم اسے دوسرے درجے کے شعرائے فارسی میں شمار کر سکتے ہیں۔ مرآۃ الاصطلاح فن لغت میں اس نے خوب لکھی ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھو اورنیٹل کالج میگزین بابت فروری ۱۹۲۹ء)

(۲۴) عشرت[۵۲] - جکشن (۱۱۶۴ھ) از شاگردان خان آرزو - آرزو کہتا ہے : "تخیلے جوان اہلے ست" مثنوی "سیتا رام" اس کی تصنیف ہے۔ ایک ساقی نامہ بھی اس کی طرف منسوب ہے۔ ایک قصیدے میں لکھتا ہے ؎

"گرچہ ہندویم بود لبریز عشق او دلم"

یہ شعر اس کے ہیں :-

عشرت ز تو صیاد طمع کردہ رہائی بر سادگیش خندہ زود چاک قفسہا

---

۵۱ خوشگو ایضاً

۵۲ مجمع النفائس (قلمی) ص ۶۴۸؛ سپر نگر ص ۱۵۸؛ گل رعنا ایضاً؛ دیو- ج ۲ - ص ۷۱۴

کمتر از یک قطرۂ خونم بچشم روزگار　　مے توانم دل شدن عشق ار دہد پہلو مرا
رہین منت بخت خودم کہ در ہمہ عمر　　بکوے بادہ فروشاں مرا گذر کردہ است
دست شوقم ہوس جیب دریدن دارد　　جامہ از بہر من بی سروپا قطع کنید

(۲۵) خوشگو[1] - بندرابن داس (متوفی ۱۱۷۰ھ) از شاگردان سرخوش. تذکرۂ خوشگو اسی کی تصنیف ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی ابتدائی تعلیم کے بعد جو ہنگیم بیراگی اور سدانند "بے تکلف" کے پاس حاصل کی - ملازمت اختیار کر لی تھی - اس حیثیت سے اس نے ہندستان کے بہت سے بڑے بڑے شہروں میں قیام کیا اور وہاں کے تمام شعرا سے ملاقات کا اتفاق ہوا - اس کے تذکرے کی یہی خوبی ہے کہ شاعر نے اپنے اکثر معاصرین کے حالات اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر لکھے ہیں - خان آرزو مجمع النفائس میں لکھتے ہیں " بہر حال شعر او بسیار خوب می گوید و بعض تازگیے مضمون بدست او افتادہ "

خوشگو کا اپنا بیان ہے کہ وہ حکیم شفائی کی طرز کا متبع ہے - چنانچہ "سفینہ" میں لکھتا ہے :- " خان صاحب و قبلۂ آرزومنداں مدظلہ، در ایام گذرانیدن مشق شعر بہ فقیر راقم خوشگو مقرر فرمودند کہ طبیعت تو بطرز شفائی مناسبت تمام دارد - بہتر ازیں سر مشقے نخواہی یافت و بارہا مبالغہ از حد گزرانیدہ بر مسودات فقیر نوشتہ کہ صائبانہ چرا می گوئید؟ شفائی! شفائی! شفائی! چوں فقیر اکثر تتبع دیوان حکیم نمودہ، ازیں جہت او را استاد خود می داند " شفائی کی شاعری کی خصوصیت استعارہ ہے - چنانچہ خوشگو اپنے

---

[1] مجمع النفائس (قلمی) ص ۱۹۰ : گل رعنا ایضاً : مخزن الغرائب (قلمی مملوکہ پروفیسر شیرانی صاحب) روز روشن ص ۲۰۶ : انیس العاشقین (قلمی پنجاب یونیورسٹی) ج ۱ - ق ۱۷۶

سفینہ میں لکھتا ہے "حکیم شفائی سرخیل قافلۂ استعارہ بندان است. طرز استعارہ را بعرش الکمال رسانیدہ" خوشگو کا کلام ہمارے پاس موجود نہیں۔ اس لیے ہم کوئی قطعی رائے قائم نہیں کرسکتے۔ شاعر چونکہ خان آرزو کا شاگرد تھا اس لیے ان کی رائے اس بارے میں خاص وقعت رکھتی ہے۔ وہ اپنے تذکرۂ مجمع النفائس میں فرماتے ہیں:-

"بندرابن داس خوشگو از ماہران لب و لہجۂ ارباب لسان است"

ہماری رائے میں خوشگو کی شہرت کا دارومدار صرف اس کے تذکرے پر ہے جو جامع اور مفصّل ہونے کے علاوہ بہت حد تک صحیح بھی ہے نہ کہ شاعری پر خوشگو کی شاعری کا نمونہ یہ ہے:-

دہلی خوش است لیک ز یار ایں چنیں خوش است
یار ایں چنیں خوش ست و دیار ایں چنیں خوش ست

برائے یار تعظیم رقیباں ہم ضرور افتد
بشوق بُت نخستیں سجدہ پیش برہمن کن

آواز تیشہ امشب در بے ستوں نیامد
شاید بخواب شیریں فرہاد رفتہ باشد

موجود گر نبودیم، معدوم ہم نبودیم
امروز از کجائیم گر در عدم نبودیم

(۲۶) شوقؔ[۱] ۔ لالہ نن سکھ رائے (سن۱۱۷۰ھ)

(۲۷) موبدؔ[۲] ۔ پنڈت زندہ رام (متوفی نزد ۱۱۷۳ھ) صاحب دیوان

---

[۱] سپرنگر۔ ص ۱۴۷ [۲] ایضاً ص ۵۰۴: ریو۔ ج ۲۔ ص ۷۱۴

(۲۸) آرام[1]۔ سندر داس (متوفی بعد از ۱۱۷۴ھ) مصنف مثنوی سسّی پنوں

(۲۹) امتیاز[2]۔ راجا دیال (۱۱۷۴ھ)

(۳۰) ثروت[3]۔ جگل کشور (۱۱۷۴ھ) وکیل ناظم بنگالہ

(۳۱) عزت[4]۔ سنگھم لال (۱۱۷۴ھ)

(۳۲) نشاط[5]۔ رائے پھکنی مل (۱۱۷۴ھ)

(۳۳) معنی[6]۔ رائے بجو مل (۱۱۷۴ھ) برادر دیال امتیاز

(۳۴) عاشق[7]۔ شیورام (متوفی ۱۱۷۹ھ) نور العین واقف ایک خط میں اس کی تعریف کرتا ہے۔

(۳۵) موزوں[8]۔ راجا مدن سنگھ اٹاوی کالستھ (متوفی ۱۱۷۹ھ) نشترِ عشق میں یہ اشعار اس کی طرف منسوب ہیں:۔

بے جا کنند غمزدگاں شکوۂ فلک ۔۔۔ موزوں چہ فتنہ ہاست کہ در چشم یار نیست

آشنائے گریۂ بے اختیار م کردہ اند ۔۔۔ بے تکلف روکش ابر بہار م کردہ اند

مرا دلے ست کہ گردید از جہاں فارغ ۔۔۔ دلے نشد ز ہوا دارئ بتاں فارغ

از اخگر و سپند طپیدن خریدہ ایم ۔۔۔ از آبشار و آب چکیدن خریدہ ایم

بیان حال دل خویشتن چگونہ کنم ۔۔۔ ز بے دماغی آں کجکلاہ مے ترسم

(۳۶) تازہ[9]۔ لال جی (۱۱۸۱ھ)

ایں کہ می گوید بگوش ما صدائے نوبتے ۔۔۔ عمر شاہاں می زند ہر لحظہ کوس رحلتے

---

[1] کپورتھلہ لائبریری کی انگریزی فہرست از پروفیسر متر۔ ص ۱۰۷ [2] مقالات الشعرا (سپرنگر۔ ص ۱۵۴) [3] ایضاً [4] مقالات الشعرا (سپرنگر۔ ص ۱۵۰) [5] مقالات الشعرا (سپرنگر۔ ص ۱۶۰) [6] ایضاً (سپرنگر ص ۱۵۹) [7] گل رعنا (بانکی پور۔ ج ۸۔ ص ۱۳۲) [8] ایضاً [9] گل رعنا (بانکی پور۔ ج ۸۔ ص ۱۳۰) روز روشن ص ۱۲۴

(۳۷) دبیر[1]۔ لالہ دولت رائے برہانپوری (سنہ ۱۱۸۱ھ)

(۳۸) قدرت[2]۔ لالہ مشتاق رائے کھتری (سنہ ۱۱۸۱ھ)

(۳۹) ذہین[3]۔ لالہ روپ نراین (سنہ ۱۱۸۱ھ) آزاد بلگرامی کا شاگرد تھا۔

(۴۰) مشربی[4]۔ بھورے سنگھ اکبرآبادی (متوفی بعد از سنہ ۱۱۸۱ھ)

(۴۱) منشی[5]۔ لالہ فتح چند برہانپوری (سنہ ۱۱۸۱ھ) صاحب مثنویات در تتبع شوکت بخاری۔

(۴۲) ہنر[6]۔ گیان رائے (متوفی سنہ ۱۱۹۰ھ) آزاد بلگرامی کا شاگرد تھا۔

سنہ ۱۱۹۷ھ شاگردان مرزا فاخر مکین:

(۴۳) انیس[7]۔ موہن لعل، صاحب دیوان، صاحب انیس الاحبا

(۴۴) دیوانہ۔ لالہ سرب سکھ

(۴۵) ولی۔ پنجاب رائے

سنہ ۱۱۹۷ھ۔ شاگردان مرزا فاخر مکین:

(۴۶) مختار۔ سیتل داس

(۴۷) مطیع۔ رام بخش

(۴۸) بسمل۔ بھگوان داس

(۴۹) عزیز۔ شتاب رائے

(۵۰) بیمار۔ میدنی لال

(۵۱) مائل۔ مٹھولال

(۵۲) رفیق۔ داتارام

(۵۳) سائل۔ دیبی پرشاد

---

[1] گل رعنا ایضاً [2] گل رعنا (بانکی پور۔ ج ۸۔ ص ۱۳۲) [3] گل رعنا و روز روشن ص ۲۳۰ [4] مخزن الغرائب قلمی؛ گل رعنا (بانکی پور۔ ج ۸۔ ص ۱۳۳) [5] گل رعنا ایضاً [6] گل رعنا (بانکی پور۔ ج ۸۔ ص ۱۳۴) [7] انیس الاحبا بحوالہ سپرنگر

سرب سکھ دیوانہ[1] (نمبر ۵۳)، اُردو، فارسی اور ہندی کا اچھا شاعر تھا۔ میر حیدر علی حیران اور جعفر علی حسرت اس کے شاگردوں میں سے ہیں۔ اس کے تین دیوان ہیں عشقیہ، دردیہ، شوقیہ کہتے ہیں مغلی وضع کو بہت پسند کرتا تھا۔ عام رائے یہ ہے کہ ۱۲۱۴ھ میں دنیاے فانی سے چل بسا۔ یہ اشعار اس کے ہیں:۔

گفتند از زبانِ تو با من پیامِ وصل ۔۔۔ باور نیایدم کہ پیام از زبانِ تست

بمن تو وعدہ نکردی وسادگیم ببین ۔۔۔ کہ عمرِ من بہ رہِ انتظار مے گزرد

من و دل ہر دو بر راہے ز ضعف افتادہ در ساعت

گہے من دستِ دل گیرم گہے دل دستِ من گیرد

عجب ست این کہ باآں ہمہ ربط آشنای ۔۔۔ چو بہ بینیم نہ پرسد چہ کسی و از کجای

از جفایت تا بکے از دیدہ خوں بارد کسے ۔۔۔ آخر ای جان کسے رحمے کہ جاں دارد کسے

(۵۴) خوش[2] ۔ انند گھن (۱۲۰۹ھ) ساکن کپنیل (اکبر آباد) فارسی اور ہندی میں ماہر تھا۔ باپ کی وفات کے بعد بندرابن میں مقیم ہو گیا۔ جہاں اس نے بھگوت اور رامائن کا منظوم فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس نے ایک اور مثنوی بھی لکھی جس کا نام "گجلاہ" ہے۔ ۱۲۰۹ھ جو سات جلدوں میں منقسم ہے۔ اس کی دوسری جلد انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔ ہمارا شاعر احمد شاہ دُرانی کے حملے میں مارا گیا۔

---

[1] روز روشن۔ ص ۲۲۵؛ انیس العاشقین (قلمی) ج ۱۔ ق ۱۸۴؛ خمخانۂ جاوید۔ ج ۳ ص ۲۱۷؛ شعرالہند؛ گلشن ہند علی لطف ص ۱۰۲۔ سپہر نگر ص ۲۲۱؛ ... ج ... ص ۱۳۰؛ ... فارسی ۔ ج ۱۔ ص ۶۲۴ ۔ تذکرہ شعرائے اردو کریم الدین۔ ص ۱۸۱

یہ شعر دمِ نزع اس کی زبان سے نکلا ؎

ای زخم نصیبان ترا عار ز مرہم قربان سر تیغ تو یک زخم دگر ہم

(۵۵) بہجت۔[1] لالہ ٹکارام (۱۲۱۲ھ) اس کے اکثر اشعار مذہبیات سے متعلق ہیں۔

(۵۶) شفیق۔ لچھمی نراین اورنگ آبادی کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہی۔ جہاں ہم نے اس کی مؤرخانہ حیثیت پر مختصر سا تبصرہ کیا تھا۔ شعر و شاعری میں وہ آزاد بلگرامی کے تلامذۂ خاص میں سے تھا۔ اُردو شعر کی اصلاح میر عبدالقادر مہربان سے لیتا تھا۔ شفیق بحیثیت شاعر بہت شہرت رکھتا ہی۔ اس کی شاعری کا نمونہ ہمارے پاس موجود نہیں، اس لیے کسی رائے کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ آزاد بلگرامی اور دیگر اربابِ علم کی آرا کی بنا پر ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ شفیق کا رتبہ شاعری میں بہت بلند ہو گا۔ اگرچہ اس کی مؤرخانہ حیثیت شاعرانہ حیثیت سے اعلیٰ معلوم ہوتی ہی۔ مخلص کی طرح شفیق بھی دوسرے درجے کے شعرا میں شمار کیا جاتا ہی اور فارسی کے ہندو شعرا میں بلند ترین لوگوں میں سے ہی۔ کچھ اشعار تذکروں میں ملتے ہیں جن میں سے بعض یہاں درج کیے جاتے ہیں ؎

برلب نازک او بوسہ تواں داد شفیق کہ مرا یاد کند باز بہ دشنامے چند

شنیدہ ام کہ بسوئے شفیق می آئی بیا بیا کہ دل و جاں نثار خواہم کرد

ز خارہائے مغیلاں پرست وادیٔ عشق شفیق آبلہ پا می روی خدا حافظ

جو اشعار نظر سے گزرے ہیں اُن میں شیرینی، روانی اور لطافت کافی حد تک موجود ہی۔

---

[1] ایشیاٹک سوسایٹی بنگال۔ عدد ۴۸۸

پانچواں باب



مُغل تہذیب کا دمِ واپسیں

(از ۱۲۲۱ھ تا عہدِ حاضر)

پانچواں باب

مُغل تہذیب کا دمِ واپسیں

(از سنہ ۱۲۲۱ھ تا عہدِ حاضر)

اسلامی حکومت کا آخری دور

گزشتہ باب میں ہم نے سنہ ۱۱۴۴ھ سے لے کر سنہ ۱۲۲۱ھ تک کے لٹریچر کا ذکر کیا تھا۔ اب سنہ ۱۲۲۱ھ سے لے کر موجودہ زمانے تک کے ادب پر تبصرہ کریں گے۔ اس عہد کے سیاسی حالات یہ تھے کہ اودھ کی حکومت اپنی پُرانی شان و شوکت کو کھو چکی تھی اور انگریز ملکی انتظام میں بیش از بیش دخیل ہو رہے تھے۔ تاآں کہ سنہ ۱۸۵۶ء میں ملکِ اودھ انگریزی مقبوضات میں داخل ہو گیا اور سنہ ۱۸۵۷ء میں تیموری خاندان کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی گُل ہو گیا اور دہلی اور اس کے مضافات بھی سرکارِ انگریزی سے متعلق ہو گئے۔

مُسلمانوں کے ہندو ملازم

جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں شاہانِ اودھ مغلیہ سطوت اور طاقت کا پاسنگ بھی نہ تھے تاہم حکومت کے خاتمے تک ان کے درباروں میں ہندو منشیوں اور متصدیوں کی بھرمار رہی۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی ہمیں ان درباروں میں بعض اعلیٰ درجے کے انشا پرداز ملتے ہیں۔ حیدرآباد، بھاولپور، بھوپال، ٹونک اور دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بھی یہی حالت رہی۔ بلکہ بعض ریاستوں میں تو آج سے بیس تیس سال

قبل تک فارسی زبان کا رواج رہا اور ہندو منشیوں کو بعض اہم مناصب ملتے رہے،

سکھ اور فارسی

انگریزوں کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سکھ قوم کے متعلق بھی کچھ اشارات کر دیے جائیں۔ یہ نہایت ہی تعجب کا مقام ہے کہ سکھوں میں بہت کم لوگ ایسے نکلے جنھوں نے فارسی زبان میں کچھ کتابیں لکھی ہوں۔ بدھ سنگھ منشی اور اس قسم کے ایک دو آدمی تو ملتے ہیں مگر جہاں تک ہمارا خیال ہے اس قوم میں فارسی زبان کی زیادہ اشاعت نہیں ہوئی۔ اس کے وجوہ ظاہر ہیں۔ سکھوں نے ابتدائے کار ہی سے پنجاب کی زبان کو اپنانا شروع کیا اور گورو گرنتھ صاحب کی زبان ہی ان کے نزدیک محبوب ترین زبان رہی۔ سیاسی تنازعات کی وجہ سے سکھوں اور مسلمانوں میں یک گونہ منافرت بھی موجود تھی لہٰذا فارسی جو کہ مسلمان حکومت کی زبان تھی ان میں کیسے مقبول ہو سکتی تھی۔ مزید برآں سکھ مذہب زیادہ تر پنجاب کی دیہاتی آبادیوں میں پھیلا۔ جہاں کے لوگ اکثر زمیندار اور زراعت پیشہ تھے اور تعلیم و تعلم ان کا کوئی محبوب مشغلہ نہ تھا۔

ظفر نامہ گورو گوبند سنگھ

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ فارسی کے ساتھ سکھوں کا سلوک شروع سے ہی معاندانہ تھا۔ گورو نانک[1] جی نے اپنے کلام میں فارسی الفاظ کا بکثرت استعمال کیا ہے اور دو تین اشعار تو خالص فارسی کے ہیں۔ گورو گوبند سنگھ صاحب کی فارسی واقفیت اچھی خاصی معلوم ہوتی ہے۔ ظفر نامہ کے نام سے ایک رسالہ ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس میں فارسی کے اشعار ہیں۔ اگرچہ باعتبار شعر اکثر اشعار وزن اور قافیہ کے مطابق صحیح نہیں مگر فارسی کی نثری قابلیت کا ان سے کچھ نہ کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ

---

[1] دیکھو گورو نانک صاحب کی فارسی تعلیم دیکھو ضمیمہ (ب)

مہاراجا رنجیت سنگھ اور فارسی

پنجاب میں سکھوں کی حکومت سلطنتِ مغلیہ کی ویران بنیادوں پر کھڑی کی گئی تھی اس لیے مہاراجا رنجیت سنگھ نے گزشتہ روایات کو بہت حد تک برقرار رکھا۔ مہاراجا کا دربار ہندو مسلمان اہلِ علم کا مرجع تھا اور اس سلسلے میں مہاراجا کی فیاضی کے بہت سے واقعات نقل کیے جاتے ہیں۔ حکیم عزیزالدین انصاری، فقیر نورالدین، مصر بیلی رام، دیوان امرناتھ اکبری، دیوان دینا ناتھ، دیوان گنگا رام وغیرہ اس دربار کے اکابر علما میں سے ہیں۔ دفتری کاروبار فارسی میں انجام پاتا تھا۔ روزنامچے اور واقعات کی مسلیں فارسی میں مرتب ہوتی تھیں اور اسی زبان میں انگریزی حکومت کے ساتھ خط و کتابت بھی ہوتی تھی اور معاہدے لکھے جاتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری[1] میں جو روزنامچے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت حد تک مغلوں کی وقائع نویسی کے طریقے کو برقرار رکھا گیا ہے سکّوں پر فارسی عبارت کندہ ہوتی تھی جسا سنگھ کلال نے اپنے سکّوں پر یہ عبارت کندہ کرائی تھی ؎

سکّہ زد در جہاں بفضلِ اکال ملکِ احمد گرفت جسا کلال

سکھوں کے عہد میں مہاراجا رنجیت سنگھ کا دربار اہلِ علم کے لیے جاذبِ توجہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کے علاوہ بعض اچھے ہندو مصنّف بھی پیدا ہوئے مثلاً منشی سوہن لال مصنّف عمدۃ التواریخ، دیوان امرناتھ اکبری، پنڈت کاہر (مصنّف مجمع التواریخ)، منشی دیارام در، کرنل مہان سنگھ، دیوان کرپارام اور دیوان اننت رام۔ آخری دو تین مصنّف کشمیر سے متعلق ہیں۔ دیوان بختمل سکھوں کے زمانے کا ایک بلند پایہ مصنّف تھا۔ ریاست جمّوں نے

---

[1] اس کے علاوہ۔

بھی ایک دو ہندو مصنّف پیدا کیے ہیں جن کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔ دیوان اجودھیا پرشاد نے بھی وقائع جنگ سکھاں کے نام سے کتاب لکھی ہے۔

انگریزوں کی حکومت سکھوں کے زوال اور خاتمے کے بعد انگریز تمام پنجاب پر قابض ہو گئے اور اُن کی سلطنت پشاور سے راس کماری تک اور بلوچستان سے برما تک پھیل گئی۔ ہم پچھلے باب میں کہہ آئے ہیں کہ انگریز افسروں کی توجہ اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے اکثر ہندو منشیوں نے تاریخ اور دوسرے فنون پر کتابیں لکھیں لیکن اس زمانے میں فارسی کا زوال اور خاتمہ ہوا اور اس کے بجائے انگریزی زبان کی سرپرستی کا آغاز کیا گیا اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان اسباب و علل کا مختصراً تذکرہ کیا جائے جو اس انحطاط میں ممد و معاون ہوئے۔

تعلیمی حکمت عملی ہم سب سے پہلے حکومت انگریزی کی تعلیمی حکمت عملی پر نظر ڈالتے ہیں۔ ہوول[۱] نے "برطانوی ہندستان میں تعلیم" کے موضوع پر لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ "تعلیم کو ابتدائے کار میں بالکل نظرانداز کر دیا گیا۔ بعد ازاں اس کی مخالفت کی گئی اس کے بعد غلط بنیادوں پر (جنہیں سب عقلا آج غلط کہہ رہے ہیں) شروع کی گئی اور آخرکار اس انداز پر آ سے لایا گیا جس پر آج ہے"۔ یہ حقیقت میں انگریزوں کی تعلیمی حکمت عملی کی ایک مختصر مگر جامع تعریف ہے۔ سنہ ۱۸۱۳ء تک تعلیم، حکومت کے فرائض میں متصوّر نہ ہوتی تھی۔ لارڈ منٹو[۲] نے سنہ ۱۸۱۱ء میں اور لارڈ موئرا[۳] نے سنہ ۱۸۱۵ء میں ڈائرکٹران کمپنی کو اس اہم مسئلے کی طرف متوجہ کیا۔ سنہ ۱۸۱۴ء میں ڈائرکٹران نے اس ضرورت کو تسلیم

---

۱ SELECTIONS FROM EDUCATIONAL RECORDS SHARP, I, P 2.

۲ ایضاً ص ۱۹ ۳ ایضاً ص ۲۲

کیا اور اِدھر اُدھر کچھ کالج اور سکول کھولے گئے جن میں فارسی، عربی اور سنسکرت کی تعلیم دی جاتی تھی جن کی تفصیل فشر صاحب[1] کے روزنامچے میں ملے گی۔

فارسی کی درسگاہیں لیکن اس سے بہت قبل بعض زمانہ ول اور ہمدرد افسران کمپنی نے اپنی ذمّہ داری پر (اور بعض اوقات اپنے صرف پر) ہندستانیوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی سنہ ۱۷۸۱ء میں وارن ہیسٹنگز نے کلکتے میں ایک مدرسہ، مدرسہ عالیہ[2] کے نام سے کھولا جس کی غرض یہ تھی کہ مسلمان نوجوانوں کو فارسی عربی کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ حکومت کے مناصب اور عہدوں میں حصّہ لے سکیں جن پر ہندو بوجہ اپنی ہشیاری کے فایز ہو رہے تھے سنہ ۱۷۹۱ء میں ولیم ڈنکن نے بنارس میں ہندو سنسکرت کالج کا افتتاح کیا جس میں سنسکرت کے علاوہ فارسی کی تعلیم بھی ہوتی تھی سنہ ۱۷۸۴ء میں سر ولیم جونز نے ایشیاٹک سوسایٹی بنگال[3] کی بنیاد رکھی جس کی غرض یہ تھی کہ مشرقی علوم میں تحقیق و تدقیق کے شوق کو ترقی دی جائے سنہ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ولزلی نے فورٹ ولیم کالج کھولا جس میں ملازمین کمپنی کو فارسی، عربی، ہندستانی اور بعض اور علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کالج کے مشہور اساتذہ میں ڈاکٹر گلکرائسٹ، جان بیلی، ولیم کرک پیٹرک، فرانسس گلیڈون اور ولیم بنجامن ایڈمانسٹن تھے جن میں سے ہر ایک ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔

سنہ ۱۸۱۴ء سے لے کر سنہ ۱۸۳۵ء تک کا زمانہ مشرقی علوم کی حوصلہ افزائی کا زمانہ تھا۔ فارسی، عربی، سنسکرت کی تعلیم کے لیے ایک خاص رقم علیحدہ کر دی گئی تھی جس سے طلبہ کو وظائف دیے جاتے تھے اور ان زبانوں کی مشہور کتابوں

---

[1] ایضاً ص ۱۸۵ [illegible]

[3] CAREY, GOOD OLD DAYS OF JHON COMPANY, I. 417

کو طبع کرایا جاتا تھا۔

آگرہ کالج اور دہلی کالج

اس زمانے میں جو کالج کھولے گئے ان میں سے ہم صرف دو کا ذکر کریں گے یعنی آگرہ کالج[۱] اور دہلی کالج[۲]۔ اس لیے کہ ان کالجوں میں بعض ہندو طلبہ نے فارسی زبان کی تعلیم پائی اور بعد ازاں وہ مصنف بنے۔ آگرہ کالج ۱۸۲۲ء میں گنگا دھر پنڈت آنجہانی کے عطیے سے کھولا گیا۔ کمیٹی نے تجویز کی کہ اس کالج میں فارسی، عربی اور سنسکرت کی تعلیم دی جائے۔ ۱۸۲۷ء کے قریب انگریزی کی ایک جماعت بھی کھول دی گئی۔ یہ کالج بلحاظ تعلیم اور نتائجِ علمی بہت مشہور رہا ہے۔ سیل چند مصنفِ تفریح العمارات اور رمانک چند مصنف عمارات الاکبر اسی کالج کے نونہال تھے۔

دہلی کالج ۱۸۲۷ء میں کھولا گیا۔ اس کالج سے بھی قابل طلبہ نکلے[۳]۔

فارسی کے دو حریف

ان حالات میں ایسے دو حریف میدان میں اُتر پڑے جن کے مقابلے کی تاب فارسی نہ لا سکی اور آخرِ اُسے زوال کی آفت سے دوچار ہونا پڑا۔ ہماری مراد ایک تو انگریزی زبان سے ہے اور دوم ورنیکلر زبانوں سے۔ بعض سیاسی مقتضیات نے ایسا رنگ اختیار کیا کہ فارسی کی بجائے ان زبانوں کی ضرورت اور اہمیت زیادہ ہوتی گئی۔ کیونکہ انگریزی پسند اصحاب کا منشا یہ تھا کہ فارسی کو عدالتی زبان کے طور پر برقرار نہ رکھا جائے اور مشرقی علوم کی بجائے مغربی علوم کی ترویج ہو اور ان دونوں صورتوں میں انگریزی کو ذریعۂ اظہارِ خیال قرار دیا جائے۔

چارلس گرانٹ نے ۱۷۹۲ء[۴] میں ہندستانیوں کی اخلاقی حالت کی

۱؎ سیلیکشنز ص ۱۰۵ وما بعد ۲؎ ایضاً

۳؎ اس کے لیے دیکھو مولانا عبدالحق کی کتاب "مرحوم دہلی کالج" ۴؎ سیلیکشنز ج ۱ ص ۸۱ وما بعد

زبونی پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ ہندستانیوں میں انگریزی تعلیم کو رائج کیا جائے کیونکہ "تاریکی کا علاج روشنی ہے اور جہالت کا مداوا علم"۔ مگر اس وقت اس تجویز پر توجہ نہ کی گئی۔

۱۸۱۴ء سے لے کر ۱۸۳۵ء تک انگریزی پسند اور مشرق پسند اصحاب میں بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس جھگڑے کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ ملک میں ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی تھی جو چاہتی تھی کہ مشرقی علوم کی بجائے انگریزی تعلیم کو رائج کیا جائے۔ راجا موہن رائے (جو خود فارسی عربی کے عالم تھے) اس گروہ کے پیشوا تھے۔ جب حکومت نے کلکتے میں ایک ہندو سنسکرت کالج کے افتتاح کا خیال ظاہر کیا تو راجا موہن رائے نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور درخواست کی کہ سنسکرت اور دیگر مشرقی علوم کی بجائے انگریزی کو رواج دیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ مسیحی مبلغوں نے بھی انگریزی کو رواج دینے کے لیے بہت سے کالج کھولے۔

۱۸۲۳ء میں حکومت نے جو "کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن" قائم کی تھی وہ بھی کوئی زیادہ تعلیمی کام نہ کر سکی۔ اس لیے کہ اس کے ارکان میں مشرقی اور مغربی علوم کے مسئلے کے متعلق زبردست اختلاف موجود تھا۔ لارڈ میکالے نے ۱۸۳۵ء میں اس کمیٹی کی صدارت قبول کی لیکن اس سے بوجہ اس اندرونی اختلاف کے کوئی خاطر خواہ کام نہ ہو سکا۔ آخر معاملہ حکومت کے سامنے پیش ہوا جس کے سلسلے میں لارڈ میکالے نے اس مبحث پر وہ شذرہ لکھا جسے بے حد شہرت حاصل ہے۔ اس نے اس "نوٹ" میں انگریزی تعلیم کے رواج پر زور دیا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس ضمن میں اس نے مشرقی علوم وفنون کا بھی استخفاف کیا۔ بالآخر میکالے کی مسلّمہ فصاحت نے فیصلہ کن اثر ڈالا اور انگریزی تعلیم حکومت کے مقاصد عظیمہ

میں داخل ہو گئی۔

فارسی کا اخراج ۱۸۲۹ء میں فیصلہ ہوا کہ فارسی کی بجائے انگریزی کو دفتری زبان قرار دیا جائے اور عدالتوں میں اسی کو رائج کیا جائے لیکن اس پر جلد عمل نہ ہو سکا تا آں کہ ۱۸۴۲ء میں فارسی کو اس حیثیت سے ختم کر دیا گیا۔

اسی کے ساتھ ہی ورنیکلر زبانوں کو آہستہ آہستہ بہت ترقی ہوتی گئی اور غیر سرکاری حلقوں میں بھی نجی معاملات کو فارسی کی بجائے اردو یا ہندی میں سرانجام دینے کی طرف رجحان پیدا ہو گیا۔

ہندوؤں نے انگریزی حکمت عملی کے منشائے اصلی کو پا لیا اور ان احکام کے صادر ہوتے ہی انگریزی کی جانب متوجہ ہوتے گئے چنانچہ اس عہد کے اکثر مصنفین انگریزی زبان سے واقف نظر آتے ہیں۔ آگے چل کر ہم بتلائیں گے کہ ان کی تصنیفات میں کہاں تک انگریزی تعلیم کے اثرات موجود ہیں۔

اگرچہ ۱۸۴۲ء کے بعد فارسی رو بہ انحطاط ہو گئی لیکن شعر و شاعری کا ذوق، فارسی ادب اور تاریخ کے ساتھ وابستگی اکثر کایستھ اور برہمن خاندانوں میں موجود رہی۔ ہندو طلبہ ۱۹۰۰ء تک اختیاری مضامین میں سے فارسی کو ترجیح دیتے تھے۔ آرنلڈ صاحب ۱۸۵۶ء میں پنجاب کی تعلیمی حالت پر رپورٹ[1] کے دوران میں رقمطراز ہیں:-

> کہ "فارسی اور قرآن" کے مدارس ملک کی حقیقی تعلیمی درسگاہیں ہیں۔ ان درسگاہوں میں مسلمانوں کی نسبت ہندو طالب علم زیادہ تعلیم حاصل کرتے ہیں"۔

---

[1] میکیگنر حصۂ دوم (لاہور) ص ۲۹۰

پھر لکھتے ہیں:۔

"کہ ہندوؤں کا اتنی کثرت کے ساتھ فارسی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اُن سکولوں میں داخل ہونا تعجب خیز ہے!"

دورِ آخری کے فاضل ہندو

۱۸۵۷ء سے لے کر اس وقت تک ملک میں انگریزی زبان کا چرچا ہے مگر ہندوؤں میں فارسی داں اصحاب کی پھر بھی کمی نہیں۔ عہدِ حاضر میں لالہ رتن ناتھ سرشار، برج نراین چکبست (متوفی ۱۹۲۶ء)، سوامی رام تیرتھ (متوفی ۱۹۰۶ء)، لالہ بانکے دیال دہلوی (متوفی ۱۸۵۱ء)، پنڈت راج ناتھ (متوفی ۱۸۴۲ء)، منشی پیارے لال رونق (تلمیذ داغ)، راج نراین ارمان دہلوی، منشی دوارکا پرشاد اُفق، مہاراج بہادر برق، پنڈت نراین پرشاد بیتاب ڈراما نویس، منشی پریم چند، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، لالہ تلوک چند محروم، منشی نوبت رائے نظر، منشی دلورام کوثری، پنڈت تربھون ناتھ ہجر (مدیر اودھ پنچ)، لالہ سری رام ایم۔ اے، پنڈت جوالا پرشاد برق، منشی درگا سہائے سرور، منشی اقبال ورما سحر، منشی دیبی پرشاد سحر، منشی جگت موہن لال رواں، پنڈت دیا نراین نگم (مدیر زمانہ) وغیرہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو اُردو، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں سے واقف ہیں۔

پنڈت موتی لال نہرو نے ۱۹۲۹ء میں کانگرس کے اجلاس کلکتے میں جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا اس میں فارسی کے بہت سے اشعار پڑھے۔ سر تیج بہادر سپرو جو ہندستان کے لبرل لیڈر ہیں، فارسی زبان کے ماہر ہیں۔ ان کے علاوہ رائے بہادر راجا نرندر ناتھ اور ڈاکٹر گوکل چند نارنگ بھی فارسی سے خاص شغف رکھتے ہیں۔

لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے اور بہت ممکن ہے کہ فارسی آیندہ بیس پچیس سال تک ہندو تو کیا مسلمانوں کے گھروں سے بھی نکل جائے اس لیے کہ مغرب کے علوم وفنون بڑی تیزی کے ساتھ ملک میں پھیل رہے ہیں اور خود مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس کا یہ خیال ہے کہ فارسی یا دیگر مشرقی زبانوں میں وقت صرف کرنا بیکار ہے۔ تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ. فارسی رخصت ہو رہی ہے۔ اُردو کا خدا حافظ!

ہندوؤں میں فارسی کا بیج اکبر اور ٹوڈرمل نے بویا۔ یہ درخت مسلسل تین سو سال پھولتا پھلتا رہا۔ اسی کے 'باغ بے خزاں' سے میں نے اس کتاب میں گل و لالہ اکٹھے کیے ہیں مگر دنیا سرائے فانی ہے یہاں کسی شے کو بقا نہیں، فارسی کو کیا بقا ہوتی۔ تقریباً تین صدیوں کے بعد اس باغستان کو دائمی پت جھڑ کا سامنا ہو رہا ہے جس کے بعد آمدِ بہار کی توقع امید موہوم ہے۔

منشی نولکشور

ان بے شمار قابلِ قدر خدمات کے پیشِ نظر جو منشی نولکشور[1] اور ان کے مطبع نے فارسی زبان کو زندہ اور عام کرنے میں انجام دی ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ منشی نولکشور اور اُن کے مطبع کا بھی یہاں کچھ ذکر کیا جائے۔

منشی نولکشور کی ولادت موضع ساسنی ضلع علی گڑھ میں ہوئی۔ منشی جمنا داس بھارگو ان کے والد ایک خوش حال زمیں دار تھے جن کے نولکشور کے علاوہ چار بیٹے تھے۔ نولکشور کی ابتدائی تعلیم اپنے گانو میں ہوئی اس کے بعد انھیں آگرہ کالج میں داخل کیا گیا جہاں انھوں نے پانچ سال تک تعلیم حاصل کی انھوں نے اسی زمانے میں اخبار آگرہ سفیر میں بہت سے اصلاحی مضامین لکھے۔ جن

---

[1] یہ حالات سیر المصنفین حصّۂ دوم اور قاموس المشاہیر حصّۂ دوم سے لیے ہیں۔

کے صلے میں حکومت نے ان کو وظیفہ عطا کیا۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد نولکشور لاہور آگئے اور "کوہ نور" پریس میں ملازم ہوگئے۔ حُسنِ کارکردگی اور معاملہ فہمی کے طفیل منشی ہرسکھ رائے مالکِ مطبع کا کافی اعتماد حاصل کرلیا اور تھوڑے عرصے میں مطبع کے مختارِ کُل بن گئے۔

کچھ عرصے کے بعد منشی نولکشور لاہور کو چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے وہاں انھوں نے اپنا مطبع قائم کیا۔ ان کا تجربہ اس قدر وسیع تھا کہ وہ تھوڑے دنوں میں بہت وسیع کاروبار کے مالک ہوگئے۔ ان کے مطبع کی شاخیں اطراف ملک میں قائم ہوگئیں۔ لاہور، کانپور اور لکھنؤ میں ان کا کام بہت بڑے پیمانے پر تھا۔

آپ نے حکومت ہند کے بہت سے اعزاز حاصل کیے۔ جب امیر عبدالرحمٰن مرحوم والیٔ افغانستان ہندستان میں وارد ہوئے تو انھوں نے منشی نولکشور کو بھی اپنے پاس بلایا اور بہت محبت کا اظہار کیا۔

اس زمانے میں فارسی علوم میں انحطاط آچکا تھا اور فارسی پڑھنے والے کتابوں کی کمی سے بددل ہوکر اس کو چھوڑ رہے تھے بلکہ اس زمانے سے بہت قبل ۱۸۱۱ء میں لارڈ منٹو نے اپنی تعلیمی یادداشت میں اس علمی انحطاط اور فقدان کتب پر بڑے زوردار انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔

ہندستان میں پریس کا رواج ہوچکا تھا جس کی وجہ سے قلمی کتابوں کی کتابت وغیرہ خارج از استعمال ہورہی تھی۔ عربی فارسی کتابیں کچھ تو انگریز اہلِ علم کے ہاتھوں یورپ پہنچ رہی تھیں اور بعض بے علم مالکانِ کتب کے ہاتھوں ضائع ہورہی تھیں۔ ایسے زمانے میں منشی نولکشور کو فارسی کو زندہ کرنے کے ارادے سے یہ خیال پیدا ہوا کہ عربی فارسی کتابوں کو زیورِ طبع سے آراستہ کریں اور ارزاں اور دیدہ زیب نسخے طول و عرض ہند میں پھیلا دیں۔ حقیقت

یہ ہو کہ منشی نولکشور کا یہ اقدامِ عمل فارسی زبان کے حق میں بے اندازہ مفید ثابت ہوا انھوں نے سینکڑوں کتابوں کو تلف ہونے کی آفت سے بچالیا اور فارسی کے تنِ بے جان میں زندگی کی عارضی سی روح پھونک دی۔

اِس دوْر کا ادب اگرچہ اس زمانے میں ہر قسم کا انحطاط شروع ہو چکا تھا مگر دوْرِ انحطاط کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہو کہ اس میں مفید اور اعلیٰ درجے کا لٹریچر کم اور بے کار تصنیفات بہت زیادہ لکھی جاتی ہیں چنانچہ اس دوْر میں بھی بے شمار شعرا و مؤرّخ پیدا ہوئے اور بہت سی انشائیں لکھی گئیں۔ لیکن اعلیٰ درجے کی تصنیفات بہت کم ہیں۔

ہم نے اس باب میں پینتیس ۳۵ مؤرّخین کا ذکر کیا ہو جن میں سے صرف ذیل کے اسما کو کچھ امتیاز حاصل ہو:۔

خلاصۃ التواریخ	مُصنّفہ	کلیان سنگھ
منتخب التواریخ	مُصنّفہ	سدا سکھ نیاز
امیر نامہ	مُصنّفہ	بساون لال شاداں
عمدۃ التواریخ	مُصنّفہ	منشی سوہن لال
گلزارِ کشمیر	مُصنّفہ	رائے کرپارام

باقی فنون کی تفصیل بشرحِ ذیل ہو:۔

سوانح ۷

قصص ۷

مترجمات ۱۵

علومِ طبعیہ ۲۲

طب ۷

موسیقی	۱
انشا	۲۶
لُغت	۹

بعض خصوصیات علومِ طبعیہ اس دوَر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علوم طبعیہ پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ ان کتابوں کے مضامین میں مغربی علوم کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس زمانے میں اکثر ہندو مُصنّفین نے مغربی علوم سے واقفیت پیدا کر لی تھی جس کے اثر سے ان کی کتابیں خالی نہ رہ سکتی تھیں۔ فلسفہ، نجوم، ہیئت، ریاضی اور طب کے متعلق بعض مفید کتابیں لکھی گئیں۔ اثگی، فلسفی، زخمی، قتیل، بجھو مل، تمکین، لالہ کانجھی مل وغیرہ اس عہد کے بہترین مُصنّفین میں سے ہیں۔ لالہ کانجھی مل کی کتاب "خزانۃ العلم" ان کتابوں میں سے ہے جو حکومت کے صَرف پر طبع ہوئیں۔ اس میں مغربی علوم کی معتد بہ آمیزش ہے۔

تقابلِ مذاہب مغربی تعلیم کا پہلا اثر یہ ہوا کہ لوگوں میں ذہنی کشمکش پیدا ہوئی۔ یورپ کی زندگی کو ایک کامل نمونہ قرار دیا گیا، خیالات میں انقلاب پیدا ہوا اور خود سری کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ اس عہد کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہندو مصنّفین اسلام، عیسائیت اور دیگر مذاہب پر اعتراض کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس دوَر میں مغربی اصول اور مغربی طرز زندگی کی روشنی میں ہندو اپنے اندر اصلاح کے کام کی طرف بھی متوجہ ہوتے ہیں جس کا پہلا مرحلہ بُت پرستی کی مخالفت ہے۔ راجا رام موہن رائے مصنف تحفۃ الموحدین۔ دیوان کرپا رام مُصنّف مدینۃ التحقیق و دیوان اننت رام مُصنّف حقیقت تناسخ اس تحریکِ اصلاح کے علمبردار سمجھے جا سکتے ہیں۔

اِنشا اور شاعری یہ یاد رہے کہ انشا اور شاعری اس زمانے میں کوئی دُشوار چیز نہ سمجھی جاتی تھی۔ ہر شخص ایک تخلص کے ساتھ کچھ غزلیں لکھ لینے سے شاعروں میں شمار ہو سکتا تھا۔ خطوط اور مکتوبات کے مجموعے کا مرتب کر لینا بھی چنداں دقت طلب امر نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں بے شمار منشی اور شاعر ایسے موجود ہیں جو صرف صاحبِ تخلص ہونے کے الزام میں شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے غزلیات کا دیوان بھی یادگار چھوڑا ہے مگر ان میں بمشکل تمام دو تین ہی ایسے ہوں گے جنھیں صحیح طور پر اعلیٰ منشیوں اور شاعروں میں شمار کیا جا سکے۔ "دستور الصبیان" سالہا سال تک ہندستان کے مکاتب میں پڑھائی جاتی رہی ہے اور حقیقت میں یہ ایک مفید کتاب ہے۔ مُنشی خیالی رام کے منشآت کو بھی ملک میں خاصی مقبولیت حاصل رہی ہے مگر ان منشآت کے فائدے کا دائرہ بہت محدود ہے۔ اس لیے کہ پُرانی انشاؤں کے ان دو اوصاف سے کہ ان میں زبان اور تاریخ ہر دو موجود ہوتی تھیں متاخرین کی انشائیں خالی ہیں۔

شعرا میں بھی برہمن، مخلص، شفیق، اور منوہر کے پایے کا کوئی شاعر نہیں۔ قتیل ایک ممتاز شخصیت ہے مگر اسے مسلمانوں میں شمار کرنا زیادہ موزوں ہے اس لیے کہ وہ ابتدائے عمر میں مسلمان ہو گیا تھا۔ تفتہ، زخمی، ذوقی رام حسرت، محیط، شعلہ، خاموش اور اندرمن البتہ قابلِ ذکر شعرا ہیں۔

صحافت ہندستان میں صحافت[1] اور اخبار نویسی منظم طریق پر ۱۷۸۰ء سے کچھ قبل شروع ہوتی ہے۔ ۱۸۰۰ء تک اس فن میں کافی

---

[1] یہ بیان CAREYS GOOD OLD DAYS سے لیا ہے۔ نیز رسالہ معارف ۱۹۲۹ء

ترقی ہو چکی تھی۔ کلکتہ اخبار نویسی کا مرکز تھا۔ پہلے پہل جو اخبارات شائع ہوئے ان میں سے بعض فارسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ ذیل کی فہرست سے معلوم ہوگا کہ اکثر اخبارات ہندو اہل قلم کی زیرِ ادارت شائع ہوتے تھے۔

(۱) جام جہاں نما۔ ہفتہ وار اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں نکلتا تھا۔ ایڈیٹر سدا سکھ۔

(۲) مرآۃ الاخبار۔ مالک و نگراں راجا رام موہن رائے۔

(۳) شمس الاخبار (اُردو و فارسی) منی رام ٹھاکر

(۴) بنگال ہیرلڈ (انگریزی، بنگالی، فارسی اور ناگری) ہر اتوار کو شائع ہوتا تھا۔ یہ بھی راجا رام موہن رائے، دوارکا ناتھ ٹیگور، پرسنا کمار ٹیگور وغیرہ کی زیرِ نگرانی شائع ہوتا تھا۔

مفصّل تبصرے

اب ہم ہر فن کی کتابوں کی مفصّل فہرست پیش کرتے ہیں اور اہم کتابوں پر مختصر سا تبصرہ بھی کریں گے۔

تاریخ

(۱) مخزن الفتوح[۱] (۱۲۲۲ھ) بھگوان داس۔ لارڈ لیک اور مرہٹوں کی جنگ کے حالات ہیں۔ طرزِ بیان منشیانہ ہے۔ نثر کے ساتھ بے شمار اشعار بھی لکھتا ہے۔

(۲) خالصہ نامہ[۲] (۱۲۲۴ھ) دیوان بخت مل۔ سکھوں کے آغاز سے لے کر

---

[۱] ریو۔ ج ۳۔ ص ۹۴۸ [۲] ریو ج ۱۔ ص ۲۹۴ و ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن اجلاس لاہور ۱۹۲۷ء کی رپورٹ

۱۲۲۲ھ تک کی تاریخ ہے۔ اس کا ایک نسخہ راجا نریندر ناتھ صاحب کے پاس لاہور میں محفوظ ہے۔

(۳) وقائع ہلکر (۱۲۲۳ھ) موہن رائے یا موہن سنگھ۔ ملہار راؤ ہلکر کے حالاتِ زندگی ہیں۔[1]

(۴) مرآۃ دولتِ عباسیہ (۱۲۲۳ھ) دولت رائے۔ بہاول خاں ثانی دولت عباسیہ بہاول پور کا ملازم تھا۔ اس کتاب میں عباسی خاندان بہاول پور کے حالات ہیں۔[2]

(۵) چار چمن (۱۲۲۵ھ) ریو ج ۳۔ ص ۱۰۵۸۔ یہ بھی اسی مصنف کی کتاب ہے اور ہندستان کی عمومی تاریخ ہے۔ اس میں چار چمن اور سات بہاریں ہیں۔ پہلے تین چمنوں میں دہلی کا ذکر، ہندوؤں کے میلوں کے حالات، ان کے مقدس مقامات کا تذکرہ، راگوں اور راگنیوں پر تبصرہ اور شاعروں اور نثر نگاروں کی زندگی کے حالات ہیں۔ اولیا کے سوانح بھی ہیں اور امرائے مغلیہ کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ چمن چہارم میں شاہانِ ایران و سلطنت انگلشیۂ ہند کا بیان ہے۔ کتاب اگرچہ کافی ضخیم ہے اور مضامین کے اعتبار سے کافی متنوع ہے لیکن سب کچھ سرسری اور سطحی ہے۔ زبان بھی ناصاف ہے اور مشکل۔ پنجاب پبلک لائبریری میں ایک نسخہ محفوظ ہے۔

(۶) عمارات الاکبر (۱۲۲۵ھ) منشی چھترمل۔ اس میں اکبر آباد (آگرہ) کی عمارتوں کا حال ہے۔ منشی چھترمل نے "دیوان پسند" کے نام سے ایک عمدہ کتاب سیاق پر لکھی ہے۔

---

[1] معارف ۱۹۱۸ء [2] معارف ۱۹۱۸ء

(۷) شیر و شکر[1] (۱۲۲۸ھ) منشی دیا رام ولد نراین پنڈت۔ مصنّف نے شیخ غلام حیدر نامی ایک استاد سے ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر الور میں اپنے بھائی نند رام پنڈت کے پاس چلا گیا جو راجا کا ملازم تھا۔ وہاں تھوڑا عرصہ مقیم رہنے کے بعد وہ دہلی چلا آیا اور مہاراجا رنجیت سنگھ کے پاس ملازم ہو گیا۔ مہاراجا نے اسے دیوان گنگا رام کے ماتحتوں میں شامل کر دیا جو اس وقت ایک با اثر و رسوخ عہدہ دار تھا۔

"شیر و شکر" ۱۲۲۸ھ میں مرتب ہوئی جب کہ مصنّف دیوان گنگا رام کے ساتھ حملہ و تسخیرِ پنجھ میں شامل ہوا۔ یہ سکھوں کی مختصر سی تاریخ ہے اور زیادہ تر مہاراجا رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت سے متعلق ہے۔ اس رسالے میں عہدِ رنجیتی کے بعض اکابر و علما کے حالات بھی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی خصوصیت نہیں۔

منشی دیا رام کا ایک دیوان بھی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ یہ دونوں کتابیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں۔

(۸) خلاصۃ التواریخ[2] (۱۲۲۷ھ)
(۹) واردات قاسمی
} مہاراجا کلیان سنگھ۔ حال آگے آتا ہے۔

(۱۰) منتخب التواریخ[3] (۱۲۳۴ھ) سدا سکھ نیاز

(۱۱) تنقیح الاخبار[4] (۱۲۳۷ھ) منولال فلسفی

(۱۲) امیر نامہ[5] (۱۲۴۰ھ) بساون لال شاداں

---

[1] پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا قلمی نسخہ بینش منظر تھا [2] ریو۔ ج ۱۔ ص ۲۸۳، ۳۱۳
[3] ریو۔ ج ۳۔ ص ۹۱۴: الیٹ ج ۸۔ ص ۴۰۴ [4] یونیورسٹی لائبریری میں ایک نسخہ ہے
[5] ریو۔ ج ۳۔ ص ۱۰۰۹

(۱۳) اشرف التواریخ[1] (۱۲۴۱ھ) کشن دیال، یہ ہندستان کی عمومی تاریخ ہے۔ راجا چندو لال حیدرآبادی کی خاطر لکھی گئی۔

(۱۴) وقائع شورش[2] افغانیہ (۱۲۳۷ھ) برج نراین خیال۔ یہ حیدرآباد میں مہدوی افغانوں کی شورش کا حال ہے۔

(۱۵) مجموعۂ فیض[3] وگل بیجزاں (۱۲۴۱ھ) سندرلال کالیستھ۔ کول اور مضافات کا تاریخی حال ہے۔

(۱۶) فرح بخش[4] جاں (۱۲۴۴ھ) راے شو پرشاد۔ یہ نرسنگھ چرتر کا ترجمہ ہے۔ نرسنگھ ابوالفضل کا قاتل تھا۔

(۱۷) تاریخ ہزارہ[5] (۱۸۱۹ء تا ۱۸۴۹ء) منشی مہتاب سنگھ کالیستھ

(۱۸) یادگار بہادری[6] (۱۲۴۹ھ) بہادر سنگھ ولد ہزاری مل کالیستھ ساکن شاہ جہاں آباد۔

(۱۹) احوال شہر[7] اکبرآباد (۱۸۲۶ء) مانک چند۔ یہ انعامی کتاب ہے۔ جیمز شنگٹن کے کہنے سے لکھی گئی

(۲۰) احوال عمارات[8] مستقر الخلافہ (۱۸۲۶ء) سیل چند

(۲۱) نصرت[9] وظفر بھرت پور (۱۸۲۶ء) شنکر ناتھ نادر۔ راجا بلونت سنگھ کی تخت نشینی کا حال ہے۔

---

[1] ایلیٹ۔ ج ۸۔ ص ۴۱۱ [2] نسخہ یونیورسٹی لائبریری [3] ریو۔ ج ۳۔ ص ۹۵۰
[4] انڈیا آفس فہرست۔ عدد ۴۸۴ [5] انڈیا آفس فہرست۔ عدد ۵۰۶ [6] ایلیٹ۔ ج ۸ ص ۴۳۱ [7] ریو۔ ج ۳۔ ص ۹۵۸: انڈیا آفس فہرست عدد ۲۳۱، شنگٹن ۱۸۲۶ء میں آگرے کے مجسٹریٹ تھے [8] قلمی نسخہ پروفیسر شیرانی صاحب: معارف ۱۹۱۸ [9] نسخہ یونیورسٹی لائبریری۔ مصنف کے حالات کے لیے دیکھو تذکرۂ خوشنویسان۔ ص ۱۲۲: آثار ایضاً دیدص ۲۵۵

(۲۲) تواریخ سورت[1] (بعد از ۱۸۲۴ء) رگھوبر جی

(۲۳) راجپوتانِ بنارس[2] (۱۲۶۰ھ) چونی لال

(۲۴) عجائب الہند[3] (بعد از ۱۲۳۴ھ) سداسکھ نیاز

(۲۵) تواریخ جموّں[4] یا راج درشنی (۱۲۶۳ھ) گنیش داس بدھرہ قانون گو۔ راجگانِ جموّں کی پوری تاریخ ہے۔

(۲۶) صاحب نامہ یا صاحب نما۔ اسی مصنّف کی کتاب ہے۔ نظر سے نہیں گزری لیکن مشہور کتاب ہے۔ اس میں پنجاب کی مفصل تاریخ ہے اور خاص کر راجا رنجیت سنگھ کا ذکر مبسوط ہے "منشآت منشی" بھی اسی گنیش داس کی تصنیف ہے۔

(۲۷) نظارۃ السندھ[5] (۱۸۵۵ء) بشن نراین۔ اصل کتاب انگریزی میں پوسٹن صاحب نے لکھی تھی جس میں سندھ کے حالات و مشاہدات درج کیے ہیں۔

(۲۸) ظفر نامۂ رنجیت سنگھ[6] (۱۸۳۶ء وما بعد) امرناتھ اکبری

(۲۹) مجمع التواریخ[7] (۱۲۵۱ھ) بیربل پنڈت معروف بہ کاچر

(۳۰) عمدۃ التواریخ (قبل از ۱۸۵۲ء) منشی سوہن لال

(۳۱) تحفۃ الہند[8] (۱۹ صدی عیسوی) بھولاناتھ کھتری ملتانی ولد رائے دین دیال منشی ساکن شاہ جہان آباد۔

(۳۲) ظفر نامہ رنجیت سنگھ (نزد ۱۲۹۰ھ) کنھیا لال ہندی

(۳۳) سلطان التواریخ[9] (۱۲۵۸ھ) رتن سنگھ زخمی۔ شاہانِ اودھ کے حالات

---

[1] ریو۔ ج ۳۔ ص ۱۰۴۱ [2] ریو۔ ج ۳۔ ص ۱۰۲۲ (۱۰ر) [3] ریو ج ۳۔ ص ۳۰ (۶)

[4] انڈیا آفس فہرست عدد ۵۰۷۔ ریو۔ ج ۳۔ ص ۹۵۵ و ۹۵۲ [5] ایشیاٹک سوسائٹی بنگال الونات کیٹالاگ عدد ۱۸۶ [6] یونیورسٹی لائبریری کا قلمی نسخہ اور مطبوعہ ایڈیشن از پروفیسر سیتارام کوہلی

[7] قلمی نسخہ یونیورسٹی لائبریری [8] قلمی نسخہ یونیورسٹی لائبریری [9] ریو۔ ج ۳۔ ص ۹۶۲۔

از آغاز تا ۱۲۵۵ھ)

(۳۴) گلاب نامہ (نزد ۱۸۵۷ء) دیوان کرپارام

(۳۵) گلزار کشمیر (۱۸۵۷ء) ایضاً

(۳۶) مہاتمنی کشمیرہ منڈل (۱۹۱۳ سموت) گلاب رام زنو۔ یہ کشمیر کی ایک بے ربط سی تاریخ ہی۔

(۳۷) کشمیر نامہ (۱۸۴۵ء) گنیش لال۔ یہ لارڈ ہارڈنگ کا سفر نامۂ کشمیر ہی جو گنیش لال منشی نے مرتب کیا۔

(۳۸) کشمیر نامہ (انیسویں صدی) کرنل مہان سنگھ نے رنجیت سنگھ کے عہد میں آئین اکبری کے انداز پر لکھا مصنّف کشمیر کے گورنروں میں سے تھا۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کا صرف ایک قلمی نسخہ (جو غالباً خود نوشت ہی) کپور تھلہ لائبریری میں محفوظ ہی۔[۱]

تاریخی کتابوں کی اس مفصل فہرست کے بعد اب ہم بعض نامور مورخوں کا ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں:-

مہاراجا کلیان سنگھ

انتظام الملک انتظام الدولہ مہاراجا کلیان سنگھ بہادر تہوّر جنگ، رائے ہمت سنگھ کا یستھ دہلوی کا پوتا تھا۔ اس کا باپ شتاب رائے بنگالے کا ناظم تھا (۱۱۸۷ھ) کلیان سنگھ اپنے باپ کے بعد بنگالے کی نظامت پر متمکن ہوا (بیل تاریخ ہند۔ ج ۳۔ ص ۵۴۵) ہمارا مصنّف اس کے اپنے بیان کے مطابق پہلا ہندستانی تھا جس نے انگریزوں کی ملازمت قبول کی۔ وارن ہیسٹنگز

---

[۱] قلمی نسخہ پروفیسر شیرانی صاحب کپورتھلہ لائبریری کیٹالاگ از پروفیسر مترا۔ عدد ۲۰

نے اس پر چونتیس لاکھ روپیہ ٹیکس عائد کیا جس سے وہ تباہ و برباد ہوگیا۔ اس کے بعد وہ کلکتے میں چوبیس ۲۴ سال تک کس مپرسی کے عالم میں وقت بسری کرتا رہا۔ طویل علالت نے اس کی بینائی کو بھی خطرے میں ڈال دیا تھا جس سے وہ ۱۲۱۸ھ میں پھر بہرہ اندوز ہوگیا۔ اُس کے بعد پٹنے میں قیام پذیر ہونے کی پھر اجازت مل گئی۔ مسٹر ابراہیم ولانڈ نے اس سے درخواست کی کہ آپ ناظمانِ بنگالہ کی ایک تاریخ مرتب کریں چونکہ مصنف نیم بینا تھا اس لیے وہ کتابوں سے زیادہ فائدہ نہ اُٹھا سکا لیکن حافظے سے کام لیتے ہوئے اس نے تاریخ لکھوا دی۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصے کا نام خلاصۃ التواریخ اور دوسرے کا نام وارداتِ قاسمی ہے۔

حصۂ اوّل میں مغل بادشاہوں کا تذکرہ ہے۔ اورنگ زیب سے لے کر اکبر ثانی تک حالات تفصیلی ہیں۔ وارداتِ قاسمی خاص طور پر ناظمانِ بنگالہ سے بحث کرتی ہے۔ گویا یہ میر قاسم خان کی نظامت سے لے اپنی معزولی کے وقت تک کی تاریخ ہے۔ یہ کتاب اس عہد کے اہم حالات سے مفصل بحث کرتی ہے۔

سدا سُکھ نیازؔ

یہ ہندستان کی مفصل و مشرح عمومی تاریخ ہے جو ۱۲۳۳ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ سدا سکھ نیازؔ دہلی میں پیدا ہوا اور الہ آباد میں وفات پائی۔ سرکار انگریزی کا ملازم تھا چھپن ۵۶ برس کی عمر میں الہ آباد آیا، وہاں ہی یہ تاریخ لکھنی شروع کی۔ دس سال تک علمی کاموں میں مصروف رہا کہتے ہیں اس نے اس عرصے میں ۱۲۵۰۰ اشعار اور ۵۰۰۰ صفحے نثر میں لکھے منتخب التواریخ اس کی قابلِ ذکر کتاب ہے۔

یہ کتاب دو قصروں پر مشتمل ہے۔ ہر قصر کئی ایوانوں اور محلوں میں منقسم ہے۔ غزنوی حکومت سے شروع کرتا ہے۔ کتاب کا اہم حصّہ وہ ہے جس میں اپنی معلومات کی بنا پر حالات کو قلمبند کرتا ہے۔ آخری مغلوں کی مالی فہرستیں اور بعض اور جغرافیائی تفاصیل قابل ذکر ہیں۔

نیاز تاریخ فرشتہ کی مذمت کرتا ہے اس کا خیال ہے کہ قبل از اسلام کے ہندو عہد کے بارے میں اس نے تفحص سے کام نہیں لیا لیکن خود اس کی بلا صرف پیروی کرتا ہے بلکہ بعض اوقات اس کے بیانات کو حرف بہ حرف نقل کرتا ہے۔

اس کا خاص انداز یہ ہے کہ وہ حکایات و قصص سے واقعات کو زیب دیتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ "میں نے دوسرے مصنّفین کی طرح بے جا مداحی اور بے جا مذمت کا طریق نہیں اختیار کیا بلکہ صحیح تاریخ نویسی میرا مقصود و منتہا ہے میں صلہ و ستایش کی غرض سے نہیں بلکہ نام نیک کی خاطر سب کچھ کر رہا ہوں" اس بلند دعوے کے باوجود وہ برٹش کی مدح میں بہت سے صفحے صرف کرتا ہے اور ان کے نظم و نسق کی مبالغہ آمیز تعریف کرتا ہے۔ ایلیٹ نے اس کتاب کی بہت مدح سرائی کی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے انگریزوں کی حکومت کی ستایش اور مسلم حکومت کی قدح و مذمت میں بہت زورِ قلم صرف کیا ہے۔

کتاب کا بہت سا حصّہ ایلیٹ صاحب نے بصورت ترجمہ اپنی تاریخ میں شامل کیا ہے۔

منولال فلسفی

مصنف تنقیح الاخبار (۱۲۳۷ھ) کا سلسلۂ نسب رائے رگھناتھ شاہجہانی

تک پہنچتا ہی۔ اس کتاب میں شاہانِ تیموری، شاہانِ ایران و بابل، شام و
مصر اور بادشاہانِ فرنگستان کی فہرست بتقیدِ سنین دی گئی ہی اس کے علاوہ
مُصنّف کے ذاتی حالات بھی ملتے ہیں فلسفی کے بیٹے کندن لال اشکی نے
باپ کی وفات کے بعد اس کو مرتّب کیا تھا۔ یہ باپ بیٹے دونوں اس عہد کے
بہترین مُصنّفین میں سے ہیں۔ اشکی کا ذکر آئے گا۔

بساون لال شاداں

امیر نامہ، امیر الدولہ محمد امیر خان والئ ٹونک کی تاریخ ہی جو مُنشی
بساون لال ولد تن سُکھ رائے کایستھ نے سنہ ۱۲۴۰ھ میں مرتب کی تھی شاداں
امیر خان کی شجاعانہ سرگرمیوں میں اس کے ساتھ تھا اسی لیے کتاب میں
چشم دید حالات بہت ہیں۔ کتاب کے چار باب ہیں جن میں اصل موضوع کے
ساتھ ہم عصر امراء اور دیگر قابل ذکر لوگوں کے حالات بھی دیے گئے ہیں۔ یہی
وجہ ہی کہ اس کتاب کو اہم سمجھا جاتا ہی۔ لکھنے کا انداز مُنشیانہ ہی۔ نثر کے ساتھ اشعار
بھی لاتا ہی۔ امیر نامے کا ترجمہ ایچ۔ ٹی پرنسپ صاحب نے انگریزی میں کیا تھا
جو سنہ ۱۸۳۲ء میں بمقام کلکتہ طبع ہوا۔

مُنشی سبل چند

اس کتاب کا نام تفریح العمارات ہی۔ بعض لوگوں نے تعریف العمارات
بھی لکھا ہی۔ یہ بھی احوال اکبر آباد کی طرح نشنگٹن کے اعلانِ انعام کے جواب
میں لکھی گئی تھی۔ غالباً اپنی قسم کے مضامین میں یہ سب سے اعلیٰ مانی گئی
ہوگی۔ کیونکہ اس کی شہرت بہت عام ہی اور اس نے عمارات و مزارات،

مساجد و باغات وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ساتھ ساتھ ان عمارتوں کے بانیوں کے حالات زندگی بھی اچھے انداز میں دیے ہیں چنانچہ ہم نے راجا ٹوڈرمل اور چندربھان برہمن کا عمدہ حال بھی اسی سے لیا ہے۔ استاد محترم نیرانی صاحب کے پاس جو قلمی نسخہ ہے اس میں تصاویر بھی ہیں۔

امرناتھ اکبری

ظفرنامۂ اکبری مہاراجا رنجیت سنگھ کی تاریخ ہے۔ دیوان امرناتھ بخت مل کا پوتا تھا۔ لاہور کے مشہور صاحب ثروت بزرگ راجا نریندر ناتھ انھی کی اولاد میں سے ہیں۔ اس نے مولوی احمد بخش چشتی سے تعلیم حاصل کی۔ گیارہ سال کی عمر تھی کہ لاہور کے باغات پر ایک کتاب موسوم بہ روضۃ الازہار لکھی۔ ظفرنامہ ۱۸۳۲ء میں رنجیت سنگھ کے حکم سے لکھا گیا۔ پروفیسر سیتارام کوہلی نے چند برس ہوئے طبع کرایا ہے جس کے شروع میں ایک لمبا چوڑا دیباچہ بھی لگایا ہے۔ وہاں مصنف کے پورے حالاتِ زندگی اور کتاب پر مفصل ریویو درج ہے۔ ہم یہاں مختصر اشارات پر اکتفا کرتے ہیں جو زیادہ تر کوہلی صاحب کے دیباچے پر مبنی ہیں۔

یہ کتاب چار حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصّہ کتاب کا ضروری حصّہ ہے۔ اس میں مہاراجا کی لائف سمبت ۱۸۹۳ (۱۸۳۶ء) تک دی گئی ہے۔ دوسرے حصّے میں باغاتِ لاہور کا تذکرہ ہے۔ تیسرے حصّے میں ایک نظم ہے جو مرزا اکرم بیگ اور جرنیل الٰہی بخش کی زندگی سے متعلق ہے۔ چوتھے حصّے میں ایک اخلاقی نظم ہے۔

ظفرنامہ عہدِ رنجیتی کی تاریخوں میں خاص منزلت اور پایہ رکھتا ہے اور تاریخ پنجاب بوٹے شاہ اور سوہن لال کی کتابوں سے کیا بہ اعتبار عام دلاویزی

کے اور کیا بہ اعتبار صحت و نقاہت بہتر ہی مگر افسوس کا مقام ہی کہ تاریخ مکمل نہیں۔
ظفر نامے سے معلوم ہوتا ہی کہ امرناتھ عربی اور فارسی کا اچھا خاصا ماہر تھا وہ عربی کی لمبی لمبی عبارتیں لاتا ہی اور قرآن مجید کی آیات سے بھی اپنی نثر کو زینت دیتا ہی نثر کے ٹکڑوں میں مناسب اور موزوں اشعار کو اس طریق سے کھپاتا ہی کہ کلام کا لُطف زیادہ ہو جاتا ہی لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہی اکثر بے محاورہ فارسی لکھتا ہی اور کتاب کے شروع سے لے کر آخر تک بعض گھڑی ہوئی ترکیبیں نظر آتی ہیں جنھیں بار بار دہراتا چلا جاتا ہی۔ آمد کی بجائے آورد اور بے ساختہ پن کی بجائے تکلّف نمایاں ہی۔ نیز فارسی میں "پنجابی" آمیزش بھی دکھائی دے رہی ہی۔ پٹیالوی کو پٹیالیہ اور اسی طرح دوآبیہ اور رام گڑھیہ جیسے الفاظ جا بجا نظر آرہے ہیں۔ اچکن، اُچکّہ، سورھنگ، مائی اور ماتا اور اس طرح کے بے شمار ہندی یا اُردو الفاظ کا استعمال کرتا ہی۔

مُنشی سوہن لال مُصنّف عمدۃ التواریخ

لالہ سوہن لال سوری کا دادا لالہ حکومت رائے سوری۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کا وکیل تھا۔ خود لالہ سوہن لال اور اس کے باپ نے اسی حیثیت سے دربار میں مدّت تک کام کیا۔
سنہ ۱۸۳۱ء میں کیپٹن ویڈ پولٹیکل ایجنٹ لدھیانہ نے فقیر عزیز الدین کی زبانی اس کتاب کا حال سنا پھر مہاراجا نے خود بھی اس کی تعریف سُنی تو بہت خوش ہوا اور بطور صلہ مُصنّف کو انعام دیا۔
ایسا معلوم ہوتا ہی کہ عمدۃ التواریخ سنہ ۱۸۱۲ء سے پہلے شروع نہ ہوئی تھی۔ کتاب کے چار دفتر ہیں۔

پہلے دفتر میں سکھ مذہب کے آغاز سے مہاراجا رنجیت سنگھ کی تخت نشینی تک کا حال ہے۔ اس حصّے میں آخری مغل بادشاہوں اور پنجاب کے گورنروں کا بھی ذکر ہے۔

آخری تین دفتروں میں مہاراجا رنجیت سنگھ اور اس کے دو جانشینوں کے مفصّل حالات ہیں کتاب کی ابتدا گورو نانک کی لائف اور ان کی تعلیمات سے ہوتی ہے پھر باقی گوروؤں کا تذکرہ ہے۔

عمدۃ التواریخ سوہن لال کے مشاہدات کا خلاصہ ہے۔ نیز ان واقعات پر بھی مشتمل ہے جو سوہن لال کے باپ نے لکھے تھے۔ اس کے علاوہ مذہب اور سکھوں کی ایسی تاریخ ہے جو زیادہ تر سکھ نقطۂ نگاہ کے مطابق لکھی گئی ہے۔

مرے اور ویڈ صاحبان نے رنجیت سنگھ کی لائف کے سلسلے میں اس کتاب سے فائدہ اٹھایا ہے۔ سید محمد لطیف مصنف تاریخ لاہور و تاریخ پنجاب اپنے ایک خط میں جو سوہن لال کے بیٹے کے نام تھا، اس کتاب کی بے حد تعریف کرتے ہیں۔

کیپٹن ویڈ کی اس کے متعلق یہ رائے ہے کہ "سنین اور تاریخوں کے اعتبار سے نیز اس زمانے کے عینی مشاہدات کو صحت و درستی کے ساتھ ضبط کرنے کے اعتبار سے نیز اس لحاظ سے کہ اس میں اکثر واقعات کا دوسری تاریخوں کے ساتھ مقابلہ کیا گیا ہے۔ میں سکھوں میں اپنے سترہ سالہ قیام کے تجربات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ مہاراجا رنجیت سنگھ کی سچی اور صحیح سوانح عمری ہے"

غلام محی الدین بوٹے شاہ کی تاریخ پنجاب زیادہ وسیع پیمانے پر لکھی گئی ہے اور بہ اعتبار درستی اور صحت بھی اس کتاب سے کم نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ سوہن لال کو بہ حیثیت وکیلِ دربار حالات گرد و پیش سے

اوروں کی نسبت زیادہ واقفیت ہونی چاہیے۔

انشا پردازی کی حیثیت سے مصنف کا درجہ چنداں بلند نہیں۔ اس کی نثر صاف اور واضح ہوتی ہے لیکن مشکل پسندی کے مرض میں مبتلا ہے نیز اس میں "پنجابی" اثرات بہت نمایاں ہیں۔ "فارسی پنجابی" ترکیبیں بہت عام ہیں مثلاً کنٹھ مروارید، فرستادن ہنڈویاٹ، چند جوڑی کڑہا، پچکاری ہائے طلا، بازو بند و پونچیاں مرصع، ڈیرہ سرکار عالی، تھان ہائے پوربی، ڈیوڑھی سرکار والا، تھان ہائے کھیس، بگی ہائے طلائی، صاحب سنگھ گجراتیہ، نظام الدین افغان قصوریہ وغیرہ

کنھیا لال ہندی

مصنف ظفر نامۂ رنجیت سنگھ (نمبر ۳۲) یہ مہاراجا رنجیت سنگھ کی منظوم تاریخ ہے مگر چنداں اہم نہیں۔ کنھیا لال ہندی بہت طومار نویس تھا۔ اس نے بے شمار کتابیں لکھیں۔ وہ فارسی کے علاوہ انگریزی سے بھی واقف تھا اور انگریزی زمانے میں پنجاب کا پہلا انجنیر تھا اور آخر ایگزکٹو انجنیر ہو کر رائے بہادر ہوا۔ اس نے اُردو اور انگریزی میں بھی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی بعض تصانیف کے نام یہ ہیں:۔

یادگارِ ہندی	نبیوں اور اوتاروں کا تذکرہ
بندگی نامہ	"نام حق" کی طرز پر ایک اخلاقی نظم
نگارین نامہ	قصہ ہیر و رانجھا
مخزن التوحید	ہندی کا فارسی دیوان
گلزارِ ہندی	اخلاقی کتاب

اُردو میں اخلاقِ ہندی، مناجاتِ ہندی، تاریخ پنجاب، تاریخ لاہور،

ارمغان، رسالہ علم حساب۔

کنھیا لال کی کتابوں میں جدید خیالات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مذہبی بے تعصبی پر جا بجا وعظ کہتا ہے۔ پیغمبرِ اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا ذکر بہت عقیدت مندی کے ساتھ کرتا ہے۔ وحدت الوجود کا قائل ہے اور انگریزوں کے اثر صحبت سے تعدد ازدواج کی مذمت کرتا ہے۔

ہندی جتنا پُرگو ہے اس قدر اس کی کتابیں عمق اور متانت، تحقیق و تنقید سے خالی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ وسیع لٹریچر اس کی وسعتِ معلومات اور تنوع پسندی پر دلالت کرتا ہے۔

دیوان کرپا رام

مُصنّف گلاب نامہ (نمبر ۳۴) اس کتاب میں مہاراجا گلاب سنگھ اور اس کے آبا و اجداد کے حالات ہیں۔ دیوان کرپا رام مہاراجا رنبیر سنگھ کا وزیر تھا اُس کا بیٹا اننت رام بھی فارسی کا ماہر تھا، گلاب نام راجا رنبیر سنگھ والی کشمیر کی فرمایش سے لکھا گیا۔ دیوان کرپا رام نے اس تاریخ کے علاوہ "مدینۃ التحقیق" کے نام سے ایک کتاب ہندو مذہب کی حمایت میں لکھی ہے مصنف سکھوں کے عہد کا بہترین نثر نگار ہے۔ اس کی زبان صاف اور شستہ اور بہت حد تک بے عیب ہے۔ زبان پر قدرت ہے اور مشکل نگاری کے نقص سے بھی بہت حد تک پاک معلوم ہوتا ہے۔

گلزار کشمیر (نمبر ۳۵) بھی اس مصنف کی کتاب ہے جو پنجاب کے ایک جوڈیشل کمشنر کی فرمایش پر لکھی گئی اور کشمیر کے ذخائرِ قدرتی، صنائع، پیداوار اور دیگر عجائبات کے حال پر مشتمل ہے۔ کتاب کے چھ "گلبن" ہیں صوبے دارانِ کشمیر کے حالات مختصر ہیں مگر دیگر اوضاع و اطوار زندگی پر اچھی روشنی ڈالتا ہے۔

یہ کتاب اس دور کی بہت اچھی کتابوں میں شمار کرنے کے قابل ہے۔

مورّخین اور کتبِ تاریخ کا تبصرہ ہو چکا اب سوانح، قصص اور دیگر فنون کے مصنّفین کی خالی خولی فہرست دی جاتی ہے۔ ان کے بارے میں ہم نے زیادہ تفصیل سے قطع نظر کیا ہے کیونکہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اس دور کی تصانیف میں وہ بلند پایہ کتابیں موجود نہیں جو اس سے پہلے ادوار میں ہم نے دیکھی ہیں۔ با ایں ہمہ ضرورتاً کہیں کہیں تشریحی نوٹ دے دیے گئے ہیں۔

سوانح

(۱) حقیقتہائے بے خود۔ رام سیتا سنگھ فکرت (قاموس المشاہیر۔ ج ۱۔ ص ۲۵۳) نے اپنے پیر و مرشد منشی سیتل سنگھ بیخود کی لائف لکھی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۴۷ء میں بمقام لکھنؤ طبع ہوئی۔

(۲) وقائع معین الدین چشتی (۱۸۶۹ء) بابو لال ابن منشی کشوری لال منصف درجۂ اول الہ آباد۔ اپنے استاد مولوی عظمت علی کی فرمائش پر لکھی۔

(۳) انیس العاشقین (۱۲۴۵ھ) رتن سنگھ زخمی۔ یہ فارسی شعرا کا تذکرہ ہے جو دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصّہ ضیائی پر ختم ہوتا ہے۔ اسما حروفِ تہجی کے اعتبار سے ہیں۔ حالات نہایت مختصر ہیں بعض اوقات ایک دو سطر پر اکتفا کی گئی۔ نمونۂ کلام بھی تھوڑا دیا گیا ہے۔ دیباچے میں نصیر الدین حیدر شاہِ اودھ کی مدح کی گئی ہے۔ شاعر نے اپنا ذکر چار صفحوں میں کیا ہے۔[1]

(۴) تذکرۂ صوفیہ مصنّفہ اشکی (متوفی ۱۲۴۸ھ) اس کا ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ

---

[1] قلمی نسخہ یونیورسٹی لائبریری؛ اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۲۷ء ص ۴۹

میں ہے۔

قصص

(۱) عجیب القصص (انیسویں صدی عیسوی) بخت سنگھ

(۲) شبستان (قبل ۱۲۸۵ھ) ہرگوپال تفتہ کالیستھ۔ شاعر کا حال آیندہ اوراق میں آتا ہے۔ یہ مجموعہ منظوم اخلاقی حکایات پر مشتمل ہے۔[۱] "اُردوئے معلیٰ" غالب میں اس کا ذکر ہے۔

(۳) سداما چرتر (انیسویں صدی عیسوی) جگن ناتھ سہائے۔ "کرشنا ساگر" ہندی کتاب کا ترجمہ ہے۔

(۴) مخبرِ ہمت (انیسویں صدی عیسوی) جگ گوپال۔ شاہِ یمن کا افسانہ نظم میں

(۵) دستورِ عشق[۲] (" " ") جوت پرکاش۔ سسّی پنوں کا قصہ ہے۔

(۶) جہان ظفر (" " ") مکھن لال ظفر (کتب مطبوعہ فارسی برٹش میوزیم) سنسکرت کتاب "رام شمیدھ" کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس مصنّف نے کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔

(۷) قصہ بہمن و مرزبان (انیسویں صدی عیسوی) حکم چند (برٹش میوزیم) مصنّف گورمنٹ سکول دہلی میں ٹیچر تھا۔ ۱۲۶۵ھ میں طبع ہوئی۔

(۸) قصہ کامروپ[۴]۔ کوڑامل (متوفی ۱۸۴۸ء)

(۹) شبستانِ عشرت (انیسویں صدی عیسوی) بخت سنگھ (معارف ۱۹۱۸) ملکہ بدیع الجمال کا قصہ۔

---

[۱] اُردوئے معلیٰ (مبارک علی ایڈیشن) ص ۳۹ [۲] فہرست کتب فارسی مطبوعہ برٹش میوزیم

[۳] سپرنگر۔ ص ۵۲ [۴] سپرنگر ص ۴۶۰

مُترجمات وکتبِ ہنود

(۱) تنبیہ الغافلین (۱۲۳۴ھ) سداسُکھ نیازؔ (ریو۔ ج ۳۔ ص ۹۱۰) نے چار مقالات میں ہندوؤں کے مختلف فرقوں اور جماعتوں کا ذکر کیا ہے۔

(۲) رام نامہ (انیسویں صدی عیسوی) مُنشی رام داس قابلؔ خلف مصر بلی رام (نسخہ پبلک لائبریری لاہور)

(۳) حدائق المعرفت (انیسویں صدی عیسوی) لکشمی نراین (پبلک لائبریری لاہور) "شنکر" کا ترجمہ ہے۔

(۴) بھگت مالا (انیسویں صدی عیسویں) مُنشی نتھن لال بہجت (پبلک لائبریری لاہور) بھگت مالا کا ترجمہ ہے۔

(۵) ریاض المذاہب (۱۲۲۸ھ) پنڈت متھرا ناتھ مالوی۔ اس کتاب میں ہندو فرقوں کا ذکر ہے مُصنّف نے مسٹر جان گلن کی فرمایش پر لکھا۔ مسٹر اتچ۔ اتچ۔ ولسن نے اس کتاب سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے۔ مصنّف ایک زمانے میں ہندو کالج بنارس میں لائبریرین تھا۔ اس کا خلاصہ مجمع الصفات کے نام سے موجود ہے۔

(۶) کشایش نامہ (انیسویں صدی عیسوی) مٹھو لال مرشد (پبلک لائبریری لاہور) یہ نظم خدا کے ناموں سے متعلق ہے۔

(۷) کاشی استُت (انیسویں صدی عیسوی) نتن لال آفریں (پبلک لائبریری لاہور) اس میں کاشی کی مدح ہے۔

(۸) بھگوت پران (انیسویں صدی عیسوی) لکشمی نراین سرود (کتب برٹش میوزیم)

ریو۔ ج ۱۔ ص ۶۴

(۹) تحفۃ الموحدین[1] (انیسویں صدی عیسوی) راجا رام موہن رائے۔ یہ دنیا کے بڑے بڑے مذاہب پر ریویو ہے۔ راجا رام موہن رائے بردوان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے بنگالی اور فارسی مکتب میں پڑھی۔ عربی پٹنے میں حاصل کی۔ انھوں نے قرآن مجید کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں ایک انگریز افسر کے ماتحت سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں انھوں نے انگریزی سیکھی طبیعت محققانہ پائی تھی ہمیشہ احقاقِ حق میں مصروف رہے، آخر برہمو سماج کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھی جس کا مسلک صلح کل تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے کئی کتابوں کا بنگالی میں ترجمہ کیا۔ شاہ اکبر ثانی نے ان کو سفیر بنا کر انگلستان روانہ کیا اور راجا کے نام سے سرفراز کیا۔ سنہ ۱۸۳۳ء میں بمقام برسٹل انتقال ہوا۔

اس رسالے میں وہ کہتے ہیں کہ تمام مذاہب باطل ہیں کیونکہ باوجودیکہ سب الہامی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

یہ رسالہ پہلے عربی میں اور پھر فارسی میں لکھا گیا۔

(۱۰) تحفۃ الاسلام / پاداشِ اسلام } نزد سنہ ۱۸۶۶ء (پبلک لائبریری لاہور) اندرمن۔ یہ دونوں رسالے ہندو مذہب کی حمایت میں لکھے گئے۔

(۱۱) مدینۃ التحقیق (سنہ ۱۹۳۲ سموت) کرپارام (یونیورسٹی لائبریری) "تحفۃ الہند" کی تردید ہے۔

(۱۲) تحقیق التناسخ (سنہ ۱۸۷۵ء) اننت رام (یونیورسٹی لائبریری) اس میں تناسخ کی حمایت کی گئی ہے۔ مصنف دیوان کرپارام کا بیٹا تھا۔

(۱۳) رامائن منظوم (انیسویں صدی عیسوی) منشی موہن سنگھ (یونیورسٹی لائبریری لاہور)

---

[1] ر۔ ا۔ سپلیمنٹ عدد ۴۲



Rammohun Roy

راجا رام موهن راے مصنف تحفةالموحدین

(۱۴) کاشی کنڈ (انیسویں صدی عیسوی) ٹیٹی مل (پبلک لائبریری لاہور)
بنارس کے بعض فرقوں کا حال ہے۔
(۱۵) بھگوت گیتا (؟) کرشنا داس (برٹش میوزیم مطبوعات فارسی)
(۱۶) وثیقہ یادگار فارسی (انیسویں صدی عیسوی) منشی سالگ رام (پبلک لائبریری لاہور) پانچ بابوں میں بعض مذہبی مباحث پر یہ کتاب لکھی۔
(۱۷) چشمۂ فیض (انیسویں صدی عیسوی) گردھاری لال

فنون و علوم طبعیہ

(۱) زبدۃ الرمل (انیسویں صدی عیسوی) امبا پرشاد (پبلک لائبریری لاہور)
(۲) شرح گل کشتی (" ") گوبند رام۔ جبر نجات کی گل کشتی کی شرح ہے۔
(۳) شرح گل کشتی (انیسویں صدی عیسوی) رتن سنگھ زخمی
(۴) خزانۃ العلم (۱۲۲۹ھ) کانجی۔ یہ ریاضی اور سیاق پر ایک عجیب و غریب تصنیف ہے جو فرانسس ہاکنس کے نام معنون کی گئی ہے۔ اس میں ایک مقدمہ دس باب اور ایک خاتمہ ہے۔ انگریزی علمی اصطلاحات کا ترجمہ فارسی میں کیا گیا ہے۔ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف جدید علوم کا کافی ماہر تھا۔ مدت تک یہ کتاب بطور نصاب زیر تعلیم رہی ہے۔ ۱۸۳۷ء میں ڈاکٹر جے۔ ٹی ٹیلر کی زیر نگرانی کلکتے میں طبع ہوئی۔ یہ ریاضی اور ہندسہ اور دیگر علوم متعلقہ پر ایک مستند اور زبردست تصنیف ہے۔ بلاشبہ خزانۃ العلم اپنے فن کی تمام کتابوں میں رفیع ترین مقام کی مستحق ہے جس میں جدید

لہ انڈیا آفس کیٹالاگ۔ عدد (۲)۔ ریاض الوفاق (سپرنگر ۱۷۰) معارف ۱۹۱۸

اور قدیم علوم کو تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۵) مراۃ الخیال[1] رسالہ درحساب (انیسویں صدی عیسوی)، جگموہن لال کالستھ المتخلّص بہ صادق۔

(۶) رسالۂ حساب (انیسویں صدی عیسوی) انند کاہن کالستھ۔ کتاب میں چار باب ہیں اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

(۷) سراج السیاق (انیسویں صدی عیسوی) منشی میڈو لال زار (پبلک لائبریری لاہور)

(۸) دیوان[2] پسند (؟) منشی چھتر مل۔ انتظام مالی وبندوبست ملکی کے متعلق ایک عمدہ رسالہ ہے جو "چار دستور" میں منقسم ہے۔ اسی مصنف نے تمکین کے خطوط کو گلدستۂ فیض کے نام سے شایع کیا۔

(۹) رسالۂ سیاق (انیسویں صدی عیسوی) جگپت رائے (آصفیہ لائبریری بحوالۂ معارف ۱۹۱۸)

(۱۰) رسالۂ سیاق (انیسویں صدی عیسوی) مدن لال (آصفیہ لائبریری بحوالۂ معارف ۱۹۱۸)

ہیئت و نجوم

(۱) جواہر[3] الافلاک۔ جواہر سنگھ (متوفی ۱۲۶۷ھ) ولد بختاور سنگھ راقم لکھنوی مصنف نے جو ناطق مکرانی کا شاگرد تھا۔ جواہر ادراک کے نام سے ایک اور کتاب بھی لکھی اور اُردو و فارسی میں دو دیوان چھوڑے۔

---

[1] ریاض الوفاق (سپرنگر ۱۶۹) [2] معارف ۱۸ ۱۹۱۸؛ ریو۔ ج ۳۔ ص ۹۹۰ وغیرہ

[3] روز روشن۔ ص ۱۵۸؛ قاموس المشاہیر۔ ج ۱

(۲) حدائق النجوم[۱] (۱۲۵۳ھ) رتن سنگھ زخمی۔ محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کی فرمایش پر لکھی۔ اس کے چھپّن اجزا ہیں۔ یہ اس فن کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ انگریزی کتابوں سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

(۳) کاشف الدقائق (۱۹ اص ع) کیول رام کول

(۴) خاص النجوم[۲] (۱۹ اص ع) خوش وقت رائے ولد بھوپت رائے۔

(۵) رسالۂ نجوم[۳] (۱۹ اص ع) بیربل

(۶) مفتاح الناظرین[۴] (۱۹ اص ع) رام پرشاد

(۷) زیج اشکی (۱۹ اص ع) کندن لال اشکی[۵]

طب

(۱) معیار الامراض[۶] (۱۲۴۷ھ) رام پرشاد ولد گنگا پرشاد۔ جو پٹنے میں کمپنی کے زمانے میں صدر امین تھا۔

(۲) مفردات طب (۱۲۴۸ھ) منولال فلسفی

(۳) مجربات تمکین[۷] (۱۹ اص ع) بجھو لال تمکین۔ مصنف قاضی اختر کا ہم عصر تھا۔

(۴) کحل الابصار (۱۹ اص ع) پنڈت لال چند

(۵) پاکا ہوے کالی (۱۹ اص ع) مترجمہ دیا ناتھ

(۶) ضروری الطب (۱۹ اص ع) منشی مہتاب نراین

خوش خطی

تعلیم المبتدی[۸]۔ جگت نراین (متوفی ۱۲۱۲ھ)

---

[۱] معارف ۱۹۱۸ [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] ایضاً [۵] ایضاً [۶] ایضاً [۷] اکثر کتابوں کا ذکر معارف ۱۹۱۸ سے لیا گیا ہے [۸] روز روشن ص ۱۳۵

موسیقی

دیوراج ساگرا (انیسویں صدی عیسوی) کرشنانند کا لیستھ (برٹش میوزیم کتب مطبوعہ)

انشا

(۱) شمع شبستان (۱۲۱۳ھ) درگا پرشاد عاشق (پبلک لائبریری) شبستانِ نکات کی شرح ہے۔

(۲) تضمین گلستان۔ ہرگوپال تفتہ (یونیورسٹی لائبریری) اپنے بیٹے ہیتم بر کی یاد میں لکھی۔

(۳) انشائے دل پسند (۱۲۲۷ھ) ستیل داس سیٹھی (یونیورسٹی لائبریری) کتاب کے آٹھ باب ہیں۔

(۴) منشآت مہنگولال (۱۲۵۰ھ تا ۱۲۵۴ھ) منشی مہنگولال ساکن بانس بریلی (یونیورسٹی لائبریری) دو حصّے ہیں ایک کا نام مختصر منتظمی اور دوسرے کا نام نوادر منتظمی ہے۔

(۵) خیالاتِ شیدا (۱۲۳۵ھ) پنڈت امرناتھ شیدا (پبلک لائبریری لاہور) فلسفیانہ مسائل پر بحث کی گئی ہے۔

(۶) مفید الانشا (۱۲۲۴ھ) پنڈت لچھمی نراین (یونیورسٹی لائبریری قلمی نسخہ) کتاب کی دو فصلیں ہیں۔

(۷) خیالات ضائع (مطبوعہ ۱۸۵۱ء) چرنجی لال ضائع (پبلک لائبریری) چند مضامین متعلقہ مطالعۂ نیچر کا مجموعہ ہے۔

(۸) انشار فیض پیرا (۱۷۵۳ء۔ ۱۷۷۵ء) منشی ہرسہائے قانون گو (فہرست

کتب خانۂ نولکشور) شجاع الدولہ کے عہد میں لکھی گئی۔

(۹) منشی بھاگ چند کے مکاتیب (نزد ۱۲۶۰ھ) (فہرست کتب خانۂ نولکشور)

(۱۰) منشآت امرت لال مطبوعہ ۱۸۹۱ء (فہرست کتب خانۂ نول کشور)

(۱۱) منشآت کالی رائے تمیز (نزد ۱۲۶۰ھ) ایضاً و پبلک لائبریری

(۱۲) رقعات فیض آگیں۔ نند کشور مطبوعہ ۱۸۷۱ء (پبلک لائبریری)

(۱۳) منشی ہر جس رائے کے مکتوبات (فہرست کتب خانۂ نولکشور)

(۱۴) خیال بیخودی۔ مضامین تصوّف کا مجموعہ۔ سنبل سنگھ بیخود (پبلک لائبریری)

(۱۵) گنجینۂ خیال[1] منشی خیالی رام خیالی۔ احسان اللہ ممتاز کا شاگرد خاص تھا۔
واجد علی شاہ کے ہاں ملازم تھا۔ اس کی تصانیف ستّو تک پہنچتی ہیں۔

(۱۶) رقعات نظامیہ۔ بچھی داس بن نراین داس (فہرست نولکشور)

(۱۷) نادر الانشا۔ کشن جی پنڈت

(۱۸) خیالات نادر (۱۲۹۷ھ) ہر نراین دہلوی (پبلک لائبریری)

(۱۹) مرصع خورشید (۱۸۰۲ء) سداسکھ بن کشن پرشاد (پبلک لائبریری)

(۲۰) دستور الصبیان } لونده رائے۔ یہ کتاب بہت مشہور ہے اور مدت
(۲۱) دستور المکتوبات } تک مکاتب میں زیر تعلیم رہی۔ (یونیورسٹی لائبریری)

(۲۲) انشاء بے نقاط (۱۲۹۳ھ) کالکا پرشاد ناداں۔ مولوی برہان الدین
کا شاگرد تھا۔ (پبلک لائبریری لاہور)

(۲۳) انشاء دولت رائے۔ منشی دولت رائے (پبلک لائبریری)

(۲۴) منشآت ہیرا لال المعروف بہ انشائے لطیف

---

[1] ایتھے ناف۔ فہرست ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ضمیمہ ۲۔ عدد ۹۶۵؛ سپرنگر ۲۶۲ یہ گنجینہ
دو چار گنز میں منقسم ہے۔

لغت و صرف

(۱) گنج اللغات۔ گردھاری لال (آصفیہ لائبریری بحوالۂ معارف ۱۹۱۸)
(۲) نصاب مثلّث (قبل ۱۲۹۷ھ) گوبند رام (یونیورسٹی لائبریری)
(۳) کشف اللغات افغانیہ (متعلق پشتو) (۱۲۶۷ھ) نراین داس پشاوری (یونیورسٹی لائبریری)
(۴) غنچۂ بے خار (صنائع و بدائع) گنیش داس لائق (پبلک لائبریری)
(۵) ہفت گل (۱۲۹۴ھ) منشی کامتا پرشاد ناداں (" ")
(۶) دریائے عقل۔ گنگا پرشاد بن دولت چند مطبوعہ ۱۲۹۴ھ (پبلک لائبریری)
(۷) بہار علوم (۱۲۸۵ھ) مینڈو لال زار (پبلک لائبریری)
(۸) رسالۂ ضمیر منشی ہیرالال ضمیر (فہرست ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ضمیمہ ۲ عدد ۹۷۵)
(۹) جواہر منظومہ منشی دولت رائے
(۱۰) مفتاح الصّفات۔ رام نراین (پبلک لائبریری)

شعرا[1]

ذوقی رام[2] حسرت۔ متوطن شاہ جہاں آباد۔ ایک عرصے تک شاہ جہاں آباد

---

[1] ہم نے مرزا محمد حسن قتیل کو ہندو شعرا میں شمار نہیں کیا۔

[2] دیکھو انیس العاشقین (قلمی مملوکہ پنجاب یونیورسٹی) ج ۱۔ ق ۱۴۵: مخزن الغرائب (مملوکہ پروفیسر شیرانی صاحب) سپرنگر ص ۲۴۳ (بحوالۂ عیارالشعرا و گلشن بے خار) مجموعۂ نغز (قلمی مملوکہ پنجاب یونیورسٹی) ق ۱۰۵۔ روز روشن ص ۱۷۰۔ تذکرہ کریم الدین ص ۲۵۴

میں مقیم رہا۔ دکن میں بھی گیا اور آخر کار رام پور میں قیام کیا۔ جہاں ۱۲۲۱ھ کے اواخر میں دنیا سے رخصت ہوگیا۔

اس نے فارسی کے دو دیوان چھوڑے۔ اُردو میں بھی شعر لکھا کرتا تھا۔ انیس العاشقین کے مصنف کا بیان ہے کہ اس نے فارسی میں خاص سٹایل پیدا کیا۔ اس کا لب ولہجہ بہت صاف اور ایرانی تھا۔ مجموعۂ نغز میں لکھا ہے کہ حسرت محاورے کی بہت کم غلطی کیا کرتا تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

حسرت آں عاشق و دیوانۂ مادرزادیم ۔۔۔ کہ ز ما دست بہ طفلی پدر ما برداشت

چہ کنم ترک غم عشق تباں کارم نیست ۔۔۔ ورنہ آں نیست کہ از خوارئ خود عارم نیست

دمے کہ آں مہ بے مہر مہرباں باشد ۔۔۔ دلم بخویش رقیبانہ بدگماں باشد

تا بعد مرگ ہم نہ گزارد مرا بخویش ۔۔۔ بر خاکِ من گزشت و غبارا بہانہ ساخت

منشی ہرگوپال تفتہ[۱]۔ کایستھ متوطن سکندر آباد ولد موتی لال ۱۲۱۴ھ میں پیدا ہوا۔ وفات ۱۲۸۵ھ۔ غالب کے شاگردانِ رشید میں سے تھا۔ پہلے پہل رامی تخلص اختیار کیا۔ بعد ازاں "تفتہ" اختیار کیا۔ حسین قلی خاں عاشق کو نشترِ عشق کے اثنائے ترتیب میں بہت مدد دی جس سے اس کی شاعرانہ قابلیت میں بہت اضافہ ہوا۔ مرزا غالب کے ساتھ عقیدت مندانہ تعلقات تھے۔ جن کا حال رقعاتِ غالب وغیرہ سے ملتا ہے۔ تفتہ نے چار ضخیم دیوان چھوڑے۔ تضمین گلستاں بھی لکھی۔ اُردو میں بہت کم اشعار کہے۔

راجا رتن سنگھ زخمی[۲]۔ فخر الدولہ منشی الممالک خطاب۔ رائے بالک رام کا بیٹا

---

[۱] قاموس المشاہیر۔ ج ۱۔ ص ۱۵۹۔ روز روشن۔ ص ۲۳۶ (دکھیورامی) خمخانۂ جاوید۔ ج ۲ ص ۱۱۵۔ یادگارِ غالب۔ ص ۵۷۔ کلیاتِ نثرِ غالب ص ۸۳۔ اُردوئے معلیٰ دیباچہ۔ آبِ حیات ص ۵۰۸

[۲] ریو ج ۳۔ ص ۹۶۳؛ انیس العاشقین (قلمی) ج ۱۔ ق ۲۱۳۔ سپرنگر ص ۵۹۱؛ اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۲۷ء

کا بیٹا تھا۔ کئی پشتوں سے شاہانِ اودھ کی ملازمت میں تھے۔ ایک کتاب سلطان التواریخ نام شاہانِ اودھ کے حالات پر لکھی جو ۱۲۵۸ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ ایک دیوان چھوڑا جس میں غزلیات، مخمسات اور رباعیات ہیں مخمسات بہت دلچسپ اور شیریں ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

نہ ہمیں حسرتے بما باقی ست   رفت جاں ہیم صد بلا باقی ست
شب بسر شد بشکر آمدنش   مے دمد صبح شکوہ ہا باقی ست

ناصحا می کنی عبث منعم   مضطرم ضبطِ گریہ دشوار ست
مرغ و ماہی بخواب رفت وہنوز   ہمچناں زخمی تو بیدار ست

با من نشیں کہ خوف خدا خود بہانہ ایست   می دہ کہ بیم روز جزا خود بہانہ ایست
خون من است ایں کہ نہاں مے کند ز خلق   ہر لحظہ وصف رنگ حنا خود بہانہ ایست
زخمی بطرز تازہ ام او مے کشد کنوں   ترک جفا بقصد وفا خود بہانہ ایست

ماندہ باقی ز من و دل نفسے یا قسمت   نیست از حال من آگاہ کسے یا قسمت!
ہم صفیراں بشما باد مبارک گلزار   یاد تنہائی و کنج قفسے یا قسمت!

از شرم بسوئے من نگہے دید   شاید از درد من خبر داشت

پی شنیدن افسانہ می روی بر غیر   بیا بیا کہ مرا نیز حسب حالے ہست
وفا کردم خطائے من ہمیں بود   جفا کردی سزائے من ہمیں بود

اندرمن ولد لالہ کیول رام کایستھ۔ یہ شاعر بصارت سے محروم تھا اور حسین قلی خاں عشق کا ذاتی دوست تھا جس نے اپنے تذکرۂ نشترِ عشق[۱] میں اس کے کافی حالات لکھے ہیں۔ اس کے بعض اشعار نہایت پسندیدہ ہوتے ہیں۔

---

[۱] نشترِ عشق (قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی) ج ۱۔ ق ۱۶۲

نمونۂ کلام یہ ہے:-

زاہم برق وابر از دودِ افغاں، بارشِ اشکم | بیا از ما تماشا کن بہارِ برشگالی را
اگرچہ مصحفِ روے تو زیبا با خطِ موزوں | ولے با چشمِ جادو آیتِ تسخیر ہم دارد
تو بہر جا کہ نہی آں کفِ پا گل خیزد | بر زمینے کہ فتد زلفِ تو سنبل خیزد
گر در آئی بچمن با قدِ بالا گل رو | سرو از پا فتد و نالہ ز بلبل خیزد
سرمہ بر چشم وحنا بر کف وصندل بجبیں | چشمِ بد دور چہ با نقش و نگار آمدۂ
ذکر رود گر از بلا زلف کشا کہ ہمچنیں | فتنہ بجوید ار کسے چشم نما کہ ہمچنیں
ہر کہ طلب کند نشاں، چوں بشود قیامتے؟ | نازکناں ز خانۂ خویش بر آ کہ ہمچنیں

صاحب رام خاموش۔ کھتری متوطن بنارس۔ پہلے پہل شاہ عالم کا ملازم تھا پھر انگریزوں کی ملازمت اختیار کر لی۔ تاریخ مظفری کا مصنف شاعر کا دوست تھا۔ اس کا بیان ہے کہ اس کی وفات ۱۲۲۵ھ میں واقع ہوئی۔ پہلے پہل اس کا تخلص محزوں تھا۔ خاموش علی حزیں کا شاگرد تھا۔ اس کا ایک ضخیم دیوان ہے جس میں غزلیات، قطعات، رباعیات و قصائد موجود ہیں۔[1] اس کا یہ شعر بہت پسند کیا جاتا ہے ؎

فرض کردم ہمہ تقصیر من است | بعد ازیں گو کہ چہ تدبیر من است

منشی راجس[2] محیط لاہوری کھتری۔ بنارس میں ملازم تھا۔ مصنف ریاض الوفاق کا دوست تھا۔ بہت سی کتابیں لکھیں مثلاً محیط[1] عشق، محیط[2] درد، محیط[3] غم، حسن[4] و عشق، ایک[5] اور مثنوی۔ ان پانچوں مثنویوں کا نام "خمسۂ عشقیہ" رکھا۔ سنسکرت کتابوں کے ترجمے بھی کیے مثلاً محیط الحقائق، محیط الاسرار،

---

[1] نشتر عشق (قلمی) ج ۱ ص ۱۹۱۔ انیس العاشقین (قلمی) ج ۱۔ ق ۱۶۷: ریو۔ ج ۲۔ ص ۴۴، سپرنگر ص ۱۶۷: مخزن الغرائب (قلمی مملوکہ پروفیسر شیرانی صاحب) [2] ریاض الوفاق مست (سپرنگر ص ۱۸۱)

گلشن معرفت، محیط معرفت، محیط اعظم۔ اس نے انوار سہیلی کا اُردو میں منظوم ترجمہ کیا جس کا نام محیط دانش رکھا۔

اب ہم اس عہد کے باقی شعرا[1] کے نام حروفِ تہجی کی ترتیب سے یہاں درج کرتے ہیں:۔

بابو رائے احقر، پنڈت بینی رام احقر لکھنوی، بلدیو پرشاد احقر، رام دیال احقر، لالہ کندن لال ارشاد، لالہ کندن لال اشکی، منا سنگھ آشنا، منشی گر سہائے آشنا، دیوان امرناتھ اکبری، کالکا پرشاد انور، لالہ جگن ناتھ انور بھاگلپوری، خیالی رام افسر اٹاوی، پرشاد رائے عالم، لالہ بیج ناتھ اُنس، لالہ کیرت سنگھ اسد، راجا گردھاری پرشاد باقی، پنڈت ست رام بیخود، لکھمن لال بہجت، لالہ مینڈی لال بیمار، لالہ جوکشن بے جان، لچھمن پرشاد بہار، رائے ٹکا رام تسلی لکھنوی، گنگا داس تسکین، رائے بھجو لال تمکین، جلیس لکھنوی بن موہن لال انیس، جواہر سنگھ جواہر، بھمن ناتھ دہلوی، بشن نراین حیران، منشی کنج بہاری لال حیرت، پنڈت بینی رام حقیر، خوش وقت رائے لکھنوی، جو سکھ رائے خیال، بہاری لال خودرفتہ، جواہر لال دبیر، پنڈت نراین داس دل، دیبی نراین سنگھ، دیا رام دَر (یا دیا) پنڈت دھرم نراین ذکر، جو سکھ رائے ذہین، رام پرشاد رام، رائے شیو سہائے رائے، راہب کشمیری، لالہ

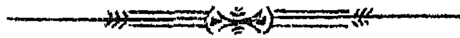
---

[1] ہر شاعر کے لیے علیحدہ حوالے دینے کی بجائے ہم بغرض ایجاز تمام ان کتابوں کے نام لکھتے ہیں جن میں ان شعرا کے حالات دستیاب ہو سکتے ہیں۔ روز روشن، تذکرہ کریم الدین ارنو سپرنگر (تذکرے) انیس العاشقین (قلمی دو جلد) عیار الشعرا (سپرنگر)، قاموس المشاہیر، ریاض الوفاق مستا (سپرنگر) فہرست کتب پنجاب یونیورسٹی لائبریری، فہرست کتب پنجاب پبلک لائبریری، مخزن الغرائب قلمی (مملوکہ پروفیسر شیرانی صاحب) تذکرہ خوشنویساں، تذکرہ عشقی (سپرنگر) آثار الصنادید، خمخانۂ جاوید، مجموعہ نغز قدرت اللہ قاسم، شعر الہند

لچھمی نراین رفیق، لالہ بھاگ مل رنج، راگو پنڈت، دیو ناتھ پنڈت رنگین، لالہ جواہر سنگھ رام، گوبند رام زیرک، منشی منولال زاری، لالہ ہیبت پرشاد سرور، گنگا پرشاد شاد، لالہ بدھ سنگھ شاداں، بساون لال شاداں، راجا کشن پرشاد شاد، پنڈت امرناتھ شیدا، لالہ خوش وقت رائے شاداب، لالہ دیبی پرشاد شامل، رادھے کشن شائق، لبتی رام شائق، لالہ متھرا داس شاعر، شنبھوناتھ جودت ریاشنبھو امرناتھ شعلہ، کنور دولت سنگھ شکری، لالہ طوطا رام شایاں، جی جی رام صبا، رائے بالک رام صبوری، پنڈت سیتارام صوفی، لالہ جی موہن لال صادق، سکھ رائے ضمیر، لالہ ہیرالال ضمیر، پنڈت نراین داس ضمیر، جانکی پرشاد ضمیر، لالہ ٹیکارام ظفر، بدیا دھر فصیح، پریم کشن فراقی، لالہ دین دیال فرحت، لچھمی نراین فرزانہ، رائے منولال فلسفی، پنڈت بدیا دھر فطرت، گوبند پرشاد فضا، منولال فہیم، رائے بیج ناتھ عاشق، موہن لال عاشق، مہاراجا کلیان سنگھ عاشق، بابو سربجت سنگھ عاشق، رائے سوہن لال عاشق، درگا پرشاد عاشق، رائے زور آور سنگھ عزیز، لالہ ہندوپت عشرت، لالہ شتاب رائے عزیز، آتما رام عاشق، بھولا ناتھ عاشق، منشی بھگوان دیال عاقل، لچھمن سنگھ غیوری، لالہ موہن لال غالب، رائے رتن لال غریب، رائے چینی لال قریب، رام داس قابل، کانجی، راجا ایروکشن کنور، نند لال گویا، پرکاش داس لطفی، راجا کانجی سہائے متین، منشی کنور سین مضطر، سیتل داس ممتاز، بیج ناتھ مشتاق، سکھن لال موحد، گنگا بشن مسرور، لالہ مٹھو لال مرشد، لالہ بلند سنگھ مصروف، پنڈت مادھو رام مشتاق، موتی رام مفتوں، منشی مہر چند مہر، موہن لال منعم، لالہ درگا پرشاد مضطرب، کنھیا لال منیر، منشی کنور جی مدہوش، رائے چینی لال نحیف، منشی درگا پرشاد نشاط، لالہ مول راج

نظمی، دیا شنکر نسیم، سدا سکھ نیاز، لالہ مٹھن لال نامی شنکر ناتھ نادر، منشی بنسی دھر ہمت، رائے کنھیا لال ہندی، گوکل چند لاہوری ہندو، نوبت رائے وقار، رائے جوالا پرشاد وقار، راجا اُدت نراین۔

ان شعرا میں سے اکثر نے کتابیں لکھی ہیں لیکن اتنی اہم اور وقیع نہیں۔ اس لیے ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔ مہاراجا چندو لال شاداں اور راجا کشن پرشاد شاد کی کتابیں تصوف میں ہیں اور اس لحاظ سے کہ ان کے مصنف عالی مرتبت ہیں خاص توجہ کی مستحق ہیں۔



چھٹا باب

نظرِ بازگشت

چھٹا باب

نظرِ بازگشت[1]

فارسی ادب درباروں میں

"مشرق میں تمام حقیقی علوم وفنون درباروں میں پیدا ہوتے ہیں"۔ پروفیسر براؤن[2] آنجہانی کا یہ مقولہ بعینہ ہندستان کے فارسی ادب پر بھی صادق آتا ہے جس ملک میں رائے عامہ ہوا یتی کے حالات واوضاع پر خاص طور سے اثر انداز ہوتی ہو وہاں بادشاہ کی ذات ہی تمام سرگرمیوں کا مرکز بنتی ہے۔ خاندانِ تیموری کے تقریباً تمام حکمران بلند ذوق اور علمی رجحانِ طبع رکھتے تھے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اُن کے زیرِ اثر بے شمار مصنفین موجود رہتے تھے جنھوں نے وسیع اور کارآمد لٹریچر پیدا کیا۔

جب سلطنتِ مغلیہ میں انحطاط آگیا تو وہی علمی سرگرمیاں بعض نئے مراکز کی طرف منتقل ہوگئیں جن میں اودھ، حیدرآباد، بنگال کا نام خاص طور سے لیا جاسکتا ہے۔ سکھوں نے پنجاب میں اور مرہٹوں نے اپنی سلطنت میں مغلوں کی طرزِ حکومت کی پیروی کرتے ہوئے فارسی کو بہت حد تک برقرار رکھا۔ پھر جب انگریز ملک پر قابض ہوگئے تو ایک خاص وقت تک انھوں نے فارسی کی دفتری حیثیت سے تعرض نہ کیا اور بہت سے لوگوں نے ان کے زمانے میں فارسی میں

---

[1] اس باب میں بعض پچھلے واقعات دہرائے گئے ہیں تاکہ ہندوؤں کی فارسی تعلیم کی کہانی یکجا بیان کی جاسکے۔ اس تکرار کے لیے مؤلف معذرت خواہ ہے۔

[2] لٹریری ہسٹری آف پرشیا۔ براؤن۔ ج ۲۔ ص ۳۹۶

کتابیں لکھیں۔

ریاست ہائے الور، ٹونک، بہاولپور اور بھوپال میں بھی ہندو منشی بہ تعداد کثیر موجود تھے اور ان میں بعض نے فارسی زبان میں کتابیں بھی لکھیں۔

گزشتہ ابواب میں ہم نے جن ہندو مصنّفین کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے اکثر اعلیٰ مناصب پر فائز تھے چنانچہ ہمیں بہت سے رائے، دیوان، راجا، مہر منشی، بخشی، قانون گو، کام دار، امین، پیش دست، مشرف، پیش کار، میر سامان، نائب دیوانِ خالصہ، دیوانِ تن، وزیر، منشی الممالک، فوج دار وغیرہ ملتے ہیں۔ مسلمان مصنّفین کی طرح یہ ہندو مصنّفین بھی بادشاہوں اور امیروں سے انعام و اکرام پاتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے بعض لوگوں کے طرزِ انشا اور قابلیت کی تعریف خود مغل شہنشاہوں نے کی ہے۔ مسلمان اربابِ علم کی طرح ہندو اربابِ قلم نے بھی لٹریچر میں اضافہ کرنے کے علاوہ اپنے زمانے کے سیاسی حالات میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لٹریچر کا مطالعہ اور بھی ضروری معلوم ہوتا ہے چنانچہ آگے چل کر ہم اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

کایستھ عام طور پر مشہور ہے کہ کایستھوں کو فارسی زبان کے ساتھ خاص مناسبت ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ گزشتہ صفحات میں جتنے مصنّفوں کا ہم نے تذکرہ کیا ہے ان میں کائیتھوں یا کایستھوں کو اکثریت حاصل ہے۔ یہ لوگ

---

[۱] مغل ایڈمنسٹریشن۔ پروفیسر سرکار۔ ج ۱: مورلینڈ ایگریرین سسٹم انڈر دی مغلز؛ مرآۃ الاصطلاحات (قلمی پنجاب یونیورسٹی) معلومات الآفاق (قلمی پنجاب یونیورسٹی) دستور العمل یوسف بیرک (قلمی پنجاب یونیورسٹی) وغیرہ کتب میں یہ اصطلاحیں مفصّل ملیں گی۔ ان اصطلاحوں کے مفہوم سے لیے دیکھو سید ابن حسن کی انگریزی کتاب (THE CENTRAL STRUCTURE OF THE MUGHAL EMPIRE) : پروفیسر عبدالعزیز کے مضامین انڈین سٹاریکل جرنل میں

بہت صاحب ذوقِ سلیم مانے گئے ہیں اور ایسا ہونا بالکل قرینِ قیاس ہے۔ ازمنۂ قدیمہ سے ان لوگوں کا کام نوشت و خواند تھا۔ راجاؤں کی منشی گری انھی کے سپرد تھی۔ اگرچہ خود ان کا دعویٰ ہے کہ وہ چھتری ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جب ہندستان میں وارد ہوئے تو انھوں نے پہلے پہل اسی جماعت سے فایدہ اٹھایا۔ انھیں مالیات میں ان سے کافی مدد ملی۔ پٹواری [جو مسلمانوں سے پہلے کا لفظ معلوم ہوتا ہے] انھی لوگوں میں سے ہوتے تھے۔ دفتر ہندی میں تھا اس لیے انھیں کاروبار میں کوئی خاص دقت نہیں محسوس ہوئی ہوگی۔ مشہور ہے کہ سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں یہی لوگ تھے جنھوں نے سب سے پہلے فارسی تعلیم کو حاصل کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ شیر شاہ کے زمانے میں ان لوگوں نے بیش از بیش ترقی کی۔ چنانچہ اکبر کے زمانے میں جب راجا ٹوڈرمل نے فارسی کو سرکاری زبان قرار دیا تو معاملات سلطنت میں اس سریع اقدام سے ابتری نہ پھیلنے کی وجہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ ایک جماعت فارسی داں ہندوؤں کی پہلے سے موجود تھی جس نے فی الفور نئے نظام پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ یہ جماعت گمان غالب ہے کہ کایستھوں ہی میں سے ہی تھی۔ اس زمانے سے لے کر آج تک کایستھوں نے جس قابلیت، ماحول کے مطابق متغیر ہو جانے کی صلاحیت اور حسن فہم کا ثبوت دیا ہے اس کے اثبات کے لیے ان کی بے شمار تصانیف کافی ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے وسط تک ہندوؤں میں صرف راجپوت اور کایستھ ہی تھے جن کا اثر و اقتدار مسلّم تھا۔ درگا پرشاد نادر، تذکرۃ النسا (ص ۲) میں راوی ہے کہ مردوں کے علاوہ کایستھ عورتیں بھی فارسی زبان جانتی تھیں۔ مجمع النفائس[۱] کا بیان ہے کہ عہد محمد شاہی میں کایستھ

۱؎ مجمع النفائس (قلمی یونیورسٹی لائبریری) ص ۴۰۸

لوگ سرکاری دفتروں پر چھائے ہوئے تھے۔ مرہٹوں کی حکومت میں بھی منشیانہ کاروبار یہی لوگ انجام دیتے تھے۔ برہمن جو کایستھوں کو شودر کہتے ہیں ان کی اس علمی ترقی اور دنیاوی ترفع سے بہت ناراض تھے۔ کایتھوں کی اس ترقی اور اقبال کا اصلی راز مطابقت ماحول میں مضمر ہے۔ راجپوت سپاہیانہ مشاغل کے لوگ تھے انھیں قلم دوات سے کوئی محبت نہ تھی۔ برہمن تفرد اور علیحدگی میں ہی علو شان خیال کرتے تھے۔ صرف کایستھ ہی تھے جنھوں نے اس میدان میں قدم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی جماعت ان کا مقابلہ نہ کر سکی۔ مآثر الامرا[1] کا بیان ہے کہ کایتھوں میں باہمی ہمدردی اور قبیلہ پروری بہت ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں اس کے کئی شواہد ملتے ہیں۔ جب انگریزوں نے حکمرانی کی باگ اپنے ہاتھ میں لی تو اکثر اکابر اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور آج بھی یہ قوم اپنی ذہانت اور ذکاوت کے لیے بہت مشہور ہے[2]۔

برہمنانِ کشمیر کایستھوں کے بعد سب سے زیادہ کشمیری پنڈتوں کو فارسی زبان سے خاص شغف رہا ہے۔ کشمیر میں فارسی کا رواج سلطان زین العابدین کے زمانے سے ہو چکا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ کشمیری برہمنوں میں سے "سپرو" قوم نے سب سے پہلے فارسی زبان کو حاصل کیا[3]۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "سلطان" پنڈتوں نے سب سے پہلے مسلمان حکمرانوں کی ملازمت قبول کی لہٰذا انھوں نے ہی فارسی کی تحصیل میں ابتدا کی

---

[1] مآثر الامرا ج ۲۔ ص ۲۳۰، ۲۳۔ مآثر الامرا ج ۲۔ ص ۳۴۴ [2] کایستھوں کے لیے دیکھو: سپرنگر ج ۱ ۳۰۵-۳۱۲: رزلے پیپل آف انڈیا ص ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۱۳: انسائیکلو پیڈیا انڈکا۔ ص ۴۸۳، ۵۱۳، کایستھ درپن (ہندی) ج ۱ ص ۴۶۶: انڈین اینٹکویری۔ ج ۵ ص ۵۰۔ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۰۵، پارٹ ۱۔ ص ۵ ہنٹر انڈین امپائر۔ ج ۱۔ ص ۳۲۱، ۳۲۷۔ شواجی سرکار۔ ص ۴۸۴ [3] تہا تمنی کشمیرہ منڈل رہم پہلے باب میں اس پر کچھ آ سکتے ہیں۔

ہوگی۔ بہرحال ہندستان میں رواج پانے سے پہلے کشمیر میں کافی ترقی ہو چکی تھی۔ اکبر کے عہد میں کشمیر عظیم الشان مغلیہ سلطنت کا ایک جزو بن گیا تھا اور اسی تاریخ سے کشمیری پنڈتوں کی ہندستان میں آمد و رفت شروع ہوگئی تھی۔ [شاہ جہاں کے عہد میں فارسی داں کشمیری پنڈتوں کا دربار مغلیہ میں اچھا خاصا عنصر معلوم ہوتا ہے۔ دیوان بخت مل [جو حقیقت میں مہاراجا رنجیت سنگھ کے قصر حکومت کا ایک زبردست معمار تھا] کے آبا و اجداد اسی زمانے میں ہندستان میں وارد ہوئے اور مغلوں کی ملازمت قبول کی۔ سکھوں کے عہد میں اور انگریزوں کے ابتدائی زمانے میں کشمیری برہمن کافی اقتدار پر تھے۔ وہ حسن ظاہری کے علاوہ ذہن رسا کے لیے بھی بہت مشہور ہیں اور آج کل بھی ملک کی بعض ممتاز شخصیتیں انھیں میں سے ہیں۔[1]

---

[1] تعجب ہے کہ بعض مصنفین نے کشمیریوں کی بہت مذمت کی ہے مثلاً شیخ حزیں کشمیریوں کی ہجو کرتے ہوئے لکھتے ہیں (ملاحظہ ہو روز روشن بذیل زیرک):

شرح قومے شنو از من کہ ندارند نسب ۔۔۔ ادب و شرم و حیا غیرت از ایشاں مطلب
کس ندیدہ بوطن مُردن کشمیری را ۔۔۔ در جہاں چوں صفِ مورند رواں دانہ طلب
یک ازیں قوم ندیداست دو لوبت کشمیر ۔۔۔ بر نہ گردد چو ز سوراخ بر آید عقرب
جز و نقطے کہ کند خامہ ایشاں تحریر ۔۔۔ ہزج و سالم آں را ہمہ بینی اخرب

وغیرہ وغیرہ اس کا جواب "زیرک" ایک کشمیری برہمن نے دیا جسے ہم نظرانداز کرتے ہیں۔ ابوالفضل اور عہد مغلیہ کے دوسرے مصنفین اگرچہ کشمیریوں کے خلاف رائے رکھتے ہیں لیکن ان کی ذہانت، پھولوں سے محبت اور بعض دوسرے اوصاف کی تعریف کرتے ہیں [آئین۔ جیرٹ ۔ ۳۵۱]: خافی خاں کا بیان ہے کہ "مردم آں گل زمین بہ حدّت فہم و ذکا و جوہر رشادت آراستہ اند" (ج ۱: ص ۳۴۳) اورنگ زیب عالمگیر اپنے خطوط میں کشمیریوں کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے "کشمیری دریں صوبہ نیست کہ مقرر کنیم" (رقعات ص ۹۵) نیز برنیر (ترجمہ اردو ج ۱۔ ص ۷)

یہی دو طبقات ہیں جنھوں نے فارسی کا بہت سا لٹریچر پیدا کیا اور انھی میں فارسی تعلیم نے بہت رواج پایا۔ تاہم ان کے علاوہ کھتری اور بعض دوسری ذاتوں کے مصنفین بھی کافی تعداد میں موجود ہیں کیونکہ مغلوں کے آخری ایام میں تقریباً تمام ہندو قوم فارسی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

فارسی کی مقبولیت کے اسباب گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ہندوؤں نے فارسی تعلیم کی ابتدا سلطان سکندر لودھی کے عہد میں کی۔ اکبر کے زمانے میں اس کی ترویج کی منظم ہمہ گیر کوشش کی گئی۔ بلوخمن کا خیال ہے کہ ہندوؤں نے صرف اقتصادی اسباب کی بنا پر فارسی تعلیم حاصل کی۔ دو تاہر پہلے ہندی میں تھے اور بابر کے بیان کے مطابق عامل، متاجر اور دوسرے عہدہ دار ہندو ہی تھے لیکن جب راجا ٹوڈرمل کے اعلان نے صورتِ حالات کو دگرگوں کر دیا تو انھوں نے بلا تامل دوسری راہ اختیار کر لی اسی میں ان کی ترقی اور عروج کا راز پنہاں ہے۔

کیا فارسی تعلیم ہندوؤں کے لیے مضر ثابت ہوئی! بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فارسی زبان کی تحصیل ہندوؤں کے لیے مضر ثابت ہوئی لیکن واقعات و حالات کے اعتبار سے یہ گمان صحیح نہیں۔ تمدنی اور عمرانی نقطۂ نظر سے یہ اختلاط بہت مفید ثابت ہوا۔ انسانوں کے دو گروہ قوانینِ قدرت کے دباؤ سے ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور ان کے اس امتزاج سے ایک نئے قسم کا کلچر نمودار ہوا۔ ہندوؤں کی علیحدگی اور تنفر پسندی کے متعلق علامہ البیرونی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے پیشِ نظر فارسی اور اسلامی علوم کے ساتھ ہندوؤں کا یہ ارتباط تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے۔ فارسی بہ حیثیت ایک سرکاری زبان کے، ہندوؤں کی آزادانہ ترقی میں

خارج ثابت نہیں ہوئی چنانچہ ہیول اپنی کتاب "ایرین رول ان انڈیا" میں اسی موضوع پر لکھتا ہے:-

"فارسی زبان انگریزی زبان کی نسبت ہندوؤں کے لیے بہت آسان تھی۔ ہندو وزیر معاملات سلطنت میں اسی طرح چابک دست ہوتے تھے اس طرح مسلمان وزیر۔ اس سے معلوم ہوا کہ فارسی زبان ہندوؤں کی ترقی کے لیے سنگ راہ نہ تھی"

(انگریزی سے ترجمہ)

ہندوؤں کی تعلیم کا انتظام

اب ہم ہندوؤں کی فارسی تعلیم کے انتظام کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں جو کچھ بیان ہوگا وہ عہد مغلیہ کے سارے نظام تعلیم کا ایک خاکہ ہے۔ چونکہ ہمارے مضمون کا تعلق صرف ہندوؤں سے ہے اس لیے ہم نے جابجا ہندوؤں ہی کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔

ہندستان میں پرانے زمانے سے تعلیم کا انتظام پنچایتوں کے سپرد تھا۔ پنڈت دیہی نظام کا ایک جزو لاینفک ہوتا تھا۔ گانو کے لوگ اس کی ضروریات زندگی کو پورا کرتے تھے۔ یہ پنڈت اپنے مکان پر یا کسی اور معین مقام پر لڑکوں کو تعلیم دیا کرتا تھا۔

مغلوں سے پہلے ہندستان میں اسلامی مدارس بکثرت موجود تھے جن میں سے بعض تو اوقاف کی آمدنی سے اور بعض عطیات پر چلتے تھے۔ ابتدائی تعلیم مکاتب اور مساجد میں ہوتی تھی جب طالب علم ان منازل کو طے کر چکتا تو پھر ان مراکز علمی کی طرف متوجہ ہوتا جن کا سارے ملک میں شہرہ ہوتا تھا۔ ان مراکز میں طالب علم عربی فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے تھے

اور نصاب کو ختم کرنے کے بعد فارغ التحصیل ہو جاتے تھے۔

عہدِ اکبری اکبر کے زمانے میں مکاتب اور مدارس کو زیادہ رونق حاصل ہوئی۔ یہی زمانہ ہو جب کہ ہندو اور مسلمان بکثرت ایک جگہ تعلیم حاصل کرنے لگے تھے۔ آئینِ اکبری میں تعلیم، نصاب تعلیم اور طریق تعلیم کے متعلق ایک آئین موجود ہو:-

"آئین آموزش: در ہر کشور خاصہ دریں آباد بوم سالہا نو آموز را بدبستان باز دارند و مفردات حروف معجم را بچندیں گونہ اعراب آموزش رود۔ بفراواں نامہ گرامی انفاس رائگاں شود۔ اخلاق، حساب، سیاق، فلاحت، مساحت، ہندسہ، نجوم، رمل، تدبیر منزل، سیاستِ مدن، طب، منطق، طبیعی، ریاضی، الٰہی، تاریخ مرتبہ مرتبہ اندوزد و از ہندی علوم بیاکرن، نیای، بیدانت و پاتنجل برخواند و ہر کس را از بایست وقت درنگزارند۔ ازیں طرز آگہی مکتبہا رونقِ دیگر گرفت و مدرسہا فروغ تازہ یافت"

مکاتب اور مدارس غالباً اکبر کے زمانے سے مشترکہ مکاتب کا دستور قایم ہوا اور مغلیہ سلطنت کے زوال و انحطاط کے بعد تک بحال رہا۔ مکتب کا مفہوم یہ ہو کہ محلّے میں کوئی تعلیم یافتہ فرد اپنے ذاتی مکان میں یا کرائے کے مکان میں ایک مدرسہ کھول لیتا تھا جس میں لوگ اپنے لڑکوں کو بغرض تعلیم بھیجا کرتے تھے۔ معلّم کا ذریعۂ معاش انھی اطفال کی امداد پر منحصر تھا۔ بعض اوقات مشترکہ تعلیم کا انتظام مساجد میں بھی ہوتا تھا۔ مسلمانوں میں مساجد ہمیشہ علم و تعلیم کی اشاعت کا ذریعہ بنی رہی ہیں۔ ہندوؤں نے جب فارسی کو اپنایا تو وہ اپنے مسلمان ہم مکتبوں کے ساتھ مساجد میں بھی

تعلیم حاصل کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ فارسی کے مکاتب
مسلمان "میاں جی" اور بعض صورتوں میں ہندو معلموں" کے زیر

خورشید جہاں نما (پچھلی صدی کی ایک تصنیف ہے) کا بیان ہے کہ ہنگا
کی حکومت کی ابتدا میں بے شمار مدارس اور مکاتب عربی فارسی تعلیم کے لیے موجود
تھے جب انگریز ہندستان میں اچھی طرح سے جم گئے تو انھوں نے اپنی تعلیمی پالیسی
پر غور کیا پہلے پہل تو ایک عرصے تک وہ ہندستانیوں کی تعلیم کے مخالف رہے
ازاں بعد وارن ہیسٹنگز کے زیرِ ہدایت ان کا مسلک یہ تھا کہ ہندستان میں فارسی عربی،
سنسکرت تعلیم کو رواج دینا چاہیے۔ چنانچہ وارن ہیسٹنگز نے کلکتے میں "مدرسۂ عالیہ"
قایم کیا اور سنسکرت کی تعلیم کے لیے ولیم ڈنکن نے بنارس میں سنسکرت کالج کا
افتتاح کیا۔ اس سلسلے میں آگرہ کالج اور دہلی کالج کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا
ہے جس سے بے شمار ہندو مسلمان مصنف نکلے۔ ان سب کالجوں کو سرکاری امداد
ملتی تھی ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے نے تعلیمی پالیسی کا رخ تبدیل کر دیا تھا
اور فارسی سنسکرت کی بجائے ہندستان میں انگریزی تعلیم کی ترویج ضروری قرار
دی گئی۔ یہی نہیں بلکہ ۱۸۴۴ء کے قریب فارسی زبان کی کاروباری حیثیت کو
بھی مٹا دیا گیا اور دفاتر میں فارسی کی جگہ انگریزی کو دخل حاصل ہو گیا۔

نصابِ تعلیم فارسی کی ابتدائی تعلیم میں بول چال، خط و کتابت اور اخلاقی
حکایات کی کتابیں ہوتی تھیں مثلاً پند نامۂ عطار، کریما، مامقیماں
دستور الصبیان، نصاب الصبیان، اخلاقِ محسنی وغیرہ

ثانوی تعلیم کے لیے گلستاں، بوستاں، یوسف زلیخا، انشائے خلیفہ،
انشائے مادھورام، سہ نثر ظہوری، پنج رقعہ، اخلاق ناصری، بہار دانش، انوار سہیلی،
سکندر نامہ، شاہ نامہ وغیرہ

۱۔ بندرا بن داس خوشگو اپنے تذکرے میں لکھتا ہے کہ "میں اور لالہ حکیم چند ندرت ایک دوسرے کے مخلص دوست تھے اور دونوں میاں محمد عابد کے پاس اخلاقِ ناصری پڑھا کرتے تھے۔

چندر بھان برہمن اپنے فرزند خواجہ تیج بھان کو ایک مکتوب میں گلستاں، بوستاں، اخلاقِ جلالی اور اخلاقِ ناصری کے دائمی مطالعے کی سفارش کرتا ہے۔ یہی مصنف اپنی کتاب چار چمن میں اس مسئلے پر زیادہ تفصیل سے بحث کرتا ہے۔ ہم اس اقتباس کو یہاں درج کرتے ہیں:۔

"چوں در آغازِ حال پاس بعضے از شرائط در تہذیب الاخلاق مطلوب ست۔ می باید کہ پیوستہ گوش بر سخنانِ بزرگاں نہد و مطابق آں عمل نماید و مطالعۂ اخلاقِ ناصری و اخلاقِ جلالی و گلستان و بوستاں دستمایۂ وقت خود ساختہ یک لحظہ از حصولِ سعادت علم با عمل غافل نباشد۔ اگرچہ اصل مطلب در قابلیت ظاہر ربط کلام متانت عبارت است اما حُسنِ خط اعتبار دیگر دارد و بوسیلۂ ایں جا در مجلسِ بزرگاں تواں یافت۔ آں فرزندِ عزیز کوشش نماید کہ در ہنر فائق گردد و با ایں حال اگر سیاق و نویسندگی نیز حاصل شود بہتر و خوب تر خواہد بود۔ چہ منشی سیاق داں کم بہم مے رسد و سیاق داں منشی کمتر مے باشد و اگر در شخصے ہر دو ہنر جمع شود نادر است، و نور علیٰ نور۔ منشی ہماں ست کہ راز دار باشد و نویسندہ ہماں کہ نیک ذات است۔ کمترین بندگان کہ در سلکِ منشیانِ آستانِ خلافت نشاں منتظم است اگرچہ جائے بشریت و غفلت غالب ست، اما در راز داری با صد زبان ہمچو غنچہ بستہ دہاں است۔ اگرچہ علم فارسی

دستگاہ بسیار دارد وا حاطۂ جمیع آنہا از حد بشریت متجاوز لیکن اولاً
بجہت افتتاح ابواب سخن بطریق تیمن مطالعۂ گلستان و بوستان
و رقعات ملا جامی از ضروریات است و چون تقدیر شعور بہم رسد
خواندن کتب اخلاق مثل اخلاق ناصری و اخلاق جلالی و مطالعۂ
تواریخ سلف مثل حبیب السیر و روضۃ الصفا و روضۃ السلاطین
و تاریخ گزیدہ و تاریخ طبری و ظفرنامہ و اکبرنامہ و امثال آں ضروری
کہ ہم متانت سخن می رسد و ہم اطلاع بر احوال جہان و جہانیاں
حاصل شود و در مجالس و محافل بکار می آید و از دیوانہا و مثنویہا ے
از استادان روزگار کہ این نیاز مند در عنفوان شباب مطالعہ نمود
اسامی گرامی طبقۂ والا را در ذیل این رقیمہ مرقوم مے سازد تا ایں فرزند
بقدر فرصت ہر چہ تواند از تصانیف این بزرگان مطالعہ نماید تا برکتے
و فرحتے و مایۂ استعداد حاصل گردد و سر رشتۂ سخن بدست آید:
حکیم سنائی، ملا روم، شمس تبریز، شیخ فرید الدین عطار، شیخ سعدی،
خواجہ حافظ، شیخ کرمانی، ملا جامی و دیگر شعرا و بلغاے مشہور روزگار
مثل سر دفتر شعراے روزگار رودکی، حکیم قطران، عسجدی، عنصری،
فردوسی، فرخی، ناصر خسرو، جمال الدین عبدالرزاق، کمال اسمٰعیل،
خاقانی، انوری، امیر خسرو، حسن دہلوی، ملا جامی، ظہیر فاریابی،
کمال خجندی، نظامی عروضی سمرقندی، عمعق بخاری، عبدالواسع جبلی،
رکن صاین، محی الدین (؟)، مسعود بک، فرید الدین (؟)، عثمان
مختاری، ناصر بخاری، ابن یمین، حکیم سوزنی، فرید کاتب، ابوالعلا گنجوی،
ازرقی، فلکی سوداتی، بابا فغانی، خواجو کرمانی، آتشی، ملا بنائی، ملا عماد

فغانی، خواجہ عبید زاکانی، بساطی، لطف اللہ حلوائی، رشید وطواط، اثیر اخسیکتی، اثیر ادمانی ۔ واضح ضمیر ہند پذیر فرزند نیکوکار باد کہ چوں در عنفوان حال خاطر از مطالعۂ کتب متقدمین فی الجملہ فراغ یافت طبع سخن دوست را میل بسخنان متاخرین بہم رسید تا آں کہ شروع در بہم رسانیدن دیوانہا و مثنویہا بمرور ایام نسخہ بسیارے بدست آورد و بعد از مطالعۂ ایشاں بشاگرداں داد از آں جملہ اسامی بعضے از ارباب سخن این ست۔ اہلی، ہلالی، محتشم، وحشی، قاضی نور، نرگس، مخفی، امیدی، میرزا قاسم گونہ آبادی، ملا زبانی، پرتوی، حیرانی، حسابی، صبری، ضمیری، رشکی، حسانی، ہلاکی، نظیری، نوعی، ناظم لنگا، میر حیدر، میر معصوم، نظیر مشہدی، ولی دشت بیاضی و دیگر ارباب سخن و اہل طبع کہ صاحب دیوان و مثنوی اند و اظہار تفصیل اسامی آنہا دریں نسخۂ مختصر گنجائش ندارد۔"

(چہار چمن قلمی ورق ۶۴ تا ۶۵)

اعلیٰ تعلیم کے لیے ضروری ہوا کرتا تھا کہ طالب علم ایسے مقامات کا سفر کریں جہاں خاص طور پر نامور استاد مقیم ہوں۔ اعلیٰ درجے کے طالب علم صرف و نحو، عروض، قافیہ، منطق، شعر و شاعری کے علاوہ عربی تعلیم بھی حاصل کرتے تھے۔ اگرچہ ہندوؤں میں عربی تعلیم کا رواج کم تھا مگر بعض شوقین طالب علم عربی بھی حاصل کرتے تھے۔ لچھمن سنگھ غیوری نے تحریر اقلیدس شرح چغمنی وغیرہ کو نہایت خوش اسلوبی سے ازبر کیا تھا (ملاحظہ ہو مخزن الغرائب)۔ لچھمی نراین دہلوی منطق اور فلسفے کا بہت بڑا عالم تھا۔ اٹھارھویں صدی میں حساب وغیرہ کی طرف بہت توجہ ہوئی چنانچہ دیوان کانجی، رتن سنگھ زخمی، منولال، بھجولال،



خوشخطی کا نمونہ ـ منشی نراین داس

تمکین وغیرہ حساب کے اچھے خاصے ماہر تھے۔ اس زمانے میں فلسفے اور طب کو بھی بہت زیادہ رواج ہوا۔ رتن سنگھ زخمی، میرزا محمد حسن قتیل (سابق دیوالی سنگھ) منولال فلسفی فلسفے میں بہت نام آور ہوئے۔

انشا، سیاق اور خوش خطی

لیکن سلطنتِ مغلیہ میں ہندوؤں نے سب سے زیادہ جس چیز کی طرف توجہ کی وہ انشا، سیاق، وقایع نگاری اور خوش خطی تھی۔ یہ علوم و فنون حکومت کے کاروبار میں ممد و معاون ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں نے ملازمت پیشہ گروہ ہونے کی حیثیت سے انھی فنون کو زیادہ اپنایا۔ شاعری، تاریخ اور ادب فضیلت کے نشانات تھے اور ہر تعلیم یافتہ شخص کچھ نہ کچھ فکر سخن کرتا تھا۔ وارستہ سیالکوٹی نے بہت کم شعر لکھے ہیں مگر پھر بھی تخلص موجود ہے چونکہ یہ لوگ بادشاہوں کے پاس ملازم ہوا کرتے تھے اس لیے وقایع نگاری اور تاریخ نویسی کے مواقع ان کے لیے بہت آسان تھے۔ خوش خطی مشرق میں علوم کی اشاعت کا ایک بہت بڑا سبب رہی ہے۔ علی الخصوص مسلمانوں نے اس فن کو بہت ترقی دی جیسا کہ آرنلڈ صاحب نے اپنی کتاب "مسلمانوں کی مصوری" میں بیان کیا ہے۔ ہندوؤں نے بھی خوش خطی میں کمال پیدا کیا اور تذکرۂ خوش نویسان میں کم و بیش بیس اعلیٰ خوش نویسوں کے حالات درج ہیں۔ غرض انشا، خط و کتابت، سیاق، تاریخ اور خوش خطی ہندوؤں کے نصابِ تعلیم کا ایک ضروری جزو ہوتا تھا۔ منشی سجان رائے بٹالوی خلاصۃ المکاتیب کے دیباچے میں لکھتا ہے:۔

"چوں اکثر اوقات بفنِ مکتوب نویسی کہ عبارت از منشی گری بودہ باشد۔ بملازمت صاحبانِ دولت و اقبال و ناظمان ملک و مال بسر بردہ، بنابراں فرزندان کمترین بندگان، نیز طریقۂ نوکری

را موروثی تصور نمودہ و سلیقۂ منشی گری از فنون دیگر بہتر دانستہ
بتحصیل و تکمیل فن انشا تقید دارند" (قلمی ورق ۳۰)

چونکہ فارسی تعلیم بجائے کسی روحانی فایدے کے معاش کی خاطر حاصل کی جاتی تھی اس لیے عام لوگ اپنے بچّوں کو بہترین نثّار بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ استاد جی کے پاس فرامین و مراسلات کا ایک ذخیرۂ وافر موجود رہتا اور طالب علم اکثر صورتوں میں ان نمونوں کو حفظ کر لیتے۔ انشا کے خلیفہ اس سلسلے میں بہت مقبول رہی ہے۔ درجۂ وسطی (یا ثانیہ) کے بعد لوگ ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ملازمت کے لیے بڑا موقعہ موجود رہتا تھا بعض اوقات موروثی حق کی بنا پر ملازمت جلد مل جاتی تھی ورنہ ایک شخص معمولی منصبوں میں شامل ہو جاتا تھا اور پھر ترقی کرتے کرتے دیوان یا منشور جیسے رتبۂ عالی تک پہنچ سکتا تھا۔

ہمہ داں بننے کا دستور جو لوگ علم کے زیادہ شائق ہوتے تھے وہ بڑے بڑے علمی مراکز کی طرف متوجہ ہوتے اور بڑے بڑے اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے، شعر و شاعری میں اصلاح لیتے، وہ ادب اور شعر کا ذوق جو بزرگوں کے فیضِ صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا پیدا کرنے کی کوشش کرتے جیسا کہ مشرق میں رواج ہے بیک وقت شاعر، ادیب، مؤرخ، فلسفی، منشی، نثّار اور کیا کچھ نہ ہوتے۔ ہم ذیل میں منشی لچھمی نراین تہیہ کھنپاوی کے حالات جو رقعات کے دیباچے میں مرقوم ہیں درج کرتے ہیں تاکہ اس زمانے کی تعلیم کا سرسری سا اندازہ ہو جائے:-

"قوم کھتری، موطن اصلی او قصبہ کنجاہ از مضافات دار السلطنت لاہور است۔ رائے جسونت رائے جد او بمنشی در عہد عالمگیر بادشاہ

انار اللہ برہانہ جہت تلاش معاش وارد شاہ جہان آباد شد و در شہر کہنہ محلہ وکیل پورہ رخت اقامت انداختہ بوکالت امرائے عظام بادشاہی وکالت ناظم صوبہ کابل سرفرازی داشت منشی موئی الیہ در ایام طفولیت کتب متداولہ فارسی کہ رائج تدریس اطفال اند از مولانائے شیخ محمد برادر زادۂ غنیمت کنجاہی دیدہ سواد خود را روشن ساخت و در سن دروازہ سالگی متوجہ بتحصیل رسایل عروض و قوافی و اصلاح غزل گشتہ در خدمت قدوۂ فصحا و زبدۂ بلغا سخن گو و سخن داں سراج الدین علی خاں از علوم مذکورہ ذخایر اندوختہ مستثنائے روزگار شد و مختصرات صرف و نحو را از ٹیک چند متخلص بہ بہار خواندہ مایل بدیدن کتب طب کہ از ضروریات انسانیت گشتہ و عمرے در خدمت اطبائے دار الخلافہ مشغول نسخہ نویسی بودہ مدت دروازہ[۱۲] سال بمشق معالجہ اغنیا و غربائے دہلی پرداخت .... الخ

تذکرۂ نشترِ عشق میں سبقت لکھنوی کا حال یوں لکھا ہے:-

"سکھراج نام از قوم کانیتھ آنا ؤست اکثر آبائے او بملازمت عمدۃ الملک نواب اسد اللہ خاں وزیر اعظم عالمگیری بودند۔ در خوش کلامی و تحصیل صرف و نحو و منطق و بیان و معانی و معما و تاریخ و صنائع و بدائع و حساب و طب و اصطلاحات و تحقیق مسایل صوفیہ گوئے سبقت ربود و از میرزا عبد القادر بیدل اصلاح مے گرفت"

.... الخ

ہندو اساتذہ | یہ تو ظاہر ہے کہ مکاتب میں مسلمان استاد ہوا کرتے تھے اور ہندو مسلمان بچے سب آشتی اور یگانگت کے ساتھ استاد جی سے

اخذ علم کرتے تھے مگر اکثر مثالیں ایسی بھی ہیں جن میں ہندو مُعلّم ہوتا تھا ہندوؤں کے حالات میں ایسے بے شمار لوگ مل جائیں گے جن کا پیشہ معلّمی ہوتا تھا اور وہ شہر یا گانو کی تعلیم کے علمبردار ہوتے تھے۔ لالہ چنی لال ذرّہ اٹھارھویں صدی کے ایک مشہور مُعلّم تھے جن کے مکتب میں ہندو مسلمان طالب علم پڑھا کرتے تھے۔ مولانا مفتی لطف اللہ صاحب مرحوم کے اُستادِ فارسی منشی سوہن لال تھے[1]۔ رائے سرب سنگھ دیوانہ جعفر علی حسرت کے اُستاد تھے (یہ حسرت قلندر بخش جرأت کے اُستاد تھے) گزشتہ صدی کے اوائل میں اکثر ہندو اہل علم پیشۂ معلّمی اختیار کر لینے کی وجہ سے اُستاد کہلانے لگ گئے تھے۔ یہی وجہ ہی کہ بلوخمن نے (ترجمہ آئین اکبری ص ۱۵۳) کہا ہی کہ اٹھارھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ہندو فارسی زبان میں مسلمانوں کے استاد بن گئے تھے۔

چند نامور اساتذہ آج کل جو کام اعلیٰ درجے کے کالجوں سے لیا جاتا ہی وہی کام زبردست علمی شخصیتوں سے لیا جاتا تھا۔ ان بزرگوں کے گھر اہل علم کے مجمعے ہوتے تھے۔ شائقین علم اطراف واکناف سے اُن کے پاس جمع ہوتے اور اُن سے کسب فیض کرتے۔ اِس زمانے کی تعلیم کا حال ان بزرگ شخصیتوں کے ذکر کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ افسوس ہی کہ ہمیں تمام اساتذہ کا حال معلوم نہیں ہو سکا۔ صرف شعرا کے حالات میں ان کے استاد کا ذکر آجاتا ہی اس لیے ہم ذیل کے بیان میں ایک دو شخصیتوں کے علاوہ صرف اکابرِ شعرا کا ذکر کریں گے اور ان کے ساتھ ان ہندو شعرا کو بھی گنائیں گے جنھیں ان سے شرف تلمذ حاصل تھا اس تطویل سے ہمارا مقصد یہ ہی کہ تعلیم کا تصوّر زیادہ وضاحت کے ساتھ ذہن نشین ہو جائے۔ عہد شاہجہانی میں شمالی ہندستان میں ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی

---

[1] معارف ۱۹۱۸

ایک بہت بڑے عالم تھے جن کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کے لیے دُور دراز سے لوگ آتے تھے۔ خلاصۃ التواریخ کا مُصنّف جس نے ۱۱۰۷ھ میں اپنی کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا، لکھتا ہے کہ سیالکوٹ کا شہر مولانا عبدالحکیم اور ان کے فرزند مولانا عبداللہ کے طفیل علمی اعتبار سے بہت ممتاز تھا۔ ہمارے ہندو مُصنّفین میں سے منشی چندر بھان برہمن اُن کے ایک ممتاز شاگرد ہیں۔ یہ وہی برہمن ہیں جنھیں شاہ جہاں پیار سے "ہندوئے فارسی داں" کہا کرتا تھا۔ عملِ صالح کے مُصنّف محمد صالح کا بیان ہے کہ برہمن نے ابتدائی تعلیم مُلّا عبدالحکیم سے حاصل کی تھی۔ اسی زمانے میں مُلّا شاہ بدخشی بھی مرجع خاص وعام تھے۔ برہمن اور بنوالی داس وَلی دونوں نے اس چشمۂ معرفت سے پیاس بجھائی ہے۔ وَلی کا متصوفانہ لٹریچر غالباً اسی بزرگ کے طفیل ہے یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وَلی، برہمن، ہندو وغیرہ شعرائے عہد شاہ جہانی نے شعر وسخن میں کس کس استاد سے اصلاح لی تھی۔

اورنگ زیب کے عہد میں شیخ محمد افضل سرخوش جنھوں نے تذکرۂ کلمات الشعرا لکھا ہے استادِ کُل خیال کیے جاتے تھے۔ ہندوؤں کا سب سے بڑا فلسفی شاعر بھوپت رائے بیراگی اسی سرخوش کا شاگرد تھا۔ ان کے علاوہ بندرابن داس خوشگو کو بھی انھی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔

اس کے بعد جو زمانہ آیا اُس میں شعرا میں دو ممتاز شخصیتیں معرضِ وجود میں آئیں۔ میرزا عبدالقادر بیدل اور شیخ سراج الدین علی آرزو۔ بیدل متاخرین شعرا کے امام مانے جاتے ہیں ان کے ساتھ ہندستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ ہوگیا۔ ان کے بعد جتنے لوگ آئے ہیں تقریباً سب نے اُن کا تتبع کیا ہے۔ اسد اللہ خاں غالب بھی باوجود اپنی جدتِ طبع طرزِ بیدل کے مُقلّد

تھے۔ میرزا بیدل کے سینکڑوں ہندو مسلمان شاگرد تھے۔ ان کے دارالتربیت سے جن اکابر ہندو شعرا نے فیض حاصل کیا اُن کے نام یہ ہیں:۔ منشی امانت رائے امانت، شورام حیا، سکھ راج سبقت، سری گوپال تمیز، حضوری اور ندرت وغیرہ۔

تقریباً اسی زمانے میں امام المتاخرین سراج الدین علی خاں آرزو بھی وارد شاہ جہان آباد ہوئے۔ آرزو فن شعر سے کہیں زیادہ زبان دانی میں کمال رکھتے تھے۔ شعر و شاعری کی تنقید آپ پر ختم تھی۔ خان آرزو کی ذات اس عہد میں اپنی علمیت کے باعث دوست دشمن سب پر مسلّم تھی۔ یا یوں سمجھیے کہ اس زمانے میں ایک طالب علم اپنے آپ کو علم و ادب میں کامل نہ سمجھتا تھا تاوقتیکہ وہ کسی نہ کسی وقت خان آرزو کے حلقۂ درس میں شریک نہ ہوا ہو۔ خان آرزو بھی اپنے تلامذہ کے ساتھ بے حد شفقت کا اظہار کرتے تھے۔ خان آرزو نے مجمع النفائس میں اپنے جن شاگردوں کے حالات دیے ہیں وہ یہ ہیں:۔

بابو بالمکند شہود، پنڈت جگ کشن عشرت، رائے انند رام مخلص، بندرابن داس خوشگو۔ ان کے علاوہ ٹیک چند بہار کو بھی ان سے نسبت تلمذ حاصل ہے۔ یہ یاد رہے کہ بہار نے ایک جامع لغت لکھی ہے جو فارسی زبان کی سب سے بڑی اور مستند لغت ہے۔ اس میں بہار نے اپنے اُستاد خان آرزو کے اقوال پر بھی نکتہ چینی کی ہے۔ چنانچہ خان آرزو اپنی تصنیف "مثمر" (قلمی ورق ۱۳۴) میں لکھتے ہیں:۔

"وبہار عجم وغیرہ کہ از یاران فقیر آرزو ست و مثل او دریں عصر بہم نرسیدہ و دریں کتاب گاہے با او صلح ست و گاہے جنگ بسیار"

اس زمانے میں بعض اور ممتاز ہستیاں بھی موجود تھیں مثلاً شرف الدین پیام،

میرزا عبدالغنی بیگ قبول، میرزا گرامی، حکیم حسین شہرت، سعداللہ گلشن لیکن خان آرزو ان سب کے امام تھے۔ ان اکابر میں سے ہر ایک کے سلسلۂ درس میں ہندو شعرا موجود تھے سیالکوٹ میں میر محمد علی رائج اُستادی کا درجہ رکھتے تھے۔ مشہور محقق وارستہ سیالکوٹی انھی کا شاگرد تھا کشن چند اخلاص اور نشاط میرزا عبدالغنی بیگ قبول کے شاگرد تھے۔

بساون لال بیدار، سرب سکھ خاکستر اور ثروت مظہر جان جاں کے شاگرد تھے۔

ان کے علاوہ اکابر اساتذہ میں سے میرزا فاخر مکین، میر افضل ثابت، مقیم آزاد کشمیری، میر غلام علی آزاد بلگرامی، شیخ علی حزیں استاد کُل مانے جاتے تھے۔ میرزا فاخر کے ایک شاگرد رشید موہن لال انیس نے ایک تذکرہ انیس الاحبا کے نام سے لکھا ہے جس میں میرزا کے تمام ہندو مسلمان شاگردوں کے حالات دیے ہیں۔ راجا رام نراین موزوں شیخ محمد علی حزیں کے شاگرد تھے شفیق اورنگ آبادی کو آزاد بلگرامی سے نسبت تلمّذ تھی۔

سکھوں کے عہد میں پنجاب میں مولانا نور احمد صاحب چشتی ایک فاضل اجل تھے جنھوں نے تحقیقات چشتی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اکثر ہندو اُن کے شاگرد تھے۔ دیوان امرناتھ اکبری مصنف ظفر نامہ رنجیت سنگھ اُن کا شاگرد تھا۔ پچھلی صدی کے اکابر اساتذہ کے حالات زیادہ معلوم نہ ہو سکے۔ میرزا غالب، میرزا احمد حسن قتیل اور میرزا ہرگوپال تفتہ سے پہلے میاں نورالعین واقف بٹالوی مشہور شعرا میں سے تھے جن سے اکثر ہندو شعرا نے تربیت حاصل کی

مسلمان اساتذہ کی ہندو شاگردوں پر شفقت ہم نے اساتذہ کا جو حال بیان کیا ہے وہ

سرسری ہی اس کا مقصد جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہی صرف یہ ہی کہ ہندو اہلِ قلم اور مسلمان اُستادوں کے باہمی تعلقات کا کچھ اندازہ ہو سکے آج جب کہ ہندستان کے طول و عرض میں ہندو اور مسلمانوں میں یک گونہ مغائرت پائی جاتی ہی یہ بیان شاید تعجب انگیز ہو لیکن پُرانے زمانے کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ ہندستان ایک بہشت تھا جس میں ہندو مسلمان برادرانہ زندگی بسر کرتے تھے ان کے مکاتب آج کل کی طرح جُدا جُدا نہ تھے بلکہ سب کی تعلیم یکجا ہوتی تھی اُستاد کو اپنے ہندو شاگرد کی تعلیم کا اُسی طرح خیال تھا جس طرح مسلمان شاگرد کی بہبود کی فکر۔ حالات ہمیں بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں ہندو مسلمان کی چنداں تمیز نہیں تھی، ایک اخوت تھی، برادرانہ تعلقات تھے، مؤدت اور یگانگت تھی اور آج جو تلخی ہندستان میں پائی جاتی ہی اس کا نام و نشان بھی موجود نہ تھا۔

حقیقت رائے کا افسانہ اس سلسلے میں یہ عرض کرنا بے حد ضروری معلوم ہوتا ہی کہ ہندستان کے بعض حلقوں میں حقیقت رائے کے افسانے کو جو ترویج و اشاعت حاصل ہو رہی ہی۔ اس کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں۔ ڈاکٹر گوکل چند نارنگ نے اپنی کتاب "ٹرانسفارمیشن آف دی سکھزم" میں اس موہوم افسانے کو تاریخی رنگ دینے کی کوشش کی ہی لیکن ہمیں اطمینان ہی کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ان کا بیان ہی کہ "اس قصّے کا ذکر انگریز مورخین نے نہیں کیا صرف ملک راج بھلّہ جو موجودہ عہد کے ایک پنجابی مُصنّف ہیں اس حکایت کو بیان کرتے ہیں اور اس زمانے کے ایک پنجابی شاعر ملکھی رام نے اس کو منظوم کیا ہی" اور بس۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہی سوائے منشی سوہن لال مصنّف عمدۃ التواریخ کے جو خود مہاراجا رنجیت سنگھ کے وقائع نویس تھے۔ فارسی مورخین میں کسی نے اس افسانے کا ذکر نہیں کیا یہ واقعہ بقول ڈاکٹر

نارنگ صاحب محمد شاہی عہد میں وقوع پزیر ہوا ہے لیکن اس کے بعد بے شمار مؤرخین نے مستند تاریخی کتابیں لکھی ہیں۔ ان سب کی خاموشی یہ کہہ رہی ہے کہ اس افسانے کی کوئی اصل نہیں اور موجودہ عہد کے خود غرض لوگوں نے اس کو خاص مقاصد سے رواج دیا ورنہ حقیقت میں "حقیقت رائے" کا قصہ بے حقیقت ہے۔

حقیقت رائے کا قصہ یہ ہے کہ ایک مسلمان استاد نے سیالکوٹ کے شہر میں حقیقت رائے پر اسلام کے متعلق ہتک آمیز الفاظ کہنے کے عوض قاضی کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا تھا جس پر قاضی نے اس کو پھانسی کی سزا دے دی لیکن ہمارا دعویٰ ہے کہ اس زمانے میں ہندو شاگردوں اور مسلمان اساتذہ میں جس قسم کے تعلقات قائم تھے وہ آج موجود نہیں۔ مسلمان استاد اپنے شاگرد کا روحانی باپ ہونے کی حیثیت سے اس کی بہبود و رفاہ کا دل سے خواہش مند ہوتا تھا اور تلمیذ استاد کو اب روحانی خیال کرتے ہوئے عزت و احترام کے تحفے اُس کے قدموں پر نچھاور کرتا تھا۔ ذیل میں ہم بعض اقتباسات مسلمان اساتذہ اور ہندو شاگردوں کے متعلق لکھتے ہیں:۔

خان آرزو مجمع النفائس میں اپنے ہندو شاگردوں کے متعلق لکھتے ہیں:۔

شہود تخلص جوانے است مہذب، مؤدب از قوم کایستھ۔ آبا و اجدادش ہمیشہ در سرزمین بنگالہ و بہار بعمدگی امتیاز داشتند، بوساطت خط عزیز القدر خوشگو با فقیر آرزو ملاقات نمودہ۔ نہیلے حدید الفکر و جید الطبع بنظر آمد۔ ہنوز نہال مشق سست اگر مساعدت روزگارش دست دہد امید است کہ بپایۂ اعلیٰ برسد، انشاء اللہ تعالیٰ ......الخ

عشرت:- "از براہمۂ کشمیر ست۔ نیکے جوان اہلے است۔ خدا از چشم
مردم نخوردش نگاہ دارد، بےچارہ مرد غریب باوفائے ست"..... الخ
بحوالہ خوشگو۔ "از مدت بیست و پنج سال تخمیناً بایں ہیچمدان ربط کلی
بہم رسانیدہ و ایں عاجز ہم در تربیت او بتقصیر از خود راضی نشدہ
و نمیشنت"
انند رام مخلص کے تعلقات خان آرزو کے ساتھ دوستانہ بھی تھے اور
مربیانہ بھی۔ خان آرزو لکھتے ہیں:-
"چھتری خوش اخلاق باعث بودن فقیر آرزو در شاہ جہان
آباد دہلی اخلاص اوست"...... الخ
تذکرۂ نشتر عشق میں لکھا ہے، کہ "چوں در ۱۱۳۲ھ (آرزو)
در دارالخلافہ شاہ جہاں آباد وارد شد۔ او را با انند رام مخلص اتفاق
مصاحبت افتاد۔ بمناسبت طبع و حق آشنائی برائے خان مشارٌ الیہ
جاگیر و منصب و خطاب استعداد خانی از حضور حضرت جہاں بانی
حاصل نمود۔ بیز خدمت گزاری خان موصوف از خود مے نمود"
بندرابن داس خوشگو نے ایک تذکرہ لکھا ہے جس کا نام سفینہ ہے۔
اس میں وہ جہاں کہیں خان آرزو کا نام لیتا ہے "خان صاحب قبلۂ نیازمنداں"
کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ انند رام مخلص کے رقعات سے بھی انتہائی خلوص اور
عقیدت کا پتا چلتا ہے جو اُسے خان آرزو سے تھی۔

ہندو شاگردوں کی عقیدت شفیق اورنگ آبادی کو اپنے اُستاد آزاد بلگرامی
سے کمال عقیدت مندی تھی اور جہاں
کہیں تالیفات میں اُن کا ذکر آیا ہے اُن کا نام بڑے ادب و احترام اور خلوص

ارادت سے کیا ہے اور ہر جگہ انھیں "میر صاحب قبلہ"، "پیر و مرشد" یا "قبلۂ و کعبۂ برحق" اور اپنے آپ کو "غلام" لکھا ہے۔ گلِ رعنا (جو شاعروں کا تذکرہ ہے) میں اس نے آزاد کا تذکرہ نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ اپنے کلام میں جابجا حضرت کے کمال اور ان کے تعلقات و عنایات کا ذکر کیا ہے۔ ایک پُرزور قصیدہ ان کی مدح میں لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے:۔

سرورِ ہر دو جہاں آزاد ہے — والیِ کون و مکاں آزاد ہے
کُنت کنزاً کے معانی پر خبر — واقفِ سرِّ نہاں آزاد ہے
مرکزِ ادوارِ چرخِ چنبری — قطب الاقطابِ زماں آزاد ہے

ایک فارسی غزل کے اشعار یوں ہیں:۔

لامکان است مقامِ آزاد — فوقِ عرش است خرامِ آزاد
صاحبِ ہر دو جہان است شفیق — ہر کہ گردید غلامِ آزاد

ہم خوفِ طوالت سے شفیق کی تالیفات میں سے زیادہ مثالیں نہیں پیش کر سکتے۔ ورنہ اس کی بہت سی غزلیں ایسی موجود ہیں جن کے ہر ہر حرف سے ارادت و عقیدت کے جذبات مترشح ہو رہے ہیں۔

اسد اللہ خاں غالب اور منشی ہرگوپال تفتہ کے تعلقات بے حد گہرے تھے۔ میرزا غالب ہرگوپال کو ازرہِ شفقت میرزا تفتہ کہا کرتے تھے۔ اُردوئے معلّٰی میں میرزا کے بے شمار خطوط تفتہ کے نام لکھے ہوئے موجود ہیں۔ میرزا کو تفتہ سے بے حد محبّت تھی اور تفتہ بھی اپنے اُستاد پر جان چھڑکتے تھے۔ اُردوئے معلّٰی کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ناداری کے ایام میں تفتہ میرزا غالب کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے چنانچہ لکھا ہے:۔

"سو رُپے کی ہنڈی وصول کر لی۔ چوبیس رُپے داروغہ کی

معرفت اٹھے تھے وہ دیے، پچاس روپے محل میں بھیج دیے، باقی
چھبیس رہے وہ بکس میں رکھ لیے.... خدا تم کو جیتا رکھے اور
اجر دے" (اُردوئے معلیٰ طبع مبارک علی صفحہ ۶۲)

ہندوؤں کے فارسی ادب کے مختلف ادوار

ہندوؤں کے فارسی لٹریچر کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور عہدِ اکبری سے شروع ہوتا ہے جس میں تصانیف کی ابتدا ہوئی اس زمانے میں تصنیفی قابلیت کی کمی کی وجہ سے بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ دوسرا دور جہانگیر کے سنِ جلوس سے لے کر شاہ جہانی عہد کے اوائل بلکہ وسط تک ممتد ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ہندو اپنی مذہبی کتابوں کو فارسی میں منتقل کرتے ہیں۔ تیسرا دور عالمگیر کے زمانے سے لے کر مغلوں کے انحطاط پر ختم ہوتا ہے۔ یہ زمانہ بہترین زمانہ ہے اس میں تاریخ، انشا، شاعری اور دیگر علوم و فنون پر بے شمار اعلیٰ کتابیں ہندو اہلِ قلم نے لکھیں۔ اعلیٰ لغت نویس، فارسی کے ماہر اور قابل سیاق داں پیدا ہوئے۔ چوتھا دور مغلوں کے انحطاط سے لے کر آج تک ہے۔ اس دور میں بہت کتابیں لکھی گئیں لیکن بے کار تصنّع، تکلف اور ناقص پیروی کی خرابیوں سے مملو!

لٹریچر کی وسعت

ہندو مصنفین نے تقریباً ہر فارسی مضمون پر طبع آزمائی کی۔ خالص مذہبی کتابوں کے علاوہ انھوں نے تاریخ، شاعری، انشا، ریاضیات، لغت، موسیقی، عروض، اخلاق، تراجم وغیرہ پر بہت سا سرمایۂ ادب پیدا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ، انشا اور ریاضی سرکاری دفاتر میں کاروبار کرنے والے ہندوؤں کے مخصوص علم تھے۔ وقائع نویسی، مراسلت، سیاق و دستور العمل انھیں عہدہ دار ہونے کے لحاظ سے تیار کرنے پڑتے

تھے۔ اس کے علاوہ بعض کام موروثی پیشے کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ لوگ جو کاروبار خود کرتے تھے اپنے بعد اسی منصب کا امیدوار بنانے کے لیے اپنے بچوں کو بھی وہی ضروری علوم سکھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ، انشا اور سیاق بعض خاندانوں کے موروثی علوم معلوم ہوتے ہیں۔

تاریخ

اب ہم مختلف علوم و فنون کو فرداً فرداً لیتے ہیں اور اس فن کی کتابوں کی اہمیت پر مختصراً رائے زنی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے تاریخی لٹریچر کو لیتے ہیں۔

یہ امر مسلّم ہے کہ قدیم ہندوؤں نے تاریخ سے کبھی اعتنا نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے زمانے میں انھوں نے علم تاریخ و اساطیر پر کوئی کتاب مرتب نہیں کی۔ کلکتہ ریویو کے ایک مضمون نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ چونکہ ہر قوم کا طریقۂ تصنیف جدا ہوتا ہے اس لیے ہندوؤں کا طریقۂ تاریخ لکھنے میں باقی دنیا سے جدا تھا چنانچہ "پرانوں" کو تاریخی کتب قرار دیا ہے اس میں شک نہیں کہ ہر قوم اپنی افتادِ طبع کے مطابق مختلف علوم پر نظر ڈالتی ہے۔ ہر قوم کی انشا اور طریقِ تصنیف خاص ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ہر لٹریچر میں وہ عناصر ہونے چاہییں جو ایک علم کو دوسرے علم سے ممتاز کرتے ہیں۔ عربوں اور یونانیوں کی تاریخ لکھنے کے انداز جدا جدا تھے لیکن ان میں تاریخ کو شاعری اور شاعری کو تاریخ میں مدغم نہیں کیا گیا۔ اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ پران فلسفہ و شعر کی کتابیں ہیں نہ کہ تاریخ کی۔ سر جادو ناتھ سرکار نے صحیح لکھا ہے کہ ہندو۔ علوم انسانی کی اس شاخ کی جانب مسلمانوں

کی آمد کے بعد متوجہ ہوئے ہندوؤں نے مسلمانوں کی شاگردی اختیار کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں مسلمان مورخین کی خوبیاں اور بُرائیاں ہر دو موجود ہیں ہندو اس بارے میں اپنے اساتذہ کے نقشِ قدم پر اس سختی کے ساتھ گامزن ہوئے کہ نہ صرف اندازِ تصنیف بلکہ مسلمانوں کے مخصوص محاورے اور اسلامی تراکیب اور الفاظ بھی انھوں نے بلا تامل استعمال کیے۔

ہندو جس فلسفیانہ میلان کے لیے مشہور ہیں اس کے پیشِ نظر ان سے توقع یہ تھی کہ وہ تاریخ میں اپنی اس استعدادِ ذہنی کو استعمال کریں گے اور سنین وشہور کے غیر مختتم سلسلوں کے علاوہ روزمرہ زندگی کے بے شمار نتیجہ خیز واقعات اور عام پبلک کی طرزِ بود وماند پر بھی قلم فرسائی کریں گے لیکن افسوس کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان کی تاریخیں بھی ان خامیوں سے پُر ہیں جن میں مسلم مورخین گرفتار تھے۔

سر جادوناتھ سرکار[۱] کے خیال کے مطابق ہندو ودیانتن نے اس دنیائے بے ثبات کے واقعات کو کبھی سنین وشہور کے میزان میں رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہندوؤں نے تاریخ کی جو کتابیں لکھی ہیں ان میں سے اکثر اسی قومی رجحان و اثرات کی حامل ہیں اور ان میں واقعات کے سال اور تاریخیں بہت کم ملتی ہیں۔

اورنگ زیب کے زمانے میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے اکثر بہت عمدہ ہیں۔ یہ یاد رہے کہ مغلوں کے عہدِ آخر میں ہندو کاروبارِ سلطنت میں بہت زیادہ دخیل ہو گئے تھے اسی لیے اس زمانے میں جو کتابیں ان کے قلم سے نکلیں وہ تاریخی لحاظ سے بہت اہم سمجھی جانی چاہییں۔ ان کی معلومات بلا واسطہ ہوتی تھیں اور چونکہ اکثر واقعات میں وہ خود شریک ہوتے تھے اس لیے

---

[۱] سرکار: مغل ایڈمنسٹریشن ج ۱۔ ص ۲۳۹

ان کے بیانات عینی شہادت کا درجہ رکھتے ہیں۔

منشی سجان رائے بٹالوی کی کتاب خلاصۃ التواریخ بہت اہم ہے، موجودہ زمانے کے اکثر فضلا نے اس کی طرف خاص توجہ کی ہے شفیق اورنگ آبادی کی شہرت بلحاظ مورّخ بہت وسیع ہے اور انھوں نے بعض اہم کتابیں لکھی ہیں۔ ہم ذیل میں چند اہم تاریخی کتابوں کے نام درج کرتے ہیں:۔

خلاصۃ التواریخ	مُصنفہ	منشی سجان رائے
لُب التواریخ	"	بندرا بن داس
دل کُشا	"	بھیم سین
تصانیف	"	لچھمی نراین شفیق
تاریخ شاہ عالم	"	مُنا لال
سلطان التواریخ	"	زخمی
تفریح العمارات	"	سیل چند
عمدۃ التواریخ	"	سوہن لال
گلزارِ کشمیر	"	کرپا رام
تصانیف	"	کلیان سنگھ

تذکرے

تذکروں میں مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں:۔

انیس الاحبّا	مُصنّفہ	موہن لال انیس
سفینہ	"	بندرا بن داس خوشگو
گل رعنا	"	شفیق

شامِ غریباں	مُصنّفہ	شفیق
ہمیشہ بہار	"	اخلاص
انیس العاشقین	"	زخمی

ان میں سے سفینہ اور گل رعنا بہت اہم ہیں۔

اِنشا

عہدِ مغلیہ میں انشا علوم کی ایک اہم شاخ سمجھی جاتی تھی۔ سر جادوناتھ سرکار اپنی کتاب "مغلوں کے نظامِ حکومت" میں لکھتے ہیں کہ مغلوں کا راج کاغذی راج تھا انھوں نے ایک منظم اور باقاعدہ "دفترِ انشا" میں معاملاتِ سلطنت کو مرکوز کر دیا تھا۔ اس زمانے میں یہ قاعدہ تھا کہ بڑے بڑے امرا کے منشی اپنے ان خطوط و کاغذات کو محفوظ رکھتے تھے جو وہ اپنے اعلیٰ افسروں کے نام سے مختلف لوگوں کو لکھتے تھے پھر ان کی زندگی میں یا مرنے کے بعد انھیں جمع کر لیا جاتا تھا اور ترتیب کے ساتھ شائع کر دیا جاتا تھا۔ یہ مجموعے طالب علموں کے لیے بہت مفید سمجھے جاتے تھے۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جو بطور کتب درسیہ پڑھائے جاتے تھے لیکن زبان کے نقطۂ نگاہ کے علاوہ یہ مجموعے اس لیے بھی بے حد اہم ہیں کہ ان میں تاریخی مسالہ بھی ہے۔ یہ فرامین، دستاویزیں، سندات، اور دیگر کاغذات ایک مکمل تاریخ لکھنے کے لیے بہت مفید ہیں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ تجربہ کار منشی اپنے بیٹوں کی تعلیم اور افادہ کی خاطر فرضی نمونے تیار کر دیتا تھا تاکہ لڑکے ان کی پیروی کریں۔ یہ ذخیرہ جتنا مفید ہے افسوس ہے کہ اسی قدر اس سے بے التفاتی برتی جاتی ہے۔ سر جادوناتھ سرکار نے اپنی کتاب "مغلوں کا نظام حکومت" میں انشاؤں سے بہت فائدہ

اٹھایا ہے۔ بعض انشائیں ایسی بھی ہیں جن میں شاہانِ مغلیہ کے اصلی فرامین موجود ہیں۔

ہندوؤں کو کسی محکمے کے ساتھ اتنی مناسبت نہ تھی جتنی دارالانشا کے ساتھ تھی۔ ہندو منشی بہت پسند کیے جاتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے کام میں ہشیار تھے اور ان کی خدمات ایرانی منشیوں کی نسبت ارزاں مل سکتی تھیں۔ ایران نژاد منشیوں کی درآمد سترھویں صدی کے اواخر میں بوجہ سیاسی پیچیدگیوں کے بند ہو گئی تھی۔ لہٰذا ہندوؤں کی مانگ اور بھی زیادہ ہو گئی تھی۔

بعض نامور ہندو منشی بعض ہندو منشی مغلوں کے زمانے میں بہت مشہور ہوئے۔ ملک زادہ منشی نے اپنی کتاب "نگارنامہ" میں جن انشا پردازوں کے نام گنائے ہیں ان میں یہ ہندو منشی بھی موجود ہیں:۔

چندربھان برہمن، پنڈی داس [داراشکوہ]، اودی راج یا طالع یار رستم خانی، گوبند چند، سینل سنگھ [عالمگیری] ہم ان میں ملک زادہ منشی کو بھی شامل کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ منشی ہرکرن، رگھناتھ سعداللہ خانی، وامق کھتری، مادھورام، لچھمی رائے دہلوی، لچھمی نراین دہلوی، جوالا پرشاد وقار، رتن سنگھ زخمی، لچھمی نراین دبیر، منشی سینل داس، کالی رائے تمیز، منشی خیالی رام خیالی، انندرام مخلص، غیوری، امر سنگھ خوشدل بھی مشہور منشیوں میں سے ہیں۔ ہمارے نزدیک برہمن، ہرکرن، مادھورام، رگھناتھ خاص طرزِ انشا کے مالک تھے۔

اہم کتبِ انشا ہندوؤں کے فارسی لٹریچر میں انشا کی کثرت ہے لیکن غیر معمولی طور پر اعلیٰ کتابیں تھوڑی ہی ہیں۔ طرزِ ابوالفضل کی پیروی عام منشیوں کا مابہ الامتیاز ہے لیکن "منشآت برہمن" سادہ طرز میں لکھی گئی ہے اس

کے علاوہ ذیل کی کتابیں ہندستان میں بہت مشہور ہوئیں۔

ہفت انجمن ——— اودی راج یا طالع یار

انشاے ہرکرن ——— ہرکرن

نگار نامۂ منشی ——— اس کا دیباچہ بہت کارآمد ہے۔

گلگشت بہار ارم ——— حیا

انشاے مادھورام ——— درسی کتابوں میں شامل رہی ہے لیکن اس کی طرز بہت مشکل ہے۔

دقائق الانشا ——— رنچھور داس

دستور الصبیان ——— بچوں کے لیے بہت مفید سمجھی جاتی ہے۔

منشآت منشی خیالی رام

آخری زمانے کی انشائیں محض لفاظی، تکلّف اور تصنّع سے پُر ہیں اور ان میں بہت تھوڑی کارآمد اور فائدہ بخش ہیں۔

سیاق

علومِ فارسیہ کی یہ شاخ بھی ہندوؤں میں بہت مقبول ہوئی۔ یہ حقیقت میں امورِ مالی اور دیگر انتظاماتِ حکومت سے متعلق تھی۔ برہمن نے چار چمن میں سیاق داں منشی کی ضرورت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ کتابیں طرزِ حکومت کی تشریح و توضیح کے لیے بہت مفید اور کارآمد ہیں۔ قانون گو، امین، کارکن اور دیوان سب سیاق کے ماہر ہوتے تھے۔ سیاق کی بعض اہم تصنیفات یہ ہیں:

سیاق نامہ ——— نند رام

دیوان پسند ——— چھتر مل

منشآت منشی ـــــــ گنیش داس

سراج السیاق ـــــــ میڈولال زار

خزانۃ العلم ـــــــ کانجھی

ریاضی

ہندوؤں نے ریاضی پر کتابیں اٹھارھویں، انیسویں صدی میں لکھنا شروع کیں۔ جب انگریز ہیئت دانوں اور ریاضی دانوں سے زیادہ میل جول بڑھا تو انھوں نے اس سلسلے میں بہت سرگرمی کا اظہار کیا۔ یہ کتابیں اہم ہیں:۔

مرآۃ الخیال ـــــــ جی موہن لال کالیستھ

بدایع الفنون ـــــــ میدنی مل

زبدۃ القوانین ـــــــ ہرسکھ رائے

"خزانۃ العلم" کانجھی ریاضیات پر بہترین تصنیف ہے جس میں جدید علوم کے اثرات خاص طور پر نمایاں ہیں۔

باقی علوم طبعیہ میں اشکی مصنف زیج، فلسفی، رتن سنگھ زخمی، مرزا راجا جے سنگھ، رائے بھول تمکین خاص دستگاہ رکھتے تھے۔

شعرا

مغلوں کے زمانے میں فارسی شعر و شاعری کا بہت چرچا رہا لیکن آخری دور میں ہر تخلص رکھنے والا بھی شعرا میں شمار ہونے لگا۔ اس لیے اعلیٰ درجے کے شاعر اب پیدا نہیں ہوتے تھے۔ مرزا عبدالقادر بیدل فارسی کے آخری شاعر تھے۔ ہندو شعرا عموماً زمانۂ انحطاط میں پیدا ہوئے اس لیے

ان میں بلند پایہ سخن گو بہت کم ہوئے۔ صرف برہمن، مخلص، شفیق اور ایک دو اور نام اعلیٰ درجے کے شاعروں میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔ متوسط درجے کے شعرا کے نام یہ ہیں: بیکھم، امانت، شفیق، خوشگو، سدا نند بے تکلف، شورام حیا، حکیم چند ندرت، رام نراین موزوں، سرب سکھ دیوانہ، ذوقی رام حسرت، نفتہ زخمی، امر سنگھ خوشدل، صاحب رام خاموش، رامجس محیط، راجا گردھر پرشاد باقی۔ ہندوؤں نے بہت سی مذہبی مثنویاں بھی لکھی ہیں اور ان کے کلام میں پیچیدگی اور تکلف بہت ہے۔

لُغت نویس

لُغت کی کتابیں اگرچہ کم ہیں لیکن ان میں بہت اعلیٰ درجے کی کتابیں موجود ہیں اور یہ پہلو ہندوؤں کے فارسی لٹریچر کا روشن ترین پہلو ہے۔ بہارِ عجم، مصطلحاتِ وارستہ، مرآۃ الاصطلاح کی قدر و قیمت غیر معمولی طور پر زیادہ ہے۔

مترجمات

اکبر کے زمانے سے لے کر آخری زمانے تک ہندو اپنی مذہبی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرتے رہے۔ انگریزوں کے آنے کے بعد ہندوؤں نے اپنی مذہبی کتابوں کو نئے طریق سے مطالعہ کرنا شروع کیا اور مشنریوں کے الزامات کے جواب میں کئی کتابیں لکھیں۔

خوش خطی

کتابت کے مختلف طریقوں میں سے ہندوؤں نے شکستہ خط میں خاص

کمال حاصل کیا۔ تذکرۂ خوش نویساں میں جن چودہ[14] ہندو خوش نویسوں کا ذکر ہے ان میں سے بارہ[12] کو شکستہ میں مہارتِ تامہ حاصل تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خط سرکاری کاغذات میں بہت کام آتا تھا اس لیے ہندوؤں نے اس کی جانب خاص توجہ مبذول کی۔ تاہم خط کی دوسری انواع میں بھی اچھے اچھے خوش نویس موجود تھے۔ تذکرۂ خوش نویساں میں مندرجۂ ذیل اسما موجود ہیں :-

چندر بھان برہمن، رائے پریم ناتھ آرام، لچھمن سنگھ غیوری، لچھمی رام پنڈت، رائے سدھ رائے، خوش وقت رائے دانگی شاداب، راجا نند رام پنڈت۔ کنور پریم ناتھ کشور، راجا امید سنگھ، رائے منوہر توسنی، راجا ٹوڈرمل، شنکر ناتھ پنڈت کشمیری شنکر نوساری، لالہ درگا پرشاد مضطرب مختلف لائبریریوں میں جو قلمی کتابیں محفوظ ہیں۔ ان میں سے بہت سی ہندو کاتبوں کی ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔

ہندو لٹریچر کی مجموعی قدر و قیمت گزشتہ صفحات کے مندرجات سے بخوبی معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہندو مصنّفین نے کس کثرت کے ساتھ مختلف علوم و فنون پر کتابیں لکھی ہیں۔ اب ہم مجموعی حیثیت سے اس لٹریچر کی قدر و قیمت پر مختلف علما و فضلا کی آرا لکھتے ہیں۔

ہمارے نزدیک عام ہندو مصنّفین ہندستان کے عام مسلمان مصنّفین سے کسی طرح کم نہیں۔ ہندو فارسی دانوں کی جن خامیوں کا اکثر تذکرہ کیا جاتا ہے ان میں ہندستان کے مسلمان مصنّفین بھی بری طرح مبتلا تھے۔ تاہم جہاں تک اندازِ بیان کا تعلق ہے ہم محسوس کرتے ہیں کہ عام ہندو مصنفین کا سٹائل تصنّع اور تکلف سے خالی نہیں ہوتا اور بعض اوقات زبان کی اصلی روح سے ناواقفیت کا ترشح ہوتا ہے لیکن اعلیٰ انشا پردازوں میں یہ نقص بہت کم ہے۔

"کالستھوں" کی "فارسی دانی" غلطیوں کے لیے ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے۔
لیکن اس زمرے میں صرف دفاتر کے کلرک شمار کیے جا سکتے ہیں جو معتاد اور رسمی کاروبار کے علاوہ زبان کی اندرونی گہرائیوں تک بہت کم پہنچتے تھے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں میں برہمن، مخلص، شفیق، سالم، اور بی راج، بہار، وارستہ، غیوری، منوہر اور تفتہ وغیرہ جیسے ادیب، مؤرخ اور انشا پرداز موجود ہیں تو ہمیں ہندوؤں کی فارسی دانی کی ہمہ گیر تنقیص اور تحقیر خلافِ انصاف معلوم ہوتی ہے۔ ہم نے گزشتہ سطور میں جن اعلیٰ انشاؤں، پُراز معلومات تذکروں، محققانہ تاریخوں، مستند لغتوں اور شیریں زبان شاعروں اور نغز گوؤں کا تذکرہ کیا ہے وہ فارسی کے عام لٹریچر میں نمایاں مقام رکھتے ہیں اور فارسی ادب کی تاریخ لکھنے والا ان کے اعلیٰ رتبے کو فراموش نہیں کر سکتا۔

غالب کے خیالات گزشتہ صدیوں میں بھی یہ مسئلہ کچھ متنازع فیہ رہا ہے۔ ہندستان کے مشہور شاعر اسداللہ خاں غالب نے ہندوؤں کی اس حیثیت سے بہت کچھ انکار کیا ہے۔ برہان قاطع کے جواب اور تردید میں غالب نے "قاطع برہان" کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا جس میں برہان کی بہت سی غلطیاں نمایاں کی ہیں۔ غالب کے جواب میں آغا احمد علی صاحب مدرس مدرسۂ عالیہ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا جس میں غالب کے خیالات کی تردید کی۔ اس رسالے میں آغا صاحب نے اپنے اقوال کی تائید میں بہار اور وارستہ اور قتیل کے اقوال پیش کیے تھے۔ غالب نے اس رسالے کا جواب نظم میں لکھا جو "شمشیر تیز تر" کے نام سے مشہور ہے۔ ہم اس رسالے سے چند اشعار یہاں نقل کرتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوگا کہ غالب کے

نزدیک بہار، وارستہ اور قتیل لائق استناد نہیں ہیں:۔

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخہ — درخصوص گفتگوئے پارس انشا کردہ است
درجہاں توام بود روئے دیگر ولپشت قتیل — پیشوائے خویش ہندوزادہ را کردہ است
ہندیاں را در زباں دانی مسلم داشتہ — تا چہ اندر خاطر والائے او جا کردہ است
با قتیل و جامع برہان و لالہ ٹیک چند — لابہ و دریوزہ گیری و لطف و مدارا کردہ است
گر چنیں با ہندیاں دارد تو لا در سخن — من ہم از ہندم چرا از من تبرا کردہ است

"پیشوائے خویش ہندوزادہ را کردہ است" کی مزید تشریح محمد عبد الصمد فدا کے دو شعروں سے ہوتی ہے جو انھوں نے غالب کے جواب میں لکھے تھے وہ شعر یہ ہیں:۔

ہادیم قول بہار آورد چوں در بعض جا — مے نویسد احمد او را صدر اعلیٰ کردہ است
اوستادے ماہر فن گر حکم شد قبح چیست — چوں نگارش را باہل پارس ہمتا کردہ است

گزشتہ بالا اشعار سے واضح ہوگیا ہوگا کہ غالب اور ان کی جماعت بہار، قتیل اور وارستہ تک کو لائق اعتنا نہیں سمجھتی لیکن ایک دوسری جماعت جس کا زاویۂ نگاہ زیادہ صاف ہے اعلیٰ ہندو مصنفین کو بطور سند قبول کرنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتی جیسا کہ ؎

اوستادے ماہر فن گر حکم شد قبح چیست... الخ

سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہندی ایرانی نزاع

غالب کے خیالات سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ غالب کی جماعت ہندوؤں کی ہندو ہونے کی وجہ سے تحقیر کرتی تھی بلکہ اس رویے کی پشت پر "ہندی اور ایرانی" نزاع، مخاصمت اور رقابت کارفرما تھی اور اس معاملے میں ایرانی نژاد حضرات

ہندوؤں اور ہندستانی مسلمانوں کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

امیر خسرو کے زمانے سے ہمیں اس رقابت کا پتا چلتا ہے لیکن مغلوں کے زمانے میں جب ایران کے شعرا اور فضلا بکثرت ہندستان میں وارد ہوتے ہیں تو یہ جذبات تلخ تر ہو جاتے ہیں۔ عرفی اور فیضی کی مخاصمت، سعدی اور فیضی کے متعلق "آسمانی داد"[1] کا لطیفہ اور اس قسم کے دوسرے واقعات اس نزاع کے مختلف ثبوت ہیں۔

مغلیہ عہد میں ملا شیدا ہندی ایک بزرگ گزرے ہیں انھیں تذکرہ نگاروں نے نہایت ہی مکروہ اور نازیبا القاب کے ساتھ یاد کیا ہے۔ والہ داغستانی[2] فرماتے ہیں:-

"کہ وہ ہندستان میں پیدا ہوا تھا اور لیپت فطرت تھا"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اُس زمانے میں ایرانیوں کی تعلّی کے خلاف احتجاج کرتا تھا اور ایران نژاد متکبروں کا مضحکہ اڑاتا تھا۔ ہم ذیل میں سفینۂ خوشگو[3] سے شیدا کی ایک کتاب کا دیباچہ نقل کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ ایرانی اور ہندی کی رقابت ان دنوں میں کتنی تیز تھی۔

"ملا شیدا در خاتمۂ مثنوی کہ در تعریف کشمیر نوشتہ۔ نوشتہ کہ ایرانیان مرا بہندی نژاد بودن بمقدارے نہ نہند..... حرف آنست کہ ایرانی و ہندی بودن فخر را سند نگردد، پایۂ مرد بہ نسبت پایۂ ذاتی ست واگر ایرانیاں زبان طعن کشایند کہ فارسی زبانِ ماست، زبان را بکام خود نیابند، من بر ایشاں معنیٔ رنگیں عرضہ دارم۔

---

[1] "سخن فہمی عالم بالا معلوم شد" والا لطیفہ [2] ریاض الشعرا (قلمی پنجاب یونیورسٹی) ق ۱۲۱ [3] سفینہ (قلمی) ج ۲ ق ۱۰۷

آنچہ از بے تکلفی نوشتہ شد از رلے راستی ست واز راستی رنجیدن کار اہل دانش نیست۔"

جب شیخ علی حزیں ہندستان میں وارد ہوئے تو یہاں کے لوگ بہت عزت سے پیش آئے لیکن انھوں نے بھی ہندستانیوں کی تحقیر وتنقیص میں کسر اٹھانہ رکھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستانیوں نے بھی ان پر اعتراضات کیے۔ تذکرہ حسینی[1] میں لکھا ہے:-

"چوں شیخ در جنب شاعری خود شعرائے ہند را وقعتے نے نہاد، ازیں معنی عداوت بہم رسیدہ در پئے آہو گیریہا کمر بستند۔"

اس نزاع کی تفصیل سے ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ غالب اور ان کے ہم خیال اس بارے میں کسی مذہبی اختلاف کی بنا پر نہیں بلکہ ملکی اور وطنی عصبیت کی بنا پر ہندی مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کو بھی وہ درجہ دینے سے انکار کرتے تھے جس کے وہ بہمہ وجوہ مستحق تھے۔

استعمالِ ہند

یہ ہندستان کے فارسی لٹریچر کی ایک خصوصیت ہے۔ بلوخمن صاحب[2] فرماتے ہیں کہ "استعمالِ ہند" ابوالفضل جیسے انشا پردازوں سے لے کر معمولی ضیافت نامہ لکھنے والوں تک سب کی تحریروں میں نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ پروفیسر محمود خاں شیرانی صاحب[3] نے ضیاء الدین برنی، شمس سراج عفیف، امیر خسرو اور بے شمار دوسرے مصنفین کی کتابوں میں سے لاتعداد ہندستانی محاورات کو نکال کر جمع کیا ہے۔ "استعمالِ ہند" کو بعض ادبا نے خلافِ قاعدہ قرار دیا ہے لیکن زبان پر وطن اور مکان کے اثرات کا ہونا کسی طرح بھی

---

[1] تذکرہ حسینی (قلمی) ق ۹۔ [2] کنٹری بیوشنز ص ۳۳ [3] اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۲۹ء

خلاف قدرت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خان آرزو نے 'مثمر'[۱] میں لکھا ہے:-

"کہ آوردن الفاظ عربیہ و ترکیہ بلکہ زبان ارامنہ در فارسی مسلّم ست؛ باقی ماند الفاظ ہندی و آں نیز بمذہب مؤلف دریں زماں ممنوع نیست"

بہت سے ایرانی شعرا جب ہندستان میں وارد ہوئے تو انھوں نے ہندی الفاظ کو استعمال کیا اور بعضوں نے تو نہایت بے قاعدہ اور فضول[۲] طریق سے استعمال کیا مثلاً کاشی کا یہ مصرع کہ:

"سر راجپوتاں جگت تنگ بود"

وغیرہ۔ تعجب ہے کہ ایرانی شعرا کے اس غلط استعمال کے باوجود بھی ان کے خلاف کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا لیکن ہندی نثرا اور ہندو شعرا کی زبان دانی صرف اس لیے محل نظر ہے کہ وہ "استعمال ہند" کے مجرم ہیں۔ ہندوؤں کی فارسی دانی پر ایک زبردست اعتراض یہ ہے کہ ہندوؤں کی کتابوں میں استعمال ہند کی کثرت ہے لیکن اس کے جواب میں جہاں تک اعلیٰ مصنفین کا تعلق ہے ہم خان آرزو کا یہ فقرہ نقل کرنا کافی سمجھتے ہیں:-

"و نیز بودن کلمۂ ہندی مخل فصاحت نیست چنانکہ ثنائی می گوید ؎

نہ در آں دیدہ قطرۂ پانی الخ

قیاس نیز ہمیں گوید، چہ بودن الفاظ عربی و ترکی در عبارات فارسی مخل فصاحت نیست، پس لفظ ہندی چرا باشد"

---

[۱] مثمر (قلمی پنجاب یونیورسٹی) ص ۶۶ [۲] مثمر ص ۸۸ تا ۹۳؛ مخزن الفوائد ص ۳۶؛ سخندانِ پارس ص ۲۳۸

ہندی الفاظ کا بکثرت استعمال ہم نے جو کچھ سطور بالا میں لکھا ہے وہ ہندی الفاظ کے معتدل استعمال کے متعلق تھا۔ بعض مترجمین نے جنھوں نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے سنسکرت اور ہندی الفاظ اپنی کتابوں میں اس کثرت سے لکھے ہیں کہ یقیناً ان کی موجودگی زبان کی صفائی اور پاکیزگی کے منافی ہے اور یہ ہمارے نزدیک ایک بہت بڑا نقص ہے جس میں متوسط درجے کے مصنفین اور عام محرر بُری طرح سے مبتلا تھے۔ سکھوں کے عہد میں پنجابی زبان کے الفاظ اور محاورات کتابوں میں ملتے ہیں اور بعض اوقات پنجابی تلفظ بھی فارسی میں محفوظ رکھا گیا ہے چنانچہ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے:۔

"چشم بطریق دھیان پوشیدہ نشستہ بودند"

" دھوتی ہا بالائے ریسمان درتاب آفتاب گزاشتہ"

"آئین پوجائے مہنت ست"

" رسانندہ بعالم مکت ورستگاری"

انند رام مخلص لکھتا ہے ؎

" دارد ز ہنڈولہ قفس تخت رواں"

"درجرگہ مرغان چمن لال پری ست"

ایک خط میں لکھتا ہے ؎

" خوشہ مرواریدنا شگفتہ یعنی سٹہ ہائے گل جا چمن امید کرد"

رائے امانت رام امانت بھگت مالا میں لکھتا ہے:۔

این ہمہ گوسالہا گوالہا	ہیش آں بازی گر تمثالہا
آرتی مے کرد در ہر صبح وشام	برزبانش وصف حسن پاک شیام

راجہ آں ملک جا در بزم داشت خط شوق یاد بھگوان مے نگاشت
مردم از جام بھجن بودند مست رفتہ از آوازشان دلہا ز دست

ظفر نامۂ رنجیت سنگھ مصنفۂ امرناتھ اکبری میں اکثر مقامات پر بٹالہ کی بجائے وٹالہ لکھا ہے لفظ جی کا استعمال بکثرت ہے۔

عام ہندو مصنفین میں یہ کمزوری بہت محسوس کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زباں دانی پر ہمیشہ اعتراضات کیے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ متوسط درجے کے مصنفین اور عام اہل قلم میں یہ نقص بھی ہے کہ وہ اصل ایرانی محاورات سے واقف نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ محاورہ ہر ساٹھ سال کے بعد تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں وہ روانی، وہ فراوانیٔ الفاظ، وہ شکوہ، وہ بلندی نہیں جو اعلیٰ مصنفین کا طرۂ امتیاز ہے ان میں تتبع کا مرض بدرجۂ اتم موجود ہے جو ان کی عبارات کو اور بھی بے معنی بنا رہا ہے۔ عام منشیوں کے پاس رسمی کاروبار چلانے کے لیے کچھ پرانے گھڑے ہوئے فقرات اور محاورات موجود ہوتے تھے جنھیں وہ اکثر استعمال کرتے تھے۔ بلوخمن[1] صاحب کا یہ قول کہ "اٹھارھویں صدی کے آخر تک ہندو فارسی میں مسلمانوں کے اُستاد بن گئے تھے" زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ اس قدر درست ہے کہ آخری زمانے میں ہندوؤں نے دفتری کاروبار پر مسلمانوں سے زیادہ اقتدار حاصل کر لیا تھا اور ان میں مسلمانوں کی نسبت فارسی تعلیم بھی زیادہ ہو چلی تھی۔ چنانچہ آرنلڈ صاحب کے بیان کے مطابق پنجاب میں جو "فارسی اور قرآن" کے مدرسے رائج تھے ان میں ہندو زیادہ داخل ہوتے تھے۔

---

[1] آئین (ترجمہ انگریزی ج۱) ص ۵۲ م

ہندوؤں پر فارسی تعلیم کے اسلامی اثرات[1] سب سے پہلی بات یہ ہی کہ ہندوؤں نے سٹایل کے علاوہ بعض ان مذہبی اثرات و رسمیات کو بھی اپنی کتابوں میں قائم رکھا جو مسلمانوں کی محبوب خصوصیات تھیں لیکن ہندوؤں کا انھیں اختیار کر لینا بہت کچھ قابلِ تعجب ہی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ، صلی اللہ علیہ وسلم، رمضان المبارک کے علاوہ اپنے آپ کو "برلب گور" لکھنا اور ہندوؤں کے لیے "واصل جہنم" وغیرہ الفاظ اس کثرت کے ساتھ کتابوں میں آتے ہیں کہ اگر مُصنّف کا نام معلوم نہ ہو تو بمشکل پتا چل سکتا ہی کہ مصنف کوئی ہندو ہی۔[2] جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں "تاریخ نے" ہندوؤں میں کبھی علم کی حیثیت نہیں اختیار کی؛ اگرچہ کلکتہ ریویو (۱۹۰۸ء) کے ایک مضمون نگار نے پرانوں کو تاریخی تصانیف قرار دیا ہی لیکن اس کا یہ قول ضروری دلیل و برہان سے معرّا ہی اس لیے یہ امر بلا خوف تردید پیش کیا جا سکتا ہی کہ "تاریخ" ہندوؤں میں مسلمانوں کے طفیل پیدا ہوئی۔

ہندو کلچر پر فارسی[3] کا جو اثر پڑا اس پر تفصیل سے لکھنے کا یہ موقع نہیں اتنا ضرور کہنا پڑتا ہی کہ بعض مصنفین اسلامی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ مرزا، خواجہ، میاں وغیرہ القاب بہت سے ہندوؤں کے ناموں کے ساتھ ملتے ہیں۔ خود ہندوؤں کے ناموں میں عربی فارسی جزو مثلاً مشتاق رائے، رائے حکیم چند،

---

[1] اس موضوع پر دیکھو میرا مفصل مضمون "فارسی تعلیم کا اثر ہندوؤں پر"۔ خیالستان (لاہور) اپریل ۱۹۳۰ء۔ ص ۳۳، ۳۸

[2] اس کے لیے دیکھو ایلیٹ کی 'تاریخ ہند اپنے مورخوں کی زبانی' کا دیباچہ؛ ایضاً ج ۸، ص ۷۔ ایضاً ج ۸، ص ۱۳۳ [3] ملاحظہ ہو ڈاکٹر تارا چند "ہندی کلچر پر اسلام کا اثر"

دولت رائے وغیرہ بکثرت ملتے ہیں مغلوں کی طرزِ معاشرت کا ہندوؤں کی زندگی پر گہرا اثر ہوا اس میں فارسی زبان سے پیدا شدہ ذہنی انقلاب کا بھی بہت سا حصّہ ہے۔

خاتمہ

ناظرین! میں نے اسلامی عہد کے ہندستان کا جایزہ لیا ہے۔ موجودہ تالیف اور ان مباحث کی غرض وغایت یہ ہے کہ ازمنۂ متوسطہ میں جبکہ ہندو ایک محکوم قوم کی حیثیت سے رہتے تھے۔ ہندوؤں کے ذہنی کارناموں اور علمی سرگرمیوں کا حال معلوم ہو سکے جس سے ایک طرف ان کی ذہنی بلندی اور دوسری طرف اسلامی حکومت کی رواداری کا ثبوت ملتا ہے یہ فی الحقیقت ہندو دماغ کا ایک شان دار کارنامہ ہے کہ انھوں نے مسلمان اساتذہ سے جو علوم سیکھے ان میں اتنا کمال پیدا کیا کہ بعض شعبوں میں اپنے اساتذہ سے بھی بڑھ گئے اور ادب اور زبان سے متعلق علوم میں ایسی دست رس حاصل کی جو صرف 'اہل زبان' کا حصّہ ہے۔

فارسی زبان کی تعلیم ایک ایسا تجربہ تھا جس کے فواید کا سلسلہ مغلوں کی حکومت تک ہی محدود نہ رہا بلکہ اس نے ہنود میں ایسی استعداد، ایسی فراست اور تطابق ماحول کی وہ صلاحیت پیدا کر دی کہ مغلوں کے زوال کے بعد انگریزی تعلیم کے شیوع ورواج کے وقت بھی انھوں نے تحصیل علم میں سبقت کی جس کے منافع ومفاد کی وسعت اور ہمہ گیری سے انکار نہیں ہو سکتا

مسلمانوں کے ساتھ اختلاط اور ارتباط نے علیحدگی اور تفرد کے متعلق ان کے توہمات کا بہت ازالہ کر دیا اور اسلامی تمدن نے ہندو سوسائٹی پر

بعض ایسے گہرے اور خوش گوار نقوش چھوڑے جن کا اعتراف[1] نہ کرنا انتہائی ناشکرگزاری ہوگا۔ صدیوں تک فارسی زبان ہندو اور مسلمانوں میں اتحاد کا ایک محکم ذریعہ بنی رہی یہ وہ واسطہ تھا جو حاکم و محکوم، راعی اور رعایا کے درمیان ایک لازایل ربط پیدا کرنے کا وسیلہ ثابت ہوئی۔ بہت ممکن ہو کہ یہ رسالہ حال و مستقبل کو ماضی کا رنگ دینے میں کامیاب ہو اور ہندو مسلم اتحاد کے علم برداروں کے لیے ممد و معاون ثابت ہو۔ مرزا محمد منوہر توسنی نے آج سے تقریباً تین سو سال پہلے ایک شعر میں جس حقیقت کا اعلان کیا تھا کاش ہم ہندو اور مسلمان اس پر غور کر سکیں۔

یگانہ بودن و یکتا شدن زچشم آموز
کہ ہر دو چشم جدا و جدا نگرند

[1] اس کے لیے دیکھو لین پول۔ میڈیول انڈیا (آخری باب)

ضمیمے

(۱) گورونانک کی فارسی تعلیم

(۲) مثنوی ہنیم بیراگی

(۳) بدائع وقائع انندرام مخلص

(از پرنسپل محمد شفیع ایم۔ اے)

ضمیمہ الف

گرو نانک صاحب کی فارسی تعلیم کہاں تک تھی ؟

اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کہ گرو صاحب نے فارسی تعلیم کہاں تک پائی تھی۔ ہم پہلے مؤرخین کے خیالات کا خلاصہ درج ذیل کرتے ہیں۔

'بابرنامہ' میں جو بابر کی خود نوشتہ سوانح عمری ہی۔ بابا نانک کے متعلق ایک حرف موجود نہیں۔

'اکبرنامہ' وغیرہ میں ہندوؤں کے ایک فرقے کی طرف اشارہ ہی جس کو وہاں سیش کے نام سے پکارا گیا ہی۔

اس کے علاوہ عہدِ اکبری کی تاریخیں بابا نانک کے حالات سے یکسر خالی ہیں۔ توزک جہانگیری میں بھی بابا نانک کا ذکر نہیں۔

فارسی کی سب سے پرانی کتاب جس میں سکھوں اور بابا نانک کے حالات[1] کسی قدر تفصیل سے درج ہیں وہ غالباً دبستان مذاہب ہی لیکن اس کتاب میں بھی گرو جی کی تعلیم کے مسئلے پر زیادہ کچھ نہیں لکھا گیا اس لیے وہ کتاب بھی ہمارے مطلب کے لیے چنداں مفید نہیں۔

---

[1] اس مضمون میں جہاں کہیں قلمی نسخوں کا حوالہ دیا گیا ہی وہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے متعلق ہیں۔

"تاریخ پنجاب مُصنفہ غلام محی الدین بوٹے شاہ[1] میں لکھا ہے:-
"چنانچہ از اشعار ہندی و فارسی آں کہ بنظم آوردہ ہمیں
طرز معلوم می شود"
یعنی مُصنف کے نزدیک ان کے اشعار فارسی زبان میں موجود ہیں۔
چہار گلشن کا مُصنف یوں رقم طراز ہے:-
"بیان کمالاتش از تقریر و تحریر مستغنی[2]"
منشی سوہن لال نے مہاراجا رنجیت سنگھ کے زمانے میں ایک تاریخ
عمدۃ التواریخ[3] کے نام سے لکھی ہے۔ مُصنف لکھتا ہے:-
"از اشارات و کنایات علم فارسی نیکو مطلع"
میکالف[4] صاحب نے سکھ مذہب پر ایک مبسوط کتاب چھ ضخیم مجلدات
میں تحریر کی ہے۔ صاحب موصوف کا بیان ہے "کہ میں نے اس کتاب میں سکھوں کے
خیالات و روایات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے اور ہر چیز نہایت شدید سکھ
نقطۂ نگاہ سے تحریر کی گئی ہے جس میں میں نے اپنی طرف سے کسی تنقید و جرح
کی کوشش نہیں کی یہی وجہ ہے کہ میں نے معجزات و خوارق کا ذکر کتاب کے طول
و عرض میں بڑی کثرت کے ساتھ کیا ہے"۔ پس اگر اس کتاب کو تمام سکھ قوم کی
اصلی آواز اور فیصلہ سمجھیں تو غالباً بے جا نہ ہوگا۔ صاحب موصوف کے نزدیک یہ
امر بالکل غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم سکھ مذہب کے بانی کو علم سے بے بہرہ
ثابت کریں۔ آگے چل کر صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ ہمارے پاس نہایت
کافی داخلی شہادتیں موجود ہیں جو خود گرو جی کے کلام میں ہیں جن سے یہ

---

[1] قلمی۔ ق ۱۵۳ [2] قلمی۔ ق ۳۴ [3] صفحہ ۶

[4] HISTORY OF THE SIKHS.

امر ثابت ہوتا ہے کہ گرو جی نے فارسی تعلیم حاصل کی تھی[1]۔ صاحب موصوف نے ایک اور دلیل دی ہے جو ہمارے نزدیک قابلِ قبول نہیں اور وہ یہ ہے کہ رائے بولار نے (جو کہ مقام تلونڈی کے محافظ تھے) گرو نانک کے والد سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ تھوڑی بہت فارسی تعلیم حاصل کرلیں تو ان کو ملازمت شاہی میں داخل کرنے کی کوشش کی جائے[2]۔ یہ دلیل ہمارے لیے اس لیے مسلّم نہیں کہ اس وقت تمام سرکاری دفاتر ہندی زبان میں ہوا کرتے تھے اس لیے ملازمت حاصل کرنے کے لیے فارسی عربی کی ضرورت نہیں محسوس ہوسکتی تھی۔ آگے چل کر صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ "گرنتھ صاحب میں اکثر فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں اور چند فارسی کے پورے شعر بھی ملتے ہیں۔ ہم اس امر کو ایک مسلّم حقیقت خیال کرتے ہیں کہ وہ فارسی کے ایک اچھے عالم تھے اور غالباً اسی مطالعۂ کتب فارسی نے ان کے دماغ میں عام رواداری کا مادہ پیدا کر دیا تھا[3]" صاحب موصوف نے بعض اور دلائل بھی دیے ہیں جن کو ہم سرِ دست نظر انداز کرتے ہیں۔ کننگھم صاحب کی ہسٹری آف دی سکھس ایک بلند پایہ کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ "ہمارے پاس اس پر یقین کرنے کے کافی دلائل موجود ہیں کہ گرو نانک نے اپنے آپ کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذاہب اور عقائد سے واقف کر لیا تھا اور ان کو مسلمانوں اور ہندوؤں کی کتابوں سے عام واقفیت[4] تھی"۔

بیگس صاحب "انسائیکلوپیڈیا آف اتھکس[5]" میں لکھتے ہیں۔ "عام طور پر سکھ روایات کو قابلِ تسلیم نہیں قرار دیا جاسکتا"۔ ان کے نزدیک گرنتھ صاحب

---

[1] میکالف۔ ج ۱۔ ص ۱۱ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۱۵

[4] کننگھم ص ۱۴۱ [5] ص ۱۸۱

پنجابی، ہندی اور فارسی اشعار کا مجموعہ ہے۔ گرو نانک صاحب کی تعلیم کے متعلق ان کی تحقیق ہے کہ "نو سال کی عمر میں انھوں نے فارسی پڑھی"[1]

جنم ساکھی (سنہ ۱۸۷۱ء مطبوعہ لاہور) کی روایت ہے کہ "گرو نانک صاحب نے کچھ تُرکی بھی پڑھی"۔ ٹرمپ[2] صاحب کا خیال ہے کہ "تُرکی سے مُراد فارسی ہے جو اُس وقت مسلمانوں کی زبان تھی"۔ ٹرمپ صاحب کی تحقیق ہے کہ "گرنتھ صاحب میں نانک کے کچھ اشعار فارسی ملتے ہیں اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فارسی دانی بہت ہی معمولی درجے کی تھی۔ صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ جنم ساکھی مطبوعہ لاہور میں سے یہ الفاظ دیدہ دانستہ نکال دیے گئے ہیں کہ ان کو فارسی (تُرکی) سے واقفیت تھی۔

ڈاکٹر گوکل چند نارنگ اپنی کتاب ٹرانسفارمیشن آف دی سکھ ازم میں گرو نانک صاحب کی تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں کہ "ان کی تعلیم باقاعدہ نہیں تھی"۔ اس امر کے ثابت کرنے کے لیے وہ ذیل کی دلایل دیتے ہیں:۔

(۱) نانک کی دوسرے مذاہب کی تنقید عالمانہ نہیں۔

(۲) یہ قول کہ ان کا پہلا استاد مسلمان تھا مسلمان مؤرخین کا تصرف معلوم ہوتا ہے۔ جو یہ چاہتے ہیں کہ گرو جی کی آیندہ عظمت کا سہرا تعلیماتِ اسلام کے سر باندھیں۔

(۳) فارسی کی ضرورت اس لیے بھی نہیں پڑ سکتی تھی کہ دفاتر کی زبان ہندی تھی۔

(۴) نیتھ پرکاش میں لکھا ہے کہ گرو جی کا پہلا اُستاد گوپال پنڈت تھا جو سکول کا معلم تھا۔

(۵) یہ امر بھی ممکن ہے کہ نانک سید حسن درویش کے سامنے بیٹھے ہوں

---

[1] صفحہ ۱۵۱ و ۱۶۲ [2] ترجمہ گرنتھ صاحب۔ دیباچہ [3] صفحہ

لیکن اس میں شبہہ ہے کہ ان کو فارسی میں یا سنسکرت میں کوئی نظر پیدا ہوئی ہو یا نہیں۔

لیکن یہاں یہ سوال نہیں کہ نانک کی عظمت کس قوم کی تعلیم کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی یہاں تاریخ کا سوال ہے جس کے ذریعے ہم فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ فارسی جانتے تھے یا نہیں اور اگر جانتے تھے تو کس قدر۔

یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ اُردو مصنفین کی راؤں کا خلاصہ ہے۔ اب ذیل کے حصّے میں تین طریقوں سے ہم اس مسئلے پر روشنی ڈالیں گے۔ پہلے پہل گرو جی کے ان حالاتِ زندگی کا خلاصہ نقل کریں گے جن کا تعلق خاص طور پر مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ پھر گرنتھ صاحب کے بارے میں اپنی لسانی تحقیق پیش کریں گے اور بالآخر ایک مختصر سے خاتمے کے ساتھ مضمون کو ختم کر دیں گے۔

ٹرمپ صاحب کے پاس جو جنم ساکھی ہے وہ ان کے بیان کے مطابق سب سے پُرانی جنم ساکھی ہے۔ اس میں کوئی خوارق اور دور از عقل معجزات نہیں۔ گرو جی کے سیدھے سادے حالات مرقوم ہیں۔ ٹرمپ صاحب بجا فرماتے ہیں کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ جنم ساکھیوں کے بیانات میں اختلاف پیدا ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ سب سے زیادہ مختلف وہ ہے جو لاہور میں طبع ہوئی۔ ہم ذیل کے شذرے میں صرف ٹرمپ صاحب کی مترجمہ جنم ساکھی کی روایات پر اعتبار کریں گے۔

گرو نانک تلونڈی میں پیدا ہوئے، ان کی پیدائش ۸۸۰ھ مطابق ۱۴۶۹ء میں بعہدِ سلطنت بہلول لودھی ہوئی، ان کے والد تلونڈی میں پٹواری تھے۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں ملازمت حاصل کرنے کے لیے کسی فارسی عربی لیاقت کی ضرورت نہیں تھی۔ ہندی دفتر کی زبان

تھی اور اسی زبان میں تھوڑی بہت مہارت سے ملازمت حاصل ہوسکتی تھی۔
بابا صاحب کی ابتدائی تعلیم کے متعلق مختلف بیانات ہیں۔ بنیتھر پر کاش میں لکھا ہے کہ گرو جی نے گوپال پنڈت کے سامنے زانوئے تلمیذ تہ کیا مگر بہت جلد وہاں سے اُٹھ آئے۔ آدی گرنتھ میں پنڈت صاحب کے ساتھ معمے کے رنگ میں مکالمہ موجود ہے۔ اکثر مصنفین سیر المتاخرین[1] کی اس روایت پر اعتبار کرتے ہیں کہ آپ کے پڑوس میں سید حسن نام ایک درویش رہا کرتے تھے ان کو گرو جی سے بے حد الفت تھی انھوں نے گرو جی کو فارسی زبان میں تعلیم دینا شروع کی۔ میکالف صاحب نے فارسی معلم کے ساتھ جو مکالمہ گرو جی کا ہوا تھا وہ درج کیا ہے مگر وہ رکن الدین قاضی کے ساتھ ہوا اس میں سید حسن درویش کا نام نہیں آتا۔ ٹرمپ[2] صاحب نے اس امکان کو تسلیم کیا کہ گرو جی نے سید حسن سے کچھ استفادہ کیا ہو۔ ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کا خیال ہے کہ گرو جی کو فارسی، سنسکرت ہر دو زبانوں میں کوئی زیادہ دسترس حاصل نہ تھی لیکن شاگردی کے معاملے میں ہر دو امکانات کو تسلیم کرتے ہیں[3]۔ اکثر مورخین کو اس امر سے کہ وہ اپنی زبان میں بے تکلف فارسی کے الفاظ بولتے ہیں۔ یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ انھوں نے ضرور کسی استاد سے فارسی حاصل کی ہوگی۔
بٹالہ میں آپ کا بہنوئی جے رام دولت خاں لودھی کے مودی خانے میں ملازم تھا۔ بیان ہے کہ وہاں آپ نے ملازمت اختیار کی مگر طبیعت سے مجبور ہوکر ملازمت ترک کردی۔ کہتے ہیں کہ دولت خاں آپ کا بہت احترام کرتا تھا۔ فقرا کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے کا ذکر بے حد طویل ہے جہاں تک ہمارا خیال ہے وہ

---

[1] جلد ۲ - ص ۴۰۰ (طبع ۱۸۸۶ء) [2] دیکھو نربہ جنم ساکھی ۳
[3] ٹرانسفارمیشن آف دی سکھز ص ۹

ہندو مسلمان کے امتیاز سے بالا تھے مسلمان فقرا کے ساتھ بیٹھتے اور اٹھتے تھے۔ تاریخ پنجاب وغیرہ میں ان تمام اولیاء اللہ کا نام لکھا ہے جن کی خدمت میں بابا نانک تشریف لے گئے[1]

بابر نامے میں گرو جی کا ذکر کہیں نہیں آتا۔ البتہ گرنتھ صاحب میں ایک مقام پر بابر بادشاہ کا ذکر آتا ہے۔ نیز جنم ساکھی مترجمہ ٹرمپ صاحب بھی تفصیلی ملاقات کے ذکر سے خالی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر کے ساتھ گرو جی کی ملاقات کے افسانے بھی اکثر و بیشتر موضوع ہیں۔

رائے بولار کو آپ سے بہت عقیدت تھی۔ یہ بھٹی ذات کے مسلمان راجپوت تھے۔ گرو جی کے ساتھ ان کے تعلقات بہت مخلصانہ تھے۔

ٹرمپ صاحب لکھتے ہیں کہ بابا صاحب کا سفرِ مکّہ محض افسانہ ہے اور اس میں کوئی اصلیت نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان اور ایران وغیرہ کا سفر آپ نے کیا اور وہاں کے فقرا و صلحا سے ملا کیے۔ اکثر معاملات میں تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔ آپ کے ہم سفر لوگوں میں ایک 'مردانہ ربابی' تھے جو ہر مقام پر آپ کے ساتھ گئے۔

میں نے گزشتہ واقعات میں صرف ان باتوں کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق مسلمانوں کے ساتھ تھا۔ اس ترتیب و تعیین سے ہمارا ایک مقصد ہے جس کا ذکر ہم اس مضمون کے خاتمے پر کریں گے۔ اب ہم گروگرنتھ کا مطالعہ کریں گے۔ تاکہ ہم گرونانک کی فارسی میں دستگاہ کا حال معلوم کر سکیں۔

---

[1] تاریخ بوٹے شاہ (قلمی) ص ۱۵۳

(۲)

گرو گرنتھ صاحب کا مطالعۂ لسانی

گرو گرنتھ صاحب کے پہلے محلے یعنی اس حصّے کی تحقیق سے جو گرو نانک صاحب کی تصنیف ہے معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی اشعار میں فارسی الفاظ بکثرت استعمال کیے گئے ہیں۔ صرف "جپ جی" پر ہی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان اشعار میں فارسی کے لفظ بلاتکلّف آئے ہیں مثلاً

۱۔ کیو سچیاراں ہوییے کیو کوڑے تٹے پال
حکم رجائی چلناں نانک لکھیا نال

گرو گرنتھ صاحب (لاہور ۱۹۱۶ء) صفحہ ۱

حکم۔ بمعنی عام
رجائی۔ بمعنی رضا

۲۔ گاوے کو جاپے دسے دور
گاوے کو دیکھے حادرا حدور

(ایضاً)

حادر۔ حاضر
حدور۔ حضور

۳۔ جنی نام دھیایا گئے مسقت نال۔ الخ (ایضاً صفحہ ۱۱)

مُسقت مُشقت

۴۔ کھٹ ترسی مکھ بولنا مارن ناد گئے (ایضاً صفحہ ۱۱)

تُرسی۔ تُرشی

صفحہ ۲۲ و مابعد پر تقریباً ہر شعر میں فارسی عربی کے لفظ موجود ہیں۔ مثلاً سفیدی، تیر کمان، ذات، نظر (ندر) بادشاہ (پاتشاہ) زور، شمار، بدفعلی (بدفیلی) غایبانہ (گیبانہ) وغیرہ۔

ٹرمپ صاحب اور دیگر محققین نے بابا نانک کے چند خالص فارسی اشعار کا ذکر کیا ہے۔ اس قسم کے اشعار جن میں فارسی گرامر کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہو یا جن کو کسی طرح فارسی کا شعر کہا جا سکتا ہو بہت کم ہیں۔ میرے زیرِ نظر جو اشعار ہیں ان کی نوعیت یہ ہے کہ فارسی کے کچھ الفاظ (عموماً اسما) ایک جگہ جمع کر دیے گئے ہیں جن کو جوڑنے کے لیے یا تو کوئی چیز موجود نہیں یا بعض اوقات پنجابی یا گرنتھ کی اصلی زبان کے ایک دو لفظ شعر کے اندر رکھ دیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر گرو گرنتھ صاحب صفحہ ۶۵ ملاحظہ ہو۔

۱۔ پیر پیکامبر سالک صادق شہدے اور شہید
شیخ مشایخ قاضی مُلّا اور درویش رشید

اس شعر میں جہاں تک میرا خیال ہے "شہدے" "ور" "اور" کے سوا کوئی غیر فارسی نہیں اس کے باوجود شعر کو بالکل فارسی شعر نہیں کہا جا سکتا۔

۲۔ صدق صبوری صادقاں صبر توسہ (توشہ) ملائکاں
دیدار پورے .... الخ ایضاً صفحہ ۱۰۵

پہلا مصرعہ سارا عربی فارسی الفاظ کا مجموعہ ہے۔

۳۔ صدق کر سجدہ من کر مقصود
جید ھر دیکھا تید ھر موجود ایضاً

۴۔ قدرت ہے قیمت نہ پائے
جا قیمت پائے کہی نہ جائے ایضاً

۵۔ مہر معیت صادق مصلی حق حلال قرآن
سرم سنّت سیل روجا (روزہ) ہوہ مسلمان
کرنی کعبہ سچ پیر کلمہ کرم نواج (نماز)
تسبی (تسبیح) سانت ... .الخ ایضاً صفحہ ۱۰۹

اس مثال میں اکثر الفاظ عربی کے ہیں۔

نیز چند اشعار فارسی کے پورے بھی ملتے ہیں لیکن وہ بھی ایسے نہیں جو ہمارے لیے ایک سند کا کام دے سکیں۔ بلاشبہ وہ مذکورۂ بالا مثالوں کی نسبت زیادہ صاف اور واضح ہیں لیکن ایک دو اشعار کا موجود ہونا چنداں قوی دلیل نہیں ہے:

۱۔ یک عرض گفتم پیش تو در گوش کن کرتار
حقا کبیر کریم تو بے عیب پروردگار

۲۔ دنیا مقام فانی، تحقیق دل دانی
ہم سر موئے عزرائیل گرفت دل ہیچ نہ دانی

۳۔ زن پسر، پدر، برادران کس نیست دستگیر
آخر بیفتم کس ندارد، چوں شود تکبیر

۴۔ شب روز گشتم در ہوا کردم بدی خیال
گاہے نہ نیکی کار کردم ہم ایں چنیں احوال

۵۔ بد بخت ہم چو بخیل غافل بے نظر بے باک
نانک بگوید جن ترا تیرے چاکراں پا خاک
(راگ تلنگ محلہ پہلا)

ہمیں کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے صرف اتنی ہی مثالیں کافی ہوں گی۔

گرنتھ صاحب کے مطالعۂ لسانی سے میں جس نقطے پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ پہلے تو بقول ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کے "گروجی کی دوسرے مذاہب کی تنقید عالمانہ نہیں" ان کی زبان کا وہ انداز نہیں جو دوسرے مذاہب کے ایک جید عالم کا ہو سکتا ہے۔

دوم یہ کہ اگر محلہ اول میں جتنے فارسی الفاظ موجود ہیں ان سب کو جمع کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بابا صاحب کے ذہن میں فارسی کے بہت کم الفاظ موجود ہیں۔

سوم جتنے الفاظ موجود ہیں وہ بالکل عام سے ہیں۔ بظاہر وہ الفاظ عام زبان کے اندر رائج ہو چکے تھے یا اگر رائج نہ بھی ہوئے تھے تو گروجی نے اکثر مسلمان فقرا کے ساتھ ملاقاتوں میں اخذ کیے ہوں گے۔

غرض صرف گرد گرنتھ صاحب میں فارسی الفاظ کا موجود ہونا ہمارے نزدیک اس بات کی کافی اور مؤثر دلیل نہیں کہ گرونانک فارسی زبان کے ایک بلند پایہ عالم تھے جیسا کہ میکالف صاحب نے تحریر کیا ہے تاوقتیکہ ان کی فارسی دانی کے حق میں اس سے بہتر دلیل نہ مل سکے جو تمام ارباب نظر کے نزدیک حجت قاطع ہو۔ زبان میں غیر ملکی الفاظ کا آنا بالکل معمولی اور عام بات ہے۔ آج ورنیکلر میں اور عوام کی زبان میں انگریزی کے صدہا الفاظ بے تکلف موجود ہیں۔ صرف ان الفاظ کا موجود ہونا ہمیں اس فیصلے پر نہیں لا سکتا کہ کوئی شخص اس زبان کا ماہر مان لیا جائے۔

(۳)
گرونانک جی کی فارسی تصنیفات

معارف نے فہرست کتب خانۂ آصفیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ بابا نانک

نے علم اخلاق و تصوّف پر دو تین کتابیں لکھی ہیں مثلاً (۱) الٰہی نامہ (۲) دل طلب (۳) مناجات در بحر طویل۔ راقم نے ایک خط لائبریرین آصفیہ لائبریری کے نام لکھا جس میں ان سے ان کتابوں کے صحیح حالات بہم پہنچانے کی درخواست کی اس کے جواب میں جو خط ان کی جانب سے موصول ہوا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ:۔

"دل طلب اور الٰہی نامہ ہر دو رسالوں کے مُصنّف کا نام معلوم نہیں دل طلب نظم میں ہے اور الٰہی نامہ نثر میں ہے۔ ان ہر دو رسالوں کو بابا نانک سے کوئی تعلق نہیں۔ فہرست میں غلطی سے ان کو بابا صاحب کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جس کی وجہ یہ ہوئی کہ یہ دونوں رسالے ایک مجموعۂ رسائل میں شامل تھے جن کے آخر میں بابا نانک شاہ کی مناجات ہے فہرست نگار نے غلطی سے تمام رسالوں کو بابا نانک شاہ کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ غرض دل طلب اور الٰہی نامہ ہر دو بابا نانک شاہ کی تصانیف نہیں ہیں"۔ باقی رہا مناجات کا معاملہ تو وہ گرو نانک کی جپ جی کا ترجمہ ہے جو کسی نے بارھویں صدی ہجری میں کیا ہے۔

گزشتہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بابا نانک کی کوئی تصنیف فارسی میں موجود نہیں۔ جن محققین نے بابا نانک کے عالم ہونے پر زور دیا ہے۔ اکثر نے صرف اسی وجہ سے زور دیا ہے کہ گرو گرنتھ صاحب میں فارسی کی آمیزش ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کوئی دلیل نہیں دی۔

جہاں تک ہمارا خیال ہے گرو نانک صاحب فارسی کے عالم نہ تھے۔ ان کو صرف تھوڑے الفاظ پر عبور تھا جن کو وہ گرو گرنتھ صاحب میں وقتاً فوقتاً استعمال کرتے ہیں زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ فارسی کی معمولی واقفیت رکھتے تھے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ بابا نانک نے کئی ملازمین شاہی کے

ساتھ ملاقاتیں کیں۔ ان کی ہند اور ما ورائے ہند مسلمان مشائخ کے ساتھ صحبتیں رہیں۔ اکثر مسلمان مُریدان سے فیض حاصل کرتے تھے پس ان حالات میں ان کی زبان میں فارسی عربی الفاظ کا آجانا لابدی اور ناگزیر تھا۔ مزید یہ کہ فارسی عربی کے جو الفاظ اور فقرے موجود ہیں وہ بھی اپنی اصلی حالت میں نہیں بلکہ بگڑی ہوئی صورت میں ہیں۔ لہٰذا یہ نتیجہ زیادہ قرین صواب ہے کہ باباجی فارسی کا بہت معمولی علم رکھتے تھے۔



ضمیمہ ب

مثنوی بیغم بیراگی[1]

سوانح سوامی بھوپت رائے[2] بیراگی کھتری قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے آبا و اجداد پنجاب میں عہدۂ قانون گو پر فایز رہتے چلے آئے تھے۔ مخزن الغرایب[3] میں لکھا ہے کہ بھوپت رائے بیراگی پٹن سرکار جموں کا رہنے والا تھا۔ شعر و شاعری میں افضل سرخوش کا شاگرد تھا۔ چنانچہ کلمات الشعرا[4] میں ہے:-

"کہ بھوپت رائے بیغم آزاد مشرب بمذاق فقر آشنائی دارد و پیش فقیر مشق مے گزارد۔"

مخزن الغرایب کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیغم بھی اپنے آبا و اجداد کی طرح قانون گو ہی تھا کہ پنجاب کو چھوڑ کر دہلی آ گیا اور وہاں شیخ الشیوخ محمد صادق (راینالجی ؟) کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا۔

---

[1] یہ مضمون پہلے اورینٹل کالج میگزین میں شایع ہوا۔

[2] نہایت تعجب کا مقام ہے کہ مسٹر اے۔ ایف۔ ایم عبدالقادر صاحب ایم۔اے پروفیسر اسلامیہ کالج کلکتہ نے اسلامک ریویو ۱۹۲۹ء (ج ۳۔ نمبر ۲) میں ایک مضمون کے دوران میں بیغم کو اکبر کا درباری قرار دیا ہے (ملاحظہ ہو ص ۱۴۱) یہ قطعًا غلط ہے [3] قلمی مملوکۂ پروفیسر شیرانی صاحب

[4] قلمی مملوکۂ یونیورسٹی لائبریری۔

شیخ کے دم قدم سے اس وقت دہلی بسطام بنی ہوئی تھی اور فقر و تصوّف کا ذوق ان کی بدولت عام ہوگیا تھا۔ بہیم نے بھی انھیں سے کسبِ سعادت کیا۔

گلِ رعنا[1] میں لکھا ہے کہ بہیم کو نراین چند سے اتنا شغف ہوگیا تھا کہ بالآخر دنیا کو ترک کر دیا۔

سفینۂ خوشگو[2] کا مصنّف بندرابن داس جو بہیم کا شاگرد تھا۔ اپنے تذکرے میں لکھتا ہے کہ میں نے عمر کے چودھویں سال میں بہیم سے کسبِ علوم کیا تھا۔

تصانیف بہیم نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے پربودھ چندرودناٹک اور مثنوی قصص فقرائے ہند کو ہندستان میں خاص شہرت حاصل ہے۔ علی الخصوص مثنوی فقرائے ہند کو بے حد قبولِ عام نصیب ہوا۔ شفیق تذکرۂ گلِ رعنا میں لکھتا ہے کہ بہیم کی کلیات پندرہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ہمیشہ بہار[3] کے مصنف کا بیان ہے کہ ان دو کتابوں کے علاوہ بہیم نے کچھ اور صوفیانہ رسالے بھی لکھے ہیں جنھیں "نراین چند" کے نام پر معنون کیا ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ یہ رسالے نراین چند کی بجائے نراین بیراگی کی طرف منسوب ہوں جو بہیم کا گرو تھا۔

کلام بہیم کے دیوان کا ذکر کہیں بھی موجود نہیں۔ اس کی نظمیات کا بیشتر حصّہ فقر و عرفان کے جذبات سے لبریز معلوم ہوتا ہے۔ تصوف کا اس کے دماغ پر بہت اقتدار تھا۔ اسی مذہبی اور صوفیانہ ذہنیت کا اثر تھا

---

[1] گلِ رعنا (بانکی پور لائبریری فہرست ج ۸۔ ص ۱۴۰) [2] بانکی پور لائبریری ج ۸۔ ص ۹۵ [3] سپرنگر۔ ص ۱۱۹

کہ اس کا کلام زیادہ تر تصوف کے متعلق ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے پاس بیغم کی مثنوی کے علاوہ اس کی نظم کا نمونہ بہت کم موجود ہے۔ اس لیے اس کے کلام پر جامع تبصرہ کرنا حدِ امکان سے باہر ہے۔ تاہم تذکروں کے بعض اشعار یہاں نقل کرتے ہیں۔ خان آرزو نے مجمع النفائس[1] میں یہ شعر بیغم کی طرف منسوب کیے ہیں:-

در فضائے عشق جاناں بوالہوس را کار نیست
ہر سرے شایستۂ سنگ و سزائے دار نیست

ہم چو صبحے از دلِ خورشید مے آید بروں
وہ چہ جامست ایں کز و جمشید مے آید بروں

مرا ابرو کمانے می کشد در بر روئے تر ہم
کہ ایں در بر کشید نہا چو ناوک دُور ہم اندازد

تذکرۂ روزِ روشن[2] میں یہ رُباعی بیغم کے ذکر میں درج ہے:-

دریا در موج و موج اندر دریاست | در ذات و صفاتِ حق تفاوت ز کجاست
اے محوِ حقیقت نظر افگن بمجاز | بے رنگ بصد رنگ چیاں جلوہ نماست

پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مثنوی بیغم کا ایک قلمی نسخہ ہے اس کے ذیلی اوراق میں بیغم کی کچھ رباعیات بھی درج ہیں۔ ہم ان میں سے کچھ یہاں نقل کرتے ہیں:-

بیغم نقشے ز خود بروں باید بود | از چوں بگذشتہ بے چگوں باید بود
اعمالِ بد و نیک بطفلاں بگزار | وہم است (.... ؟) وہم چوں باید بود

---

[1] قلمی (یونیورسٹی لائبریری) ق ۹۱ [2] صفحہ ۱۱۶

بنغیم سخن عشق بجز یار مگو — سرّیست سر کوچہ و بازار مگو
گر جملہ جہاں از تو حقیقت پرسند — زنہار جز اقرار ز انکار مگو
عارف کہ ز اسرار ازل آگاہ است — گویندش خلق ملحد و گمراہ است
در دیدۂ حق شناس خورشید نگاہ — ہر ذرّہ کہ بینی ہمہ وجہ اللہ است
ای دل اگر آں عارض دلجو بینی — ذرات جہاں را ہمہ نیکو بینی
در آئنہ کم نگر کہ خود بیں نشوی — خود آئنہ شو تا ہمگی او بینی
ہرگاہ کہ ساز عیش بنیاد کنید — باید کہ دل غمزدہ شاد کنید
یاراں چو دمے بیک دگر بنشینید — باللہ کہ از فقیر خود یاد کنید

مثنویٔ بنغیم

بنغیم کی عام شاعری کے اس اجمالی ذکر کے بعد ہم اس کی مثنوی کا حال کسی قدر تفصیل سے لکھتے ہیں جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے - عام تذکرہ نویسوں نے اس کا نام "قصص فقرائے ہند" لکھا ہے لیکن ہماری رائے میں یہ نام صحیح نہیں۔ اولاً اس لیے کہ یہ نام مصنّف نے نہیں رکھا ثانیاً اس لیے کہ مثنوی کے مضامین صرف فقرائے ہند تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں فقرائے ہند کے علاوہ بعض اور مسلمان اکابر صوفیہ کی حکایات بھی ہیں۔ ہمارے خیال میں اس کو قصص کے نام سے یاد کرنا بھی کچھ زیادہ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ اس میں ویدانت، فلسفہ اور اسلامی تصوف کے نازک اور لطیف مسائل موجود ہیں۔ جن تذکرہ نویسوں نے اس کو "قصص" کے نام سے یاد کیا غالباً انھیں اس کی حقیقی قدر و قیمت کا احساس نہیں تھا۔

اس چیز کو ثابت کرنے کے لیے کہ مثنوی کا جو نسخہ ہمارے پیش نظر ہے وہ فی الواقعہ "بنغیم" سے ہی متعلق ہے۔ ہمارے پاس کئی دلائل ہیں مثلاً کتاب

کے اثنا میں بیغم کا نام متعدد بار آیا ہی۔ مثلاً

بیغم مانیست بیغم ز اصل خویش	وا یما جوید کنار وصل خویش

(ورق ۸)

ہم چو من کس در جہاں خورم مباد	کافر و مومن چو من بیغم مباد

(ورق ۶۹)

طرفہ عہدے بود بیغم پیش ازیں	آں چناں شاہاں فقیراں ایں چنیں

(ورق ۷۲)

شطح بیغم، بیغم آمد در کلام	شطح بیغم نیست چوں شطح انام

(ورق ۸۴ ب)

گلِ رعنا میں شفیق نے قصص فقرائے ہند کے سلسلے میں لکھا ہی کہ اس میں بام دیو (نامدیو) کی پُرلطف کہانی موجود ہی چنانچہ یہ قصہ ہمارے نسخے کے ورق ۱۱۲ پر شروع ہوتا ہی۔ کتاب کا مطالعہ اس حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہی کہ یہ ضرور کسی ہندو صوفی کی تصنیف ہی۔ چنانچہ ذیل کے اشعار اس امر کا اعلان کرتے ہیں:۔

منکر ما منکرِ اہل صفا	منکر ما منکرِ ارض و سما
منکر ما، منکر رام و سیام	منکر ما رد سیاہ خاص و عام

(ورق ۹۵)

کتاب میں ہندو اولیا و فقرا کی کرامات اور ان کے معجزات کا ذکر ہی۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم کی نعت نہیں اور یہ وہ چیز ہی جو مسلمان مُصنّفین کے نزدیک نہایت ضروری اور ناقابلِ حذف سمجھی جاتی ہی شروع میں مناجات کا ہونا ہمارے دعوے کی ذرا بھی تردید نہیں کرسکتا۔ ہندو

انداز خیال، ویدانت کے نکتے، کبیر و نانک کی شطحیات سب اس چیز کو ثابت کر رہی ہیں کہ اس مثنوی کا مُصنّف بجز "بنیم بیراگی" کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

شاگردی بنیم کی وفات ۱۱۳۲ھ میں واقع ہوئی تھی اس لیے یہ امر قرین قیاس ہے کہ بنیم نے ملّا شاہ اور دارا شکوہ کے زمانے کی کچھ جھلک ضرور پائی ہو گی۔ دارا شکوہ کا ماحول کچھ اس قدر صوفیانہ اور فلسفیانہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اکثر ہندو منشیوں کے متعلق یہ امر ثابت ہے کہ انھوں نے ترکِ دنیا کو احساس وجود اور علّتِ زندگی کی مصیبت کے ختم کرنے کا واحد ذریعہ سمجھا۔ منشی چندر بھان برہمن نے دارا شکوہ کی وفات کے بعد عزلت گزینی کر لی۔ منشی ولی رام ولی نے بھی یہی راستہ اختیار کیا اور کلفتِ حیات کو ترک آرزو سے مٹایا اگرچہ بنیم بیراگی کا دارا شکوہ کے دربار سے کوئی خاص تعلق معلوم نہیں ہوتا تاہم نراین چند کی محبت میں وہ بھی از خود رفتہ ہو گیا اور پھر اس نگری کی راہ لی جہاں دارا شکوہ کا مقام تھا۔ نراین بیراگی اور شیخ محمد صادق کے دوگونہ مواعظ سے اس کا قلب مجمع البحرین بن گیا تھا چنانچہ مثنوی میں ہم جا بجا ان دو رنگی موجوں کا سُراغ پاتے ہیں جن کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ان میں اسلامی اور ہندو تصوف کا رنگ علیحدہ علیحدہ پائیں گے۔ اسی زمانے میں ملا شاہ (المتوفی ۱۰۷۲ھ) بہت بڑے صوفی اور عالم تھے۔ یہ میاں شاہ میر لاہوری کے شاگرد تھے اور انھوں نے بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ "مثنوی بنیم" میں مُصنّف نے خود حضرت ملا شاہ کا ذکر کیا ہے:-

وہ چہ خوش فرمود ملّا شاہِ ما | شاہ ما آں عارفِ آگاہ ما
بین الناس گر نبودے درمیاں | اوّل و آخر نبودے غیر آں

(ق ۱۰۶)

ملّا شاہ کا اثر اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہنغیم ملا شاہ کے خیالات سے بہت اثر پذیر تھا جس کا کچھ سُراغ ہمیں مثنوی میں ملتا ہے۔

مثنوی بہنغیم اور رسالۂ نسبت ملا شاہ میں سے ایک ایک اقتباس ہم یہاں نقل کرتے ہیں:۔

مثنوی بہنغیم	رسالۂ نسبت ملّا شاہ
گر کسے تصنیف مے سازد کتاب	ہر کہ تصنیف کردہ است کتاب
مے نویسد اندراں دہ فصل باب	ہمہ آوردہ است فصل و باب
در کتابم نیست فصل و بابہا	بابہا دربیان ہرچہ کہ گفت
در کتابم نیست تبیج و تابہا	وز ہر باب فصل و باب شگفت
در کتابم نیست جز ذکرِ خدا	فصل و بابے نہ در کتاب من
مثنوہم نیست غیر از یک نوا	عددے ہم نہ در حساب من
عندلیب مست باغ وحدتم	باب در توبہ و توکل نیست
سوختہ جانے ز داغ وحدتم	فصل در صبر و در تحمل نیست
(قلمی ق ۱۶)	فصلِ من جز یکے سخن نبود
	گرد و گوئی است باب من نبود
	(قلمی ق ۱۶۷)

مثنوی بہنغیم کی زبان اتنی زیادہ شستہ اور صاف نہیں، فکّ اضافت جو زبان کی شریعت میں مکروہ سمجھی جاتی ہے بہت زیادہ ہے۔ تاہم مطالب کے اظہار میں بہنغیم کامیاب معلوم ہوتا ہے جو وہ کہنا چاہتا ہے پڑھنے والے

کے ذہن نشین ہو جاتا ہے جیسا کہ ہم آیندہ چل کر تفصیل کے ساتھ بتلائیں گے۔
رُومی کا اندازِ بیان مثنوی بیخم میں زیادہ نمایاں ہے۔ رُومی کے خاص
الفاظ، ای عمو، ای دادخواہ وغیرہ بہت ملتے ہیں۔ اس کے اسٹایل میں
تکلف بالکل نہیں اور تصنّع اور بناوٹ سے بالکل بری ہے۔ وہ خود لکھتا ہے:۔

آں چہ مے آید بدل از سوئے حق
بے تکلف مے نگارم بر ورق (ق ۹)

مثنوی کی بعض خصوصیات

اب ہم اس مثنوی کی خصوصیات پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے
کہ فارسی کے ہندستانی لٹریچر میں بیخم کی مثنوی کو خاص درجہ حاصل ہے
چونکہ اس مثنوی کے متعلق پہلے بہت کم ذکر کہیں آیا ہے۔ اس لیے ہم اس
کی خاص باتوں کو قدرے تشریح کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں:۔

رُومی کی صدائے بازگشت

مثنوی بیخم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مولوی رُومی
بیخم بیراگی کے روحانی اُستاد تھے مثنوی بیخم
مولانائے رُوم کے خیالات کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے بیخم مثنوی
رُومی کا شیدائی ہے۔ چنانچہ کتاب کی ترتیب، خیالات کی نوعیت، تصوّف کے
تفلسف کی جھلک سب باتیں اس حقیقت نفس الامری کو عالم آشکارا کر رہی
ہیں کہ اگرچہ ہم نے مُلّا شاہ، نراین بیراگی اور شیخ صادق قدس سرہٗ کی
تصانیف اور فیوض صحبت کا اثر بیخم پر ثابت کیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ بیخم کا اصلی سرچشمۂ فیض اور سب سے بڑا منبعِ عرفان رُومی تھا بیخم کی
مثنوی یوں شروع ہوتی ہے:۔ ؎

دل چپیدہ تنہا حکایت مے کند
چشم خونباراں روایت مے کند

تا ز اصل خود جدا افتادہ ام
داد بے تابی چو بسمل دادہ ام

گاہ چوں بسمل طپم در خاک و خوں
گہ چو بوئے گل روم از خود بروں

گاہ گریم ہم چو ابر نو بہار
گاہ پیچم ہم چو زلفِ تا بدار

گاہ نعرہ مے زنم بر روئے گل
گاہ مے جوشم بخم در رنگ مُل

آتشے در سینہ دارم شعلہ زن
چیست آں آتش بدل حب الوطن

(بنیم قلمی ورق ۱،۲)

ان اشعار ابتدائیہ کے ساتھ ساتھ اگر مثنوی کے ان اشعار کو بھی پڑھیں تو ان کے اندر ایک خاص مماثلت محسوس ہوتی ہے

بشنو از نے چوں حکایت مے کند
وز جدائیہا شکایت مے کند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرح درد اشتیاق

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگار وصل خویش

آتش عشق ست کاندر نے فتاد
جوشش عشق است کاندر مے فتاد

(رومی۔ نکلسن ایڈیشن۔ صفحہ ۲)

مثنوی رومی کی دو خصوصیتیں مولانا شبلیؒ سوانح میں لکھتے ہیں کہ مثنوی کی خصوصیاتِ ممتاز دو ہیں پہلی خصوصیت اس کا طریقۂ استدلال یعنی تمثیل کے ذریعے دلیل لانا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حکایتوں اور افسانوں کے ضمن میں مسائل کی تعلیم دی گئی ہے۔ بنیم نے اس معاملے میں بھی مثنوی کا تتبع کیا ہے۔ یہ رومی کا ہی فیض معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی بنیم کے اندر جیپرنہ کچھ جاذبہ موجود ہے۔ قیاس تمثیلی کو کامیابی

کے ساتھ نباہنے کے لیے تخیّل کی بلندی اور خیالات پاکیزہ کی فراوانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ رومی جس بیان کو لیتے ہیں اسے تمثیل کے ذریعے اس قدر آسان اور قریب الفہم بنا دیتے ہیں کہ عام سے عام آدمی بھی ان کی اصل بات کو پالیتا ہے۔ بنعیم کا تخیّل اگرچہ اتنا بلند نہیں تاہم رومی کا ہلکا سا رنگ موجود ہے۔ مثلاً اس بات کو ثابت کرنا ہے کہ عارف پر ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کے لیے انا الحق کہہ دینا جائز ہوتا ہے تو ایک کہانی کے بعد اس طرح بیان کرتا ہے ؎

آہن از آتش کند چوں سُرخ رُو — خود انا النار ست لافش مو بمو

گر بر آئینہ نتابد آفتاب — آں زماں باشد انا الشمس جواب

گر فتد در بحر قطرہ از ہوا — ہین انا البحر ست گوشش را ندا

آں انا الحق آں زماں گفتن سزاست — دُرِ معنی آں زماں سفتن رواست

مثلاً یہ ثابت کرنا ہے کہ روح انسانی یا اضافی کو جس انسان کے فنا ہو جانے کے بعد کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو اس کے لیے یہ انداز اختیار کیا ہے ؎

رُوحِ انسانی ست یک روح جہاں — روح انسانی ست ہمچو آسماں

گر ہزاراں خانہ ہا برپا شود — نور شمس اندر ہمہ پیدا شود

در ہزاراں خانہ ہم گردد خراب — ہم چناں برخاست نورِ آفتاب

وحدت و کثرت کے مسئلے کی تشریح کرتے ہوئے یہ اندازِ بیان اختیار کیا ہے ؎

وحدت و کثرت تجلیہائے ذات — فہم کن حر فہم زروئے التفات

بحرِ وحدت تاکہ در آرام بود — ایں حباب و موج ہا گمنام بود

گشت چوں عمان وحدت موجزن — شد حباب و موج دریا بی سخن

نقش برآب ست ہین موج و حباب — فہم کن واللہ اعلم بالصواب
چیست وحدت بحرِ بے موج و حباب — چیست وحدت ایں دل بے پیچ و تاب
چیست کثرت جلوۂ حُسن نگار — چیست کثرت گلستانِ نوبہار
چیست وحدت ایں دلِ بے آرزو — چیست وحدت ایں گُلِ بے رنگ و بو
چیست وحدت آفتابم در خفا — چیست وحدت صافیِ اہلِ صفا

وحدت و کثرت بود چوں روز و شب
ایں سخن بہتر بود در زیرِ لب

(ق ۹۵ ب و مابعد)

جس طرح رومی نکاتِ فلسفہ اور مسایلِ تصوّف کو تمثیلی حکایتوں کے ذریعے عام فہم اور دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح بنغیم بھی چھوٹی چھوٹی حکایتیں اور قصّے لاتا ہے۔ بعض پیر و مرشد کے مکالمے کی صورت میں ہیں بعض حیوانوں اور غیر ذی اشیا کی تقاریر ہیں اور بعض نامور بزرگوں کی منقولات ہیں۔ ہم ناظرین کی تفنّنِ طبع کی خاطر بعض حکایتوں کو مع چیدہ چیدہ اشعار کے یہاں نقل کرتے ہیں:-

تصوّر

ایک دفعہ جنیدؒ کے کسی مرید نے اُن سے سوال کیا کہ آپ کس کا تصوّر باندھا کرتے ہیں تو انھوں نے فرمایا بلّی کا۔ ایک دفعہ بلّی میرے کمرے میں آئی آتے ہی کیا دیکھتی ہے کہ ایک چوہا ایک سوراخ سے نکلا لیکن بلّی کو دیکھ کر وہ فی الفور اپنے بِل میں گھس گیا۔ اس پر اس بلّی نے متواتر کئی گھنٹوں تک نہایت استقلال، ضبط، تمرکزِ خیال سے انتظار کیا۔ بالآخر وہ چوہا بلّی کے پنجے میں آگیا۔ چنانچہ اس کے بعد سے میں اس بلّی کو ہادیِ راہ سمجھتا ہوں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں ؎

در طریقت ہا کم از گربہ مباش
چند گو بیدت سخن ہا فاش فاش

ہستیٔ باری کی حقیقت کو یہ مادی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ یہ مادی دماغ اس کی کنہ کو نہیں پا سکتے لیکن ہم اس کی ہستی کو اس کی صفات سے جان سکتے ہیں۔ اس بحث کو ایک فلسفی اور صوفی کے مناظرے کے ضمن میں بیان کیا ہے جس میں فلسفی کو مسکت جواب دیا ہے اور صحت کے علم ادراک و عدم وجدان کی تمثیل سے وجود باری پر استدلال کیا ہے۔ ایک فلسفی اربابِ حال پر طعنہ زنی کیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ لوگ بے سود تلاش میں اپنی عمر برباد کر رہے ہیں جو خود وہم اور قیاس اور خیال سے پاک اور بلند ہو اس کی تلاش اور اس کے ساتھ ملنے کی خواہش بھی جنون سے کم نہیں ؎

آں کہ باشد پاک از وہم و خیال
عشق او ہم باشد از فکر محال

صحت کی تمثیل

اس کا خیال تھا کہ وجد اور حال سراسر تلبیس ہے اور ان کے اندر ذرہ بھر حقیقت نہیں۔ بے خودی کو جنون، استغراق اور تصور کو دیوانگی اور سعیٔ لاحاصل سمجھتا تھا۔ اتفاقاً وہ فلسفی بیمار پڑ گیا۔ ہر چند اس کا علاج کرتے تھے لیکن کوئی دوا کارگر نہ ہوتی تھی۔ ایک صوفی صاحب نے جب فلسفی کی علالت کا حال سنا تو تیمارداری کی خاطر حاضر ہوئے اور پوچھا اچھا یہ تو فرمایئے کہ آپ اس وقت سب سے زیادہ کس چیز کو پسند فرماتے ہیں۔ کہا اس وقت تو صحت ہی مرغوب ترین مطالبہ ہے ؎

گفت صحت از تو خواہم ای جواد — نیست جز صحت تمنا و مراد
گفت صحت چیست بر گو ز نشاں — صورت و شکلش بیاور در بیاں

او چہ دارد رنگ از سُرخ و کبود | او چہ دارد قد و قامت در نمود
از جما دانست یا جنسِ غذا | یا زحیوانست در ارض و سما
ورد کا نہا ہست یا جائے دگر | زود گو با من ازاں صحت خبر

فلسفی کا جواب ؎

گفت صحت را نہ باشد نمود | صحت آمد پاک از جسم و وجود
اوست بیچوں از کجا گویم نشان | نیست در کوہ و بیابان و دکان

صوفی ؎

گفت چوں خواہی تو بیچوں راکنوں؟ | از کجا یابی تو بے چون وچگوں
آں کہ بیچون ست چوں آید بدست | زود گو با من تو اے دانش پرست

فلسفی ؎

گفت زاں صحت ندانم من خبر | لیک دانم ایں قدر اے دیدہ ور
می رسد چوں صحتم در جسم و تن | می شوم خنداں و ریحاں چوں چمن
تندرست و چاق و فربہ می شوم | یک جوانم آں زماں وہ می شوم

ہست صحت بے گماں در روزگار
لیک ناید در نظر اے ہوشیار

صوفی نے اس کے جواب میں یہ کہا کہ میں 'ذات صحت' کے متعلق سوال کر رہا ہوں اور آپ صحت کے صفات کی تفصیل بیان فرما رہے ہیں۔ اگر آپ نے صحت کی ذات کو کہیں دیکھا ہے تو وہ بتلایئے۔ یہ تو اس کی صفات ہیں۔

فلسفی نے کہا ؎

گفت من ذاتش نہ دیدم ہیچ جا | ذات او پاک ست از چون وچرا

صوفی ؎

گفت گر از مذہب خود بگذری | رہ بسوئے ذاتِ صحت می بری
ذاتِ صحت ذاتِ حق ست ای جواں | چوں شوی منکر ز سیر لامکاں

وصف را بے ذات کی باشد وجود
کی بود بے ذات وصفش در نمود

حقیقتِ بشری کا علم ایک فرضی کہانی میں یہ مسئلہ پیش کیا ہے کہ انسان اپنی بے خبری اور جہالت کی وجہ سے حقیقتِ عالم کو نہیں پاسکتا ورنہ اگر وہ خود اپنے اندر، اپنی حقیقت کے اندر، اپنے اسرار کے اندر غور کرے تو اس کو اس حقیقت کا پتا چل سکتا ہے۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو مٹا ڈالے اور بحرِ حقیقت میں غوطہ زن ہو جائے۔ گوہرِ مقصود اسی خود شکنی پر موقوف ہے۔ ساری کتاب میں سے اس کہانی نے سب سے زیادہ راقم الحروف کو متاثر کیا ہے۔ کہانی یہ ہے کہ ایک دفعہ برف موجِ آب کے پاس پانی کی حقیقت کا سراغ نکالنے کے لیے گئی، موجِ آب نے جواب دیا ہے کہ خود میں بھی عمر بھر اس پیچ وتاب میں رہی کہ شاید پانی کا منہ دیکھ سکوں لیکن پانی کا پتا نہ چلا۔ آؤ ہم تم دونوں "حباب" کے پاس چلیں شاید وہ پانی کا پتا دے سکے۔ چنانچہ برف اور موج، حباب کے پاس پہنچے حباب نے کہا کہ میں خود ایک عرصے سے پانی میں اپنا خیمہ تانے کھڑا ہوں اور سراپا آنکھ بن کر اس انتظار میں ہوں کہ شاید کہیں شاہدِ مقصود سے ہمکناری ہو جائے لیکن افسوس کہ ہنوز کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد بنیم لکھتا ہے ؎

طرفہ ہنگامے وطرفہ حالتے | آدمی راہست چندیں غفلتے
ہیچ کس از خویشتن آگاہ نیست | ہیچ کس را خود دریں جا راہ نیست
فضلِ حق باید کہ تا دل واشود | فضلِ حق باید کہ دل گویا شود

فضل حق دانی چہ باشد ای جواں　　این وجود عارفان و آگہاں
برف را گوید کہ پیشِ آفتاب　　زود رو تا زود بینی روئے آب
موج را گوید کہ خود را بشکند　　خویشتن را باز در عمان زند
باز گوید عارفِ ما با حباب　　چشم بکشا تا بہ بینی روئے آب
جملہ کس را بر تعیّن ہا نظر　　کس ندارد چشم بر اصلِ دگر
این تعیّن ہا نباشد جز عدم　　جز عدم نبود تو بر پا کن علم
باطن و ظاہر ہمہ آب آمدہ　　اول و آخر ہمہ آب آمدہ
نام و نقش و موج و برف و ہم حباب　　تہمت ست ای نازنیں بر روئے آب
نام و صورت نیست جز وہم ای عمو　　سرّ عرفان فاش گفتم مو بمو

اسی قسم کی ایک اور کہانی ہی جس کا مفاد یہ ہی کہ بہت سی مچھلیاں ایک عمر رسیدہ مچھلی کے پاس "حقیقت آب" کے استفسار کے لیے گئیں اس بزرگ مچھلی نے ذیل کے اشعار میں ان کو جواب دیا:-

غرقۂ آب بیدواز وی بے خبر!　　این زماں باید زدن بر سنگ سر
آب دارد ماہیاں را در کنار　　ماہیاں در جست و جوئش بے قرار

ہر چہ غیر آب باشد در جہاں
زود بنمائید مارا ای مہاں؟

غرض یہ کہ اکثر مسایل کو رومی کی طرح حکایتوں اور قصوں، مباحثات اور مناظرات کے ضمن میں بیان کیا ہی۔ ہمارا خیال ہی کہ اگر بنجیم کی مثنوی سے مثنوی رومی کی چاشنی کو علیحدہ کر لیں تو بے مزہ ہو کر رہ جائے بنجیم کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہی کہ وہ ہندو تصوّف کو رومی کے رنگ میں پیش کرتا ہی اور اس طرح اہل معنی کے دلوں میں اثر پیدا کر لیتا ہی۔

تصوّف اور ویدانت کی تطبیق مثنوی بنیم کی ایک اور خصوصیت یہ ہو کہ اس میں ویدانت اور اسلامی تصوّف کو تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہو۔ ان ہر دو روحانی سلسلوں کے انصالی مقامات کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے بیان کیا ہو مثلاً تصوّر استغراق، بے ثباتی عالم، دنیا کا ایک وہم اور افسانہ ہونا، وحدت الوجود وغیرہ مسایل اسلامی اور ہندو تصوف میں مشترک ہیں۔ ہم ان سب کو علیحدہ علیحدہ بیان کرتے ہیں:۔

تصوّر و استغراق۔ اس کی تشریح ایک کہانی کے ضمن میں کی ہو جس کا مفاد یہ ہو کہ ایک دفعہ شاہزادہ داراشکوہ نے بابا لعل سے تصوّر و استغراق کے متعلق سوال کیا۔ بابا لعل نے جو کہ ایک ہندو صوفی تھے ایک مثال کے ذریعے اس نکتے کو حل کیا یعنی ایک ہرن کو جب شکاری اپنے دام میں لے آتا ہو تو پہلے پہل وہ ہرن سخت پریشان ہوتا ہو اور ہر وقت پیچ و تاب میں رہتا ہو۔ پھر شکاری آہستہ آہستہ اس کی خوراک کم کر دیتا ہو تاآں کہ وہ ضعیف اور کمزور ہو جاتا ہو اور اس کمزوری کی وجہ سے نقل و حرکت بھی نہیں کر سکتا۔ جب صوفی پر یہ مقام آتا ہو تو اسے تصوّر کہتے ہیں۔ پھر شکاری کو جب یقین ہو جاتا ہو کہ اب بھاگ نہیں سکتا اور اس کو ایک قسم کا اُنس ہو گیا ہو تو اس کے بند کھول دیتا ہو اور پھر اس کو آہستہ آہستہ تھوڑی تھوڑی خوراک دیتا ہو تاآں کہ وہ شکاری کے ساتھ الفت پذیر ہو جاتا ہو۔ اس حالت کا نام استغراق ہو اب کسی قید و بند کی حاجت نہیں رہتی چنانچہ لکھا ہو ؎

چوں نماند حاجتش با بند و دام
ہست استغراق در معنی تمام

رومی کا ایک شعر ہے ؎

درمیانِ کعبہ رسم قبلہ نیست
چہ غم از غواص را پاچیلہ نیست

بے ثباتی عالم: اس کو ایک افسانے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ وہ افسانہ یہ ہے کہ ایک دفعہ ایک لڑکے نے دایہ سے دل خوش کُن کہانی سنانے کی فرمایش کی۔ دایہ نے کہا ایک ملک میں ایک بادشاہ رہتا تھا جو بے جسم وجان تھا۔ دیارِ نیستی کا یہ سلطان مال ومنال اور جاہ وحشمت کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ اس بادشاہ کی ایک نہایت صاحب جمال بی بی بھی تھیں لیکن بدقسمتی سے عقیم تھیں۔ بادشاہ کے اس عقیمہ کے بطن سے دو لڑکے بھی تھے۔ ایک تو عدم سے وجود میں نہیں آیا تھا اور دوسرا لڑکا ننگِ ہستی سے ابھی فارغ تھا۔ یہ شہزادے جب بڑے ہوئے تو اکثر شکار کھیلنے جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک ایسے باغ میں پہنچے جس میں درخت اور سبزے کا نام تک نہ تھا۔ تاہم ان شاہ زادوں نے ایسا محسوس کیا کہ اس باغ کی رونق خلدِ بریں سے بھی زیادہ تھی۔ جس میں ہر طرف سرو کھڑے تھے۔ اس بے برگ ونہال باغ سے ان شاہ زادوں نے اچھی طرح میوے کھائے۔ اس باغ میں دو تالاب بھی تھے جن میں سے ایک میں پانی ہی نہ تھا اور دوسرا ابھی تک کھودا ہی نہ گیا تھا۔ پھر وہ تالاب جس میں سرے سے پانی ہی نہ تھا اس کے پانی کی موجیں آسمان ہفتم تک پہنچتی تھیں۔ اس تالاب کے اندر ان دونوں شاہ زادوں نے غسل کیا۔ نہا دھو کر وہ شکارگاہ کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ یہ شکارگاہ ایک تنکے کی نوک پر تھی۔ اس شکارگاہ میں نہ کوئی ہرن تھا، نہ شیر و پلنگ۔ تاہم ان دونوں شاہ زادوں نے دو ہرن

مارگرائے۔ ان میں ایک ہرن ابھی تک رحمِ مادر میں ہی تھا اور دوسرے کا نقش وجود ابھی تک بنا ہی نہ تھا۔ شاہزادوں کے خدمت گزاروں نے ان دونوں کو کباب کے لیے صاف کیا۔ اس صحرا میں کوئی آگ کا سامان نہ تھا اس لیے مجبوراً ان خدمت گزاروں نے صحرا کے گوشے گوشے کو چھان مارا۔ ہزار تلاش کے بعد صحرا کے ایک کنارے پر ایک محل دکھائی دیا۔ اس محل میں دو بڑی بڑی دیگیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان دیگوں میں سے ایک بنی ہی نہ تھی اور دوسری بڑی اور بھاری بھرکم چیز معلوم ہو رہی تھی۔

الغرض ان دیگوں میں آگ کے بغیر کھانا تیار کیا گیا۔ کچھ گوشت کباب بنانے کی خاطر آگ پر رکھا لیکن سیخیں موجِ آب کی تھیں۔ ناگاہ دو مہمان اس مقام پر وارد ہوئے۔

اُن کا بیان تھا کہ ہم "وہم وامکان" کی بستی سے آئے ہیں۔ ان مہمانوں میں سے ایک تو مادرزاد اندھا تھا اور جو دوسرا تھا اس کی آنکھیں دکھائی ہی نہیں دیتی تھیں۔ وہ جو بے چشم تھا یوں بولا:۔

ایک شہر میں دو ہمزاد دوشیزہ لڑکیاں ہیں جن میں سے ایک ابھی شکمِ مادر سے پیدا ہی نہیں ہوئی اور دوسری رنگِ ہستی سے آزاد ہے۔ یہ حُسن وجمال میں دنیا میں بے نظیر ہیں اور آفتاب وماہتاب ان کے حُسن کے مقابلے میں ماند پڑ جاتے ہیں۔

جب ان شاہزادوں نے یہ قصّہ سُنا تو ان کے دل میں ان لڑکیوں کا عشق جاگزیں ہو گیا اور انھوں نے اس شہر کی راہ لی۔ ایک مدت تک چلنے کے بعد اس شہر میں جا پہنچے۔

جب ان لڑکیوں سے ملاقات ہوئی تو ہزار جان سے اُن پر عاشق

ہوگئے۔ اُدھر لڑکیاں بھی شاہ زادوں کے عشق میں بے جان ہوتی جاتی تھیں۔ آخر ان کا آپس میں نکاح ہوگیا۔ ان لڑکیوں کے ہاں دو لڑکے پیدا ہوئے جن میں سے ایک ابھی عدم کی قیود سے آزاد ہی نہ ہوا تھا اور دوسرا ابھی شکم کا زنداں نشین تھا۔

جب وہ شاہ زادے اس طرح بامراد ہوگئے تو وہ اپنی بستی کی طرف واپس آئے اور جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے بعد بنگیم اس کہانی کو ان اشعار پر ختم کرتا ہے ؎

ایں جہاں مانندِ ایں افسانہ است	ہر کہ بندد دل دریں دیوانہ است
غافلاں طفلاند و ایں عالم چو خواب	یا خیال و یا حباب و یا سراب
غافلاں را چشم بر صورت کشاد	عاقلاں را دیدہ بر معنی فتاد
چشمِ معنی بیں اگر حاصل شود	صورتِ ہر دو جہاں زایل شود
بحر ہیں باید نہ ایں جا موج بیں	گرچہ در موج است آں بحر الیقیں
آں دو تالاب و دو آہو و دو پور	معنیِ کونین آمد بے قصور
آں یکے فانی و دیگر مبہم است	آں کہ زیں معنی نشد آگہ بنگیم است
آں چہ آمد در نظر وہم است و خواب	یا سرابے ہست یا نقشے بر آب

ایں ہمہ خال و خط آمد بر وجود

ایں ہمہ آید عوارض در نمود

دنیا کے مبہم ہونے کا مسئلہ عام طور پر مسلم ہے۔ داس گپتا نے اپنی کتاب تاریخ فلسفۂ ہند میں اس مسئلے پر کافی بحث کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

کہ دنیا محض نمود ہے، سراب ہے۔ اس کی ظاہری دل آرائیاں بے حقیقت ہیں اور ان کا صحیح علم اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک ہم "برہم"

کو نہ پالیں اور اس کو پا لینے کا اور بالآخر حقیقت عالم کے جان لینے کا ایک ہی طریقہ ہی اور وہ یہ ہی کہ ہم اپنی عارضی ہستی کو ہستیٔ کل میں محو کر دیں پھر ہمیں معنی بین آنکھ حاصل ہو سکتی ہی اور جب تک دل تمام دواعی نفسانیہ اور خواہشات سے پاک نہ ہو سکے۔ صداقت کا راستہ ملنا مشکل ہی (داس گپتا ۴۴۳)[1]

اصل علوم خدا کی ذات ہی ویدانت کا ایک اور مسلّم مسئلہ ہی کہ تمام علوم کا مرکز اور اصل ذات خداوندی ہی۔ ہنجیم نے اس مسئلے کو شیخ شبلیؒ اور جنیدؒ کے مکالمے کی صورت میں بیان کیا۔ شیخ شبلیؒ نے ایک دفعہ حضرت جنیدؒ سے سوال کیا کہ دنیا میں اصل علوم کیا ہی؟ جنیدؒ نے جو جواب دیا اسے ہم ہنجیم کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں :-

ذات اللہ است اصل ہر علوم — نیست صرف ونحو ونے طب ونجوم
اصل جملہ علمہا ذات خدا ست — کز فروغش روشن این ارض وسما ست

گفت دیگر چیست گفتا غیر این
نیست چیزے در زمان و در زمین

کرامتِ عوام وکرامتِ خواص عام لوگ کرامت اسی چیز کو سمجھتے ہیں کہ کسی شخص سے خارق عادت صادر ہو۔ لیکن ہنجیم ایک صوفی ہی۔ اس کے نزدیک یہ کرامت نہیں۔ وہ کہتا ہی ؎

این کرامت نیست منظور نظر — این کرامت دوست دارد بے خبر
این کرامت ہست پیش اہل دل — کاں کشد پا بیت بروں از آب وگل
جہل ونادانی ز تو دور افگند — سکۂ دانش ترا بر دل زند

[1] A HISTORY OF HINDU PHILOSOPHY.

گناہ کی حیثیت ارباب تصوف بالعموم گناہ کو عذر اور مغفرت کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر گناہ نہ کیے جائیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا بطلان لازم آتا ہے۔ "ترک الذنب ذنبٌ"، مشہور مقولہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ چونکہ توبہ انسان کو گناہ سے باز رکھتی ہے اس لیے توبہ سے توبہ کرنا اصل توبہ ہے۔ چنانچہ بنیم لکھتا ہے ؎

جرم دارد فضل حق را در کنار	تحفۂ جرمے برو در دست آر
جرم گر بیش ست فضلش بیش ہست	ور بود کم خاطرم زو ریش ہست
جرم چندانے کہ مے خواہی بکن	لیک گاہے در عبادت پا مزن
ترک توبہ، توبہ آمد ای مہاں	توبہ از توبہ کنید ای مہتراں
توبہ از توبہ چہ باشد ای عزیز	برکشیدن خویش را از ہر تمیز

(۴۹ ب)

چنانچہ کبیر نے ایک دفعہ کہا تھا ؎

نام حق گر شد فرامش خوب شد
خوب شد از سر بلا مغلوب شد

الٰہیات

عشق اور خدا بنیم نے ذاتِ خداوندی کے متعلق عجیب عجیب خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ایک مقام پر "عشق اور خدا" کو ایک ہی چیز کہا ہے ؎

گفت آں شیخ عرب اندر کلام
نیست معبود جہاں یک کس تمام

ہست گر معبودِ عالم یک کسے
نیست غیر از عشق پیش حق رسے

دہر اور اللہ بنیم کے نزدیک دہر بھی خود خدا ہی ہے۔ گیتا کے ایک بیان کے حوالے سے باسدیو کا قول نقل کرتا ہے جس میں کہتا ہے کہ " خدا میرے سایۂ دیوار میں رہتا ہے"۔ ایک مغربی حکیم کا قول بالکل اس کے مشابہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ " خدا انسان کی سب سے بڑی مخلوق ہے"۔ بنیم نے اپنے اس قول کو مسلمان صوفیوں کے اقوال کی مدد سے زیادہ تر زور بنایا ہے۔

آں کہ حق خواندہ او را خاص و عام	آں کہ اللہ ہست نامش در انام
او بود در سایۂ دیوار من	او بود یک غنچۂ گلزار من
قوتش از قوت پشتم بود	ہر دو عالم در دو انگشتم بود
ایں سخن کانست کاں بحر صفا	در کلام خویشتن کرد ایں ندا
"علم حق در علم صوفی گم شود	ایں سخن کے باور مردم شود"
یا بود ایں آں سخن کاں مردِ حق	با مریداں داد آخر ایں سبق
"من دو سالم از خدائے خود کلاں	از یقین ست ایں نہ از روئے گماں"

"من بزرگم از خدائے خود دو سال
فہم ہا باید کہ دریابد مقال"

قدرت بر محال بنیم کے نزدیک خدا بھی محال پر قادر نہیں، کیونکہ اگر وہ محال پر قادر ہو تو وہ اپنے جیسا خدا بھی بنا سکے۔ اگر خدا چاہے کہ انسان کو اپنی حدودِ مملکت سے باہر نکال ڈالے تو نہیں نکال سکتا۔ اس پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا تھا کہ خدا انسان کو نیست سے ہست کر سکتا ہے اور پھر ہست سے نیست۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا محال پر قادر ہے۔

بیتغیم اس کا جواب یوں دیتا ہے کہ جو چیز کبھی "ہست" ہو سکتی ہے اس کو نیست نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے یہ نظریہ باطل ٹھہرتا ہے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی شی بجز خدا ہست نہیں لہٰذا کوئی شی نیست نہیں۔

مظاہر بیتغیم کے نزدیک صفات اور مظاہر، ذات اور اصل خداوندی کے ساتر نہیں بلکہ حقیقت میں صفات ہی ذات کے چہرے سے پردہ اٹھا دیتے ہیں۔ چونکہ صفات دنیا میں اللہ تعالیٰ کا مظہر ہیں اس لیے انھیں کو ذات تک رسائی کا ذریعہ سمجھنا چاہیے۔ در اصل صفات ہی ذات ہیں ؎

رنگ و صورت گرچہ وہم اند ای پسر بر ہدف لیکن دو سہم اند ای پسر
گر بظاہر ساتر ذات آمدند در نگاہت جملہ آیات آمدند
رنگ و صورت ہم نباشد غیر حق غیر حق آمد کجا اندر سبق
غیر حق نبود چو در کون و مکاں
پس چہ می پرسی ز من ای جسم و جاں

بیتغیم نے ذات، صفات، توحید، تنزیہہ، تشبیہہ، وحدت، کثرت، وجود، عدم، مہر و قہر، جمال و جلال، مطلق اور منفید وغیرہ پر بھی کافی بحث کی ہے۔ وہ خداوند تعالیٰ کی ذات کو اصل سمجھتا ہے لیکن انسان اور کائناتِ عالم سب ذاتِ خداوندی کے اجزائے لاینفک ہیں۔ خدا کو جو لوگ منزہ مانتے ہیں وہ بھی غلط ہیں اور جو مشبہ مانتے ہیں وہ بھی غیر صحیح۔ اصل بات یہ ہے کہ ذاتِ بے صفت منزہ ہے اور صفات مشبہ ہیں۔ اسی طرح وحدت تو ذاتِ خداوندی ہے لیکن اس کی صفات "کثرت" ہیں اور یہ کثرت حقیقت میں وحدت کا مظہر ہے۔ بیتغیم نے مہر و قہر، جمال و جلال کو اللہ تعالیٰ کی دو صفات قرار دیا ہے۔ یہ یا نوان لوگوں کا عقیدہ ہے جو خدا کو قادر مطلق مانتے ہیں یا زردشتیوں کی

طرح یزداں واہرمن کے قایل ہیں۔ ایک ویدانتی کے نزدیک قہر اور جلال کوئی شے ہی نہیں۔ مایا کی کار فرمائیاں گناہ کا خیال، نمود اور سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ بظاہر بیتغیم نے یہ خیال اسلامی تصوف سے اخذ کیا ہے۔

ذاتِ واجب ذات واجب کو ایک سمندر سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں ہزاروں موجیں اچھل اچھل کر بلند ہوتی ہیں لیکن پھر سمندر میں مل جاتی ہیں۔ کائنات ارض اور لاکھوں کروڑوں آسمان اس کی وسعتِ ذات کے اندر مدغم ہو سکتے ہیں ؎

ذاتِ حق آمد چو تخم اندر بیاں — چوں شجر عالم بود در وی نہاں
در تعین ہاست چوں کثرت نما — زیں سبب گفتند اورا ماسوا
چوں محیط جملہ آمد ذاتِ حق — آسماں خوانند اورا در نظر

بیتغیم نے ایک اور نکتہ بھی پیدا کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم خداوند تعالیٰ کو 'نیست' بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ جو اس مادی جسم و صورت سے فارغ ہے جس کے اندر ما و شما کی فطرت نہیں اس کو نیست بھی کہہ دیا جائے تو کچھ ہرج نہیں ؎

آں کہ پاک از فطرتِ ما و شماست
نیست گر گویند او را ہم رواست

وحدتِ وجود وحدتِ وجود کا مسئلہ صوفیہ کا سب سے بڑا اصل الاصول ہے۔ صوفیہ کے خیال میں توحید کے یہ معنی ہیں کہ خدا کے سوا دنیا میں کوئی شے موجود ہی نہیں یا جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی خدا ہے۔ دنیا میں تعدد اور کثرت جو محسوس ہوتی ہے وہ محض اعتباری ہے اور زیادہ قابل توجہ نہیں۔ شیخ ابوسعید ابوالخیر کہتے ہیں ؎

.... کہ توحید خدا واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

مولانا رومؔ بھی فرماتے ہیں ؎

گر ہزاراں اند یک کس پیش نیست
جز خیالات عدد اندیش نیست

بنیمؔ بھی ایک صوفی ہونے کے لحاظ سے وحدت الوجود کا زبردست مبلّغ ہے ؎

گر ہمہ ارواح یا اجسام ہست جلوۂ آں یارِ سیم اندام ہست
گر ہمہ تحقیق یا تقلید ہست مظہرِ یک جلوۂ توحید ہست
گر ہمہ مشہود یا موہوم ہست ور ہمہ موجود یا معدوم ہست
گر ہمہ انواع یا اشخاص ہست ور ہمہ عام ست یا خود خاص ہست
چہ بساط و چہ جواہر چہ عرض چہ ہمہ بے مطلبی و چہ غرض
چہ قویٰ و چہ طبایع چہ حواس چہ امید و وہم و چہ خوف و ہراس
چہ کواکب چہ جماد و چہ نبات چہ ہمہ افعال و آثار و صفات
فی الحقیقت نیست غیر از یک وجود ایں چنیں گویند اربابِ شہود

اِنسان

وحدتِ نسلِ انسانی بنیمؔ کے نزدیک تمام نسلِ انسانی بلکہ تمام ذوی الارواح ایک ہیں۔ یہ ان کا ظاہری اور اعتباری فرق ان کے ذاتی علوئیں کوئی فرق نہیں پیدا کر سکتا۔ کفر و ایمان بھی ایک نور کے دو شعلے ہیں۔ اصل میں ذات سب کی ایک ہی ہے ؎

کافر و مومن فرنگی و یہود ارمنی و گبر و ترسا و جہود

ہیچ کس از جود حق محروم نیست | سرایں معنی بکس مفہوم نیست
ہر ہمہ را داد ایزد دست و پا | ہر ہمہ را داد حق برگ و نوا

تنغیم نے وحدت نسل انسانی پر بہت زور دیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ شنکر آچارج کا ایک قصّہ بیان کرتا ہے۔ کہتے ہیں ایک دفعہ شنکر آچاریہ دریا پر نہانے کے لیے تشریف لے گئے ان کے ساتھ ساتھ ایک خاک روب بھی چلا گیا۔ جب شنکر آچاریہ جی نے اپنا اسباب دریا کے کنارے پر رکھا تو خاک روب نے بھی اپنے کپڑے وغیرہ ان کے کپڑوں میں ملا دئے۔ اس پر شنکر آچاریہ جی کو بہت غصّہ آیا۔ انھوں نے اپنے کپڑوں کو دریا میں غوطہ دیا۔ خاک روب نے بھی جواباً اپنے کپڑوں کو دریا میں غوطہ دیا۔ شنکر آچاریہ جی اس بات پر بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے کہ تیرا یہ عمل نہایت بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ تجھے یہ معلوم نہیں کہ میں شنکر آچاریہ ہوں اور یہ تیری انتہائی خوش قسمتی تھی کہ تیرے کپڑے مجھ سے چھو گئے ورنہ تو کہاں اور ہم کہاں۔ خاک روب نے کہا کہ جب تیرے کپڑے میرے کپڑوں کے ساتھ مل جانے سے نجس ہو سکتے ہیں تو میرے کپڑے بھی ناپاک ہو سکتے ہیں ے

گفت آں کناس ای مرد سفیہہ | یک زماں ننشستہ پیش فقیہہ
چشم تو بر پیشہ و کسب اوفتاد | دانش و ہوشت تمامی شد بباد
تو بکسب و صورتم کردی نظر | از رہ معنی فتادی بے خبر
تو کہ غیر از حق نداری بر زباں | از کجا کناس گفتی ایں زماں

کافر و مومن فرنگی و یہود | ارمنی و گبر و ترسا و جہود
جلوہ ہائے ذات من ہست ای جواں | غیر ذاتم کیست در کون و مکاں
گر بہ بیند چشم صوفی سوئے غیر | باز ماند مرکبہا صوفی ز سیر

پاکیٔ تن نیست مقبولِ خدا　　پاکیٔ دل ہست پیشِ حق روا

جب شنکر آچاریہ نے خاک روب سے یہ باتیں سُنیں تو از خود رفتہ ہو گئے اور کہنے لگے ؎

خویشتن را ایں زماں بشناختم　　سر با وجِ معرفت افراختم
پیش ازیں چشمِ خرد بد موج بیں　　بحر بیں شد ایں زماں چشم ازیقیں

حقیقت الحقائق بنیم کے نزدیک انسان مقصدِ کائنات ہی، مرکزِ حیات ہی۔ جامع صفاتِ خداوندی ہی، مظہرِ ذات ہی، انسان کی حقیقت سے انکار کرنے والا خدا کا منکر ہی حقیقت الحقایق سے انکاری ہی۔ انسان اگر نہ پیدا ہوتا تو شاید دنیا ہی بروئے کار نہ آتی ؎

گلشنِ عالم تجلّی گاہ تست　　خیمۂ افلاک دود و آہ تست
ایں زمان و آسمان و مہر و ماہ　　گردشِ دوران صبح و شامگاہ
جلوہ ہائے ذاتِ تست ای نوجواں　　نیست غیر از ذاتِ پاکت در جہاں
شبلی و منصور در عالم توئی　　ظلمت و ہم نور در عالم توئی
ہم توئی ابلیسِ مردودِ جہاں　　ہم توئی مقبول و مسعودِ زماں
وحش و طیر اندر جہاں جملہ توئی　　خوب و زشت اندر زماں جملہ توئی
ہم نہالی، ہم تبر زن، ہم تبر　　ہم گلی، ہم برگ و ہم شاخ و ثمر
ہم توئی پرویز و ہم شیریں توئی　　ہم توئی تمکین و ہم تلویں توئی
ہم توئی لیلیٰ و ہم مجنوں توئی　　ہم توئی مسرور و ہم محزوں توئی

مراتبِ ستّہ کا جامع صوفیہ کائنات کو چھ حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں جن کو مراتبِ ستّہ کہتے ہیں جن کی تفصیل یہ ہی:۔

(۱) وحدتِ حقیقی کا مرتبہ جہاں وحدتِ ذات کے بغیر کوئی چیز موجود

نہیں۔ وہ ذات بے صفت کی جلوہ گاہ ہے۔ لم یکن معہٗ شیئ،

(۲) عالم معنی۔ جہاں اعیان ثابتہ کا اندراج ہوتا ہے لیکن اس کی حقیقتِ اصل بھی مخفی ہے۔

(۳) عالم ارواح (۴) عالم مثال

(۵) عالم اجسام

(۶) مرتبہ انسانی۔ یہ رتبہ پانچوں مراتب کا جامع ہے ؎

جامع جملہ مراتب ذات اوست ہر دو عالم در پئے اثبات اوست
چیست انساں مظہر ذات و صفات چیست انساں چشمۂ آب حیات
ہیچ وصفے نیست از اوصافِ خدا کاں نشد در ذات انساں برملا
ہم سمیع و ہم علیم و ہم بصیر ہم مرید و ہم کلیم و ہم قدیر
وصف ہفتم ہست حیٌّ لایموت کو بود شایستۂ حمد و نعوت

درمیان موج و دریا آب تست درمیان ماہ و انجم تاب تست
در بم و زیری چو آہنگ صداست در سپیدی و سیاہی یک ضیاست
عین اشیای و لے ز اشیا جدا جز تو دیگر کیست در ارض و سما
پہن تر از چرخ پہنا ور توئی گر کنی باور ز من داور توئی
تو ہماں ذاتی کہ آمد در بیاں خویش را بشناس و خود را کم مداں
آں توئی کاں بے بدن داری وجود از تو آمد عالمے اندر نمود

خودی کا استیصال انسان کا یہ کمال ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا ڈالے، اپنے آپ سے غافل ہو جائے تب وہ اس بات کی تہ تک پہنچ سکتا ہے، تب وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ ہم جن مصیبتوں

اور تکلیفوں میں مبتلا ہیں ان کی وجہ یہی ہو کہ ہمارے دماغ میں احساس وجود موجود ہی۔ اگر ہم اس "وجود" کی علت سے رہائی پا جائیں تو ابدی خوشی، دائمی مسرت کو حاصل کر سکتے ہیں۔ خود فراموشی اور بے خبری ہمیں خدا کا محبوب بنا سکتی ہی۔ شیخ ابوسعید کا قول ہو ع

با مارسیہ نشیں و با خود منشیں

بنگیم نے بے شمار مقامات پر اس چیز پر زور دیا ہو اس کا عقیدہ ہو کہ خوف و ہراس، غم اور مصیبت سب اسی "وجود" کے طفیل ہی۔ اگر اس وجود کا خاتمہ ہو جائے تو یہ تمام شکایات رفع ہو سکتی ہیں ؎

گر کمال خویش خواہی ای جواں　　دور افگن خویشتن را از میاں
تا تو خود را بر نداری از میاں　　کی شوی آگہ ز اسرار نہاں

رُوح

رُوح کے متعلق فلسفیوں میں اختلاف ہی۔ موجودہ فلسفے میں رُوح 'ادراک' کا نام ہی۔ رُوح کو وہ کوئی ایسی مستقل چیز نہیں سمجھتے جس کا تعلق خاص ہر شخص کے ساتھ ہی۔ ہر شخص کی خاص رُوح نہیں ہوتی بلکہ ان کے نزدیک تمام دنیا کی ایک روح ہی جو آفتاب کے نور کی طرح یا آسمان کی طرح تمام انسانوں پر حاوی ہی۔ وہ انسانوں کے اندر زندگی بھر رہتی ہی۔ جب انسان مرجاتا ہی تو رُوح کو کوئی نقصان یا گزند نہیں پہنچتا بلکہ رُوح ویسی کی ویسی ہی موجود رہتی ہی۔ حکمائے اسلام میں سے رُومی کا یہ خیال ہی کہ رُوح جسم سے علیحدہ ایک جوہر نورانی ہی۔ جسم کے فنا ہونے سے اس پر اتنا ہی اثر پڑ سکتا ہی جتنا ایک کاری گر پر ایک خاص آلے کے چلے جانے سے۔ بنگیم نے بھی مثنوی میں اسی قسم کے

خیال کا اظہار کیا ہی اور اس عقیدے کو نانک جی کی طرف منسوب کیا ہی کہ خرابیٔ بدن کے بعد روح انسانی کو کوئی گزند نہیں پہنچتا بلکہ وہ بالکل متاثر ہی نہیں ہوتی۔ روحِ انسانی یا روح اضافی ساری دنیا کی ایک ہی روح ہی اور وہ فنا نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق کسی مکان سے نہیں اور نہ کسی زمان سے ہی۔ وہ ہمیشہ ایک ہی طرح قایم رہتی ہی ؂

گفت نانک در کلامِ خویشتن چوں کند پرواز جان از قیدِ تن
بے توقف مے شود چوں آسماں سرِ مخفی بود من کردم عیاں

ایک شخص نے کسی عارف سے پوچھا کہ خرابیٔ بدن کے بعد روح کہاں جاتی ہی۔ عارف نے جواب دیا ؂

گفت عارف با کلامے در جواب روحِ انسانی ست ہمچوں آفتاب
روح از جائے نیامد در جہاں تا کند چوں کارواں نقل از مکاں
روحِ انساں گر ز جائے آمدے منزلش در فہم و رائے آمدے
چوں معاد و مبدأش ذاتِ خداست بازگشت او چہ دانم در کجاست
روحِ انسانی ست یک روحِ جہاں روحِ انسانی ست ہم چوں آسماں
گر ہزاراں خانہ ہم گردد خراب ہمچناں برپاست نورِ آفتاب

دہر

فلسفے میں 'دہر' کو ایک خاص حیثیت حاصل ہی۔ منجیم نے بھی دہر کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ اس کے نزدیک دہر اور ذاتِ باری میں کوئی فرق نہیں جس طرح ذاتِ باری میں وحدت و کثرت کا سلسلہ موجود ہی۔ دہر کائنات کے اندر جاری و ساری ہی۔ سارے عالم پر حاوی ہی۔

دنیا میں اختلاف شئون دہر ہی کی وجہ سے ہی۔ ہر شئی دہر کی تابع ہی۔ دہر اللہ کی طرح ذاتِ باری کا جامع ترین نام ہی ؎

دہر اسم اعظم اللہ ہست — جلوۂ انوار مہر و ماہ ہست
عارفان و عاقلان و عالماں — ساجد دہر اند جملہ بے گماں
جامع اسماست چوں اسم الٰہ — پس چہ مے پرسی زمن ای داد خواہ
جامع اسماست، اسم اللہ و دہر — رو بوحدت آر بے روسوئے قہر
نغمہ ام در گوش کن ای مرد راہ — لاتسب الدھر برخواں رمز شاہ
خود انا الدھر ست بگفتا در کلام — پس چہ مے پرسی زمن ای ناتمام
من چو غیر از حق ندیدم در جہاں — پس چہ خوانم دہر را ای نور جاں

تجدد امثال

یہ سائنس کا ایک مشہور مسئلہ ہی کہ جسم کے اجزا جلد جلد فنا ہوتے جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے نئے اجزا آتے جاتے ہیں یہاں تک کہ ایک مدت کے بعد انسان کے جسم میں سابق کا ایک ذرہ بھی باقی نہیں رہتا بلکہ بالکل ایک نیا جسم پیدا ہو جاتا ہی لیکن چونکہ فوراً پرانے اجزا کی جگہ نئے اجزا آجاتے ہیں اس لیے کسی وقت پہلے جسم کا فنا ہونا محسوس نہیں ہوسکتا۔ رومی کا قول ہی ؎

پس ترا ہر لحظہ مرگ و رجعتے ست — مصطفٰےؐ فرمود دنیا ساعتے ست
ہر نفس نو مے شود دنیا و ما — بے خبر از نو شدن اندر بقا
عمر ہم چوں جوئے نو نو مے رسد — مستمرے مے نماید در جسد

بنیم بھی اس طرح کا خیال ظاہر کرتا ہی ؎

بر تجدد ہم بکن یک دم نظر — تا شود مکشوف رازت سر بسر

ہست در تجدید امثال آشکار — ایں وجود و ایں عدم را کاروبار
یک نظر بر نطفۂ خود ہم بکن — تا کنی معلوم سرِّ ذوالمنن
اندک اندک بر ترقی ہائے او — چشم بکشا ای عزیزِ نیک خو
نطفہ ات بنگر چساں انساں شود — خالقِ طبقاتِ جسم و جاں شود
رفت خوردیش کلانی شد پدید — رفتنِ خوردیش لیکن کس ندید
آمد و رفت ست ایں جا ایں جہاں — گر ندنت نبود خبر ای نورِ جاں
کہنگی شد مستعد آں نوی — آں نوی را چیست حالِ مولوی
کہنگی رفت و نوی آورد رو — آں نوی در کہنگی شد مو بمو
آدم و حیوان نبات ای نوجواں — جامہا پوشند تازہ ہر زماں
ہر سہ را خلعت دہد حق نو بنو — مزرع ام پختہ شد باید درو
ایں تجدد در ہمہ افراد بیں — تا نشینی در صفِ اہلِ یقیں

ان مسایل کے علاوہ اور بھی بہت سی کام کی باتیں ہیں جن کو ہم بخوفِ طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔ ہم نے اپنی طرف سے تنقیم کے حالات پر کوئی رائے زنی نہیں کی اور حتی الوسع اس ہندو فلسفی کے خیالات کو من و عن پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ ناظرین کے لیے اس مثنوی کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اور ایک ہندو فارسی داں کے فلسفیانہ خیالات معلوم کرنے والوں کے لیے کافی فائدہ بخش۔

اقتباس از بدائع وقائع

مصنّفہ انندرام مخلص

لالہ انندرام مخلص کا حال اورنٹیل کالج میگزین بابت فروری ۱۹۲۹ء صفحہ ۴۶ پر سید محمد عبداللہ نے لکھا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں پرشین لٹریچر حصّۂ دوم جز ۳ صفحہ ۶۱۲ پر پروفیسر سٹوری نے بھی اس کا حال دیا ہے، وہاں دیکھنا چاہیے۔ اس وقت اس مصنّف کی تصنیف بدائع وقائع سے ایک اقتباس درج کرنا مقصود ہے جو تاریخِ پنجاب سے تعلق رکھتا ہے۔

بدائع[1] وقائع کے بعض اجزا کا انگریزی ترجمہ شایع ہو چکا ہے (دیکھو حواشی صفحاتِ آیندہ) مگر کامل کتاب کسی مُصنّف کے پیشِ نظر نہ تھی اس لیے کتاب کا پورا حال اب تک سامنے نہیں آیا۔ چند سال ہوئے لاہور کے کشمیری پنڈتوں کے ایک علمی گھرانے سے اس کتاب کا کامل نسخہ میں نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے لیے خریدا۔ اس نسخے سے کتاب کی مفصل کیفیت یہاں درج کی جاتی ہے۔

بدائع وقائع کے بعض اجزا باڈلین، رامپور اور علی گڑھ میں ہیں۔ علی گڑھ والا نسخہ راقم سطور نے دیکھا ہے۔ اس کا نمبر ف۔ اخ ۱۱۲ ہے، ورق ۱۷، سطور ۱۵ (افسوس ہے کہ صفحات کی پیمایش میرے پاس محفوظ نہیں ہے) اس نسخے میں بدائع وقائع

---

[1] ایلیٹ اور سٹوری نے کتاب کا نام "تذکرۂ انندرام مخلص" لکھا ہے مگر خود مصنّف نے کتاب کا نام بدائع وقائع رکھا تھا۔ ایلیٹ نے جو نسخہ استعمال کیا وہ نواب ضیاء الدین خاں رئیس لوہارو کی ملکیت تھا (از پرنسپل محمد شفیع صاحب مدظلہ نقل از اورینٹل کالج میگزین باجازتِ خاص)

کی صرف تین فصلیں[1] ہیں یعنی

(۱) واقعہ الیست نادر الخ (پنجاب یونیورسٹی کے نسخے کے ص ۱۴۴ب تا ۱۶۹ب کا مواد) سٹوری کے ہاں اسی فصل پر تذکرہ کو منحصر سمجھا گیا ہے۔

(۲) نسخہ سوانح احوال (= نسخہ پنجاب یونیورسٹی ۲۲۹ ب تا ۲۴۳ الف)

(۳) احوال سیزدہ روزہ سفر گڑھ مکتیسر (= نسخہ پنجاب یونیورسٹی ۱۸۰ الف تا ۱۹۲ ب)

علی گڑھ کے نسخے کے آخر میں لکھا ہے:-

" دبست (کذا) چہارم ذی قعدہ سنہ صدر سنہ ۱۱۶۰ھ دوگھڑی روز بلند شدہ بہ حویلی قدیم شاہ جہاں آباد بہ خط فقیر انندرام صورت تحریر پذیرفت۔"

اس عبارت سے بعض لوگوں کو گمان ہوا ہے کہ یہ نسخہ بخط مصنف ہے لیکن اس نسخے میں بعض فاحش غلطیاں موجود ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے یہ باور نہیں آسکتا کہ مخلص جیسا ذی علم مصنف ان غلطیوں کا ارتکاب کرے۔ پروفیسر محمود خاں شیرانی کے کتاب خانے میں ایک نسخہ رباعیاتِ مخلص کا ہے جو بخطِ مصنف ہے۔ اس کا خط علی گڑھ کے نسخے سے مختلف ہے اور اتنا پختہ ہے کہ اس پر گمان خطِ مصنف ہونے کا بے شک ہوسکتا ہے۔ اس نسخے کے آخری صفحے کا عکس اس رسالے میں حوالے کے لیے شایع کیا جا رہا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے نسخے میں (ورق ۱۹۲ب پر) اوپر کی عبارت کی بجائے لکھا ہے "نقل از نسخہ لالہ انند رام مخلص" مگر اسی نسخے کے ورق ۲۲۷ ب پر لکھا ہے "این اجزاے چند ...... در ایام آمد آمد زمستان بخط فقیر انند رام مخلص باتمام رسید" پس ظاہر ہے کہ کاتب نے بعض عبارتیں اصل نسخے سے

---

[1] ان فصلوں کی ترتیب پنجاب یونیورسٹی کے نسخے کے مطابق نہیں ہے۔

بعینہا نقل کر دی ہیں اور بعض جگہ یہ لکھ دیا ہے کہ مُصنّف کے نسخے سے نقل کیا ہے۔ اسی طرح علی گڑھ والے نسخے میں "بہ خط فقیر انند رام"، غالباً مُصنّف کی اپنی تحریر نہیں بلکہ کسی کاتب کی ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کے نسخے کا حال پنجاب یونیورسٹی کے نسخے میں ۲۸۶ ورق ہیں۔ تقطیع ۱۱ انچ × ۷ انچ ہے۔ فی صفحہ ۱۵ سطور ہیں۔ کتاب کی پہلی فصل رجب ۱۱۴۵ھ کے واقعات سے شروع ہوتی ہے اور خاتمے کی تاریخ ۱۱ جمادی الثانی ۱۱۶۱ھ ہے (مصنّف ۱۱۶۴ھ میں فوت ہوا) کتاب میں جابجا واقعات کی تاریخیں دی گئی ہیں۔ ایک جگہ (ص ۱۱۶ پر) ساعت تحریر ۱۴ ربیع الثانی ۱۱۵۲ھ اور دوسری جگہ (ص ۲۳۴ ل) پر ۲۹ جلوسی (۱۱۵۹ھ) دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی مختلف فصلیں مختلف سنوں میں لکھی گئیں یعنی جب واقعات مندرجۂ کتاب وقوع پذیر ہو رہے تھے یا عنقریب ہو چکے تھے۔

فہرست محتویات بدائع وقائع مُصنّف نے مختصر سے دیباچے میں حمد کے بعد لکھا ہے کہ میں ایامِ بہار میں ایک دن گوشۂ تنہائی میں بیٹھا تھا کہ مجھ کو خیال آیا کہ اساتذۂ سلف جنھوں نے علمِ تاریخ کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے دوسرے لوگوں کے سوانح تو لکھے مگر اپنے احوال کو قلم بند نہ کیا "اگر فقیر بعض حالات خود را بقلم آرم خالی از لطفی نخواہد بود بلکہ بتفریح خاطر عاطر ارباب وجد وحال کہ سرخوشان نشاء کمال اند خواہد افزود" اس لیے یہ چند اوراق لکھ کر ان کا نام بدائع وقائع رکھا۔

مضامین کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

ورق ۲ ا: خوش نوائی عندلیب قلم از رنگیں بیانی برگ گل در منقار،

درچمنستانِ نگارش بعضی سوانح برسبیل یادگار (محمد شاہ کے زمانے میں، اور نواب اعتماد الدولہ چین بہادر نصرت جنگ کے ہم رکاب رجب ۱۱۴۵ھ کے پہلے عشرے میں مصنّف کا سیر و شکار کو جانا) اسی ذیل میں تعریفِ سرشف (ورق ۳ ا) اور تلاطم بحرِ معانی چوں امواج دادگستری عنانی دادہ بتقریبِ تسویدِ کیفیتِ سیرِ عالم آبی کہ راقم حروف را اتفاق افتادہ (ورق ۶ ا) کے عنوان بھی ہیں۔

ورق ۸ ب، توجہِ ہمایوں رقمِ خامۂ مشکبار تحریر بر شرح جشنِ طوی نورچشم کامگار (لالہ فتح سنگھ کی شادی کا حال جو بہت دھوم دھام سے ۱۱۴۵ھ میں رچائی گئی، اس تقریب کے ضمن میں مصنّف نے 'وقائع حضورِ معلیٰ' اور سوانح دربار بھی بیان کیے ہیں (۱۸ ا تا ۲۱ ب اور ۲۳ ب تا ۲۶ ا) پہلے عنوان میں مرہٹوں کے خلاف مہم کا ذکر بھی ہے۔

ورق ۳۱ ا۔ سوانح فوج نصرت موج نواب صاحب وزیر الممالک مدار المہام سپہ سالار و احوال گوشمالی بواقعی بھگونت لعین مقہور با دنی سعی بہادران لشکر ظفر اثر [اس کے متعلق دیکھو انشائے اننددام طبع دہلی ۱۲۶۵ھ ص ۳۰]

ورق ۳۵ ب۔ متوجہ گردیدن نواب صاحب وزیر الممالک بہادر مدار المہام بر ادکین پور باراده تحصیل سعادت ملازمت حضرت خلیفۂ دنیا و دولت بحضور پرنور۔

ورق ۳۸ ب ..... حکایت شور پرعالی ..... (۱۱۴۶ھ سنہ جلوس کا ایک سانحۂ عشق و محبت جو شاہ جہاں آباد میں واقع ہوا)

ورق ۴۲ ب ..... بعض اخبار دربار دہلی۔

ورق ۴۸ ا۔ چند فقرہ متضمن فصاد حضرت ظلِّ الٰہی۔

ورق ۴۹ ا۔ رخصت شدن نواب صاحب وزیرالممالک اعتماد الدولہ چین بہادر نصرت جنگ و نواب امیرالامرا بہادر منصور جنگ در سنہ ہفدہم از جلوس والا برائے غنیم لئیم دکھنی کہ عبارتست از مرہٹہ ......

ورق ۵۱ ب ..... تحریر سوانح تشریف فرما گردیدن حضرت گیہاں خدیو بدولت سرائے نواب صاحب عمدۃ الملک بہادر و امیرالامرا بہادر منصور جنگ (اس کی ضمنی سرخی ہے: تعریف خیمہ دیوان خاص کہ برائے جلوس اقدس آراستگی پذیرفتہ [۵۳ ا]

ورق ۵۵ ب ... ترقیم احوال سیر دارالعشق بندرابن۔

ورق ۶۳ ب ..... احوال تولّد جگر گوشہ ام مصاحب سنگھ (در ۱۱۴۹ھ سنہ ۱۹ جلوس) (یہ مصنف کا پوتا ہے)

ورق ۶۸ ا۔ تعریف بزم ہولی۔

ورق ۴۷ ب۔ تحریر ماجرائے سیرے کہ راقم حروف مخلص را اتفاق افتاد (سنہ ۱۱۵۱ھ سنہ ۲۱ جلوسی) (مصنف سراج الدین علی خاں آرزو، لالہ سیوک رام، میرزا محمد قلی، محمد جان دیوانہ اور اپنے لڑکوں کے ہمراہ درگاہ خواجہ قطب الحق والدین کی زیارت کو جاتا ہے۔ باغِ مخلص کا بھی ذکر کرتا ہے) اس عنوان کے ضمن میں (۶۷ ب پر) ایک اور عنوان ہے یعنی: احوال بیماری کہ راقم حروف در ایام گزشتہ کشیدہ در ضمن ایں ماجرا بر سبیل نقل بتحریر رسیدہ۔

ورق ۸۰ ا انہ پیشگاہ خلافت دستوری یافتن نواب صاحب وزیرالممالک تا ۱۰۳ ا بہادر نصرت جنگ بنا بر تنبیہ سرخیل اشقیائے دکھنی باجی راؤ در

سنہ نوزدہم جلوس والا و بحسن تدبیر و جوہر شمشیر ایں برگزیدۂ دولت بسزا رسیدن آں فتنہ..... وچوں دریں سیاق راقم سطور برکاب عالی بود نگارش بعض احوال خود بدستیاری قلم بدایع رقم انشا نمود۔

ضمنی سرخیاں | عطف عنان نواب صاحب وزیر الممالک بہادر سپہ سالار بارادۂ تنبیہ غنیم لئیم از کنار دریا بسمت ہوڈل بطریق ایلغار (۸۵ب)

انتشار اشقیاے دکھنی در سواد دار الخلافت شاہ جہاں آباد..... ویک پارۂ گوشمالی یافتن بحسن سعی بندہاے بادشاہی و دیگر حالات (۹۰ب)

آب ورنگ یافتن شمشیر بہادران فوج نواب صاحب نصرت جنگ بہادر سپہ سالار از خون اعداے دولت یعنی غنیم وخیم العاقبت وبحال تباہ رخ برتافتنش از عرصۂ کارزار و بآبیاری ابر شمشیر ایں برگزیدۂ دولت گل فتح شگفتن در چمن کدۂ روزگار (۹۲ب)

تعریف نواب صاحب وزیر الممالک بہادر (۹۶ا)

..... تحریر سوانح لشکر نواب صاحب بہادر..... (۹۸ا)

۱۰۳ ا۔ ضیافت کردن میرزا محمد قلی صاحب براقم السطور (سنہ ۱۱۵۱ھ)

۱۰۷ب۔ تدبیر ترتیب انجمن رنگیں تراز چمن (شرف الدین علی پیام، سراج الدین علی خاں آرزو، محمد جان دیوانہ وغیرہ کے ساتھ ہم مجلسی)

۱۱۰ب۔ شوخیہاے طبیعت بر سر ہنگامہ آرائی..... (ایک ناچ کی مجلس کا حال)

۱۱۴ب۔ واقعہ الیست نادر و سانحہ الیست غریب کہ در سال ۱۱۵۱ ہجری از بوقلمونیہاے قضا در ہندستان بوقوع رسیدہ وبرسبیل یادگار دریں اوراق پریشاں رقم زدۂ قلم بدایع نگار گردیدہ، اس فصل کی ضمنی سرخیاں:

نزول[۱] صاحب وبہیم وافسرِ مملکت ایران بہندوستان ..... (۱۱۷ ب)

ورود موکب شاہی درنواح لاہور.... (۱۲۰ ب)

نقل نامۂ عبدالباقی خاں وزیر والیِ ایران (۱۲۱ ا) تتمۂ احوال پنجاب (۱۲۲ ب)

حسب التماس عمدہ ہای بادشاہی از مرکز خلافت تحرکت آمدن[۲] اولیۂ ظفر طراز محمد شاہی (۱۲۴ ا)

باہمدگر زد و خورد افواج بادشاہی و قشون شاہی در قصبۂ کرنال و برگردیدن ورق کاربرنگی دیگر (۱۲۵ ا)

دفعہ دوم تشریف بردن محمد شاہ بادشاہ غازی بہ اردوے شاہ جم جاہ و باتفاق داخل جہان آباد گردیدن و اقسام امورِ غریبہ بروے کار آمدن بارادات اللہ (۱۳۱ ا)

احوال میر شرف الدین علی پیام (۱۳۴ ا) رجوع قلم بدایع انشا باصل ماجرا (۱۳۴ ب)

سرگزشت راقم سطور (۱۳۷ ا)

دفعہ سوم تشریف بردن محمد شاہ بادشاہ غازی تبنقریب ضیافت در [بمقام بودن ؟] شاہ عالی جناب وشاد وخورم مراجعت فرمودن بدولت خانہ وکوچ از شاہ جہان آباد سمت پنجاب (۱۴۸ ا)

۱۔ اس عنوان کے نیچے ایک جگہ مصنف نے لکھا ہے "تا ساعت تحریر کہ چہاردہم ربیع الثانی یکہزار و یکصد و پنجاہ و دو ہجری است (ورق ۱۱۶ ب)، الیٹ کی تاریخ ہند (HISTORY OF INDIA BY ITS OWN HISTORIANS) ج ۸ ص ۷۶ تا ۹۸ پر اس بیان کا ترجمہ دیا ہے (بحذف بعض عبارات و فصول) نیز دیکھیو ص ۸۹ س ۱۴ ۔ ۲ اصل: برآمدن

سعیِ کلکِ بدایع نگار بتحریر وقایع دربار (۱۴۶ ب)
نقلِ عہدنامہ ایست کہ حسب الاستدعاے امنائے شاہی
کارپردازانِ سلطنت محمد شاہی بتحریرش پرداختہ وچوں آرائش
یافت حوالت کارگزاران صاحب مملکتِ ایران ساختند (۱۴۶
ب) نقل رقم شاہ جم شاہ (۱۵۱ ب) نقل رقم شاہ ذی جاہ (۱۵۲ ا)
گزشتن الویۂ ظفر طراز شاہی از آب اٹک بر سبیل استعجال و انتظام
یافتن مہامِ قلمروِ سندھ بحسن تدبیر شاہ ذی اقبال (۱۵۲ ب) نقل
رقم اشرف شاہی (۱۵۴ ب) نقل فرمان فلک شان محمد شاہی (ایضاً)
نزول رایت ظفر آیت شاہی بالکۂ زمینداری خدایار خاں آن
مصدر حرکت لغو و آخر رسیدنش بملازمت ہمایوں و شستہ گردیدن
نامۂ جرمش بزلال عفو (۱۵۵ ا)

مرتبۂ ثانی رسیدن نواب اعزّ الدولہ بہادر ہزبر جنگ در اردوے
ظفر قرین و بعد تحصیل سعادت ملازمت مشمول مراحم گردیدن از جانب
فرماں رواے ایراں زمین (۱۵۶ ا) تتمۂ احوال خدا یار خاں عباسی (۱۵۷ ا)
حرکت الویۂ جہاں پیماے شاہی از الکۂ زمینداری خدایار خاں
جانب قندھار بارادۂ خراسان و دستوری یافتن نواب اعزّ الدولہ
بہادر بجانب ملتان (۱۵۷ ب)
مامور گردیدن محمد صالح بیگ بیات[1] پان صد یاشی وکریم بیگ
افشار پان صد باشی از جناب شاہی بتفحص و پیدا کردن گم شدگان
لشکر ظفر اثر و بعد ازاں از قوت بفعل رسیدن مقاصد دیگر (۱۵۸ ا)

---

[1] ادبیات کی تاریخ میں اس فصل کی دو سطور کے بعد ترجمہ ختم ہو جاتا ہے۔ اصل نسخہ

نقل رقم ہمایون (۱۵۰ ب)

از پیشگاہ فضل وکرم خلافت وجہاں بانی مرحمت شدن اضافہ ہزاری ذات وخطاب سیف الدولہ بہادر دلیر جنگ بہ نواب اعز الدولہ بہادر از روے تفضل ومہربانی (۱۶۰ ب) نقل فرمان مکرمت عنوان فلک شان محمد شاہی متضمن عطاے اضافہ ہزاری ذات بنام اعز الدولہ بہادر آں منظور نظر خلیفۂ الٰہی (۱۶۱ ب)

ارسال گردیدن زری بر سبیل نقد مصحوب پان صد باشیان بجناب شاہی (و) از حضور مامور گردیدن میر نجم الدین بہادر جہت رسانیدن خزانہ نا بہ لاہور (۱۶۲ ب)

نقل بریغ قضا تبلیغ محمد شاہی کہ در مقدمۂ پان صد باشیان بنام سیف الدولہ بہادر دلیر جنگ صدور یافتہ (۱۶۳ ا)

نقل عرض داشت نواب سیف الدولہ بہادر دلیر جنگ، آں منظور نظر خلیفۂ الٰہی، بجناب اقدس اعلی محمد شاہی (۱۶۳ ب)

بتحریک یاد آوریہاے آں رونق افزای چمنستان شفقت پردازی فرستادن شاہ جم جاہ ڈالی میوہ براے محمد شاہ بادشاہ غازی (۱۶۴ ب)

نقل منشور کرامت گنجور محمد شاہی بنام سیف الدولہ بہادر دلیر جنگ متضمن عطای الوش (۱۶۵ ب) تتمۂ احوال پان صد باشیان (ایضاً)

رسیدن میر نجم الدین خان بہادر بہ لاہور و بعد چندے بخدمت نواب صاحب سیف الدولہ بہادر معاودت کردن بحضور (۱۶۶ ا)

بقدرت کاملۂ آفرینندۂ راحت ورنج تسلط افواج شاہی بر بخارا و اور گنج (۱۶۸ ب)

[یہاں سے چند اوراق غایب ہیں، اس نسخے کی آخری سطر علی گڑھ کے نسخے میں ورق ۷۰ ۴ الف کی سطر آخر ہی۔ وہاں یہ بیان ورق ۹۴ الف پر ختم ہوتا ہی۔ اُس نسخے میں اس بیان کے بعد عنوان ذیل ہی:۔

"النسخہ سوانح احوال" (ص ۹۴ ب تا ۶۰ الف) یہ بیان ہمارے نسخے میں آگے آئے گا۔ دیکھو ۲۲۹ ب تا ۲۴۳ الف)

۱۷۰ الف [سیر چھپڑی] اس عنوان سے مصنف نے جو فصل لکھی ہی اس کے ابتدائی اوراق اس نسخے میں موجود نہیں۔

۱۸۰ الف۔ احوالِ[1] سیزدہ روز سفر مکتیسر (اس فصل کے آخر میں ہی: نقل از نسخہ انندرام مخلص)

۱۹۳ الف۔ [احوال سفرِ[2] بن گڑھ] یہ عنوان اس فصل کے آخر میں مذکور ہی شروع میں نہیں، وہاں مصنف نے لکھا ہی کہ آج ۱۲ رمضان المبارک ۱۱۵۸ھ کو یہ چند اجزا متضمن احوال سفر بن گڑھ چار گھڑی رات گزرنے پر برسات کی آمد آمد کے دنوں میں "بخط فقیر انندرام مخلص" ختم ہوئے ۹ رمضان المبارک کو دسہرے سے ایک دن بعد "نورِ چشم کامگار رائے فتح سنگھ" کے ہاں لڑکا ہوا وغیرہ وغیرہ

۲۲۹ ب [نسخہ سوانح احوال] یعنی تاریخ پنجاب کے واقعات از جمادی الثانی ۱۱۵۸ھ تا جمادی الثانی ۱۱۶۱ھ)

---

[1] اس کا انگریزی ترجمہ ولیم اروِن نے THE INDIAN MAGAZINE AND REVI بابت ۱۹۰۳ء میں دیا ہی (دیکھو سٹوری ص ۶۱۳) [2] محاصرۂ بن گڑھ کا حال اروِن نے اپنی کتاب THE ARMY OF THE INDIAN MOGHULS میں ص ۲۹۱ وما بعد پر دیا ہی جو خوش حال چند کے بیانات پر مبنی ہی۔

خاتمے میں مصنف نے لکھا ہے کہ گرمیوں کی رات ایک پہر گزری تھی اور گرمی ہوا اور افراطِ بادِ سموم سے دم خفا ہوتا تھا کہ ابر آیا اور زور کی بارش ہوئی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ اس وقت یہ کتاب تمام ہوئی "مدتے است کہ دماغ تصنیف و تالیف ندارم لیکن ازآں جا کہ دریں چند ماہ از بوقلمونیہاے چرخ طرفہ انفسلا بہا بررُوے کار رسیدہ برائے عبرت و آگاہیِ بعض غافلان پست فطرت کہ در اندک تغیرِ احوال از جامے روند ایں ورقی چند کہ مخنوبیست بشرحِ آں بقلم آوردم۔"

ضبطیِ اموالِ اُمرا متوفّی

ذیل کا اقتباس جو بدآیع و قایع سے لیا گیا ہے وہ موضوعِ بالا پر روشنی ڈالتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ مغول میں امرا کی موت کے بعد ان کے اموال بحقِ بادشاہ ضبط ہوتے تھے۔ اس کا مجمل ذکر تاریخوں میں جا بجا ملتا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:۔

عہدِ اکبری میں مخدوم الملک سنہ ۹۹۰ھ میں فوت ہوئے تو قاضی علی "بجہت تحقیقِ اموال" نامزد ہو کر فتح پور سے لاہور پہنچے۔ بہت سے خزاین و دفاین نکلے۔ ان میں "چند صندوق خشت طلا" بھی تھے جو "گورخانۂ مخدوم الملک" سے برآمد ہوئے۔ یہ سونے کی اینٹیں مع کتاب خانے کے "داخل خزانۂ عامرہ" ہوئیں (منتخب التواریخ، بدایونی، طبع کلکتہ سنہ ۱۸۶۵ء ج ۲: ۳۱۱، دربارِ اکبری طبع لاہور سنہ ۱۸۹۸ء ص ۳۱۸) ان کتابوں میں سے شرحِ ہدایہ (دفترِ ثانی) راقم سطور نے دیکھی ہے، اس کتاب کے آخر میں لکھا ہے: بابت اموال مخدوم الملک بتاریخ ۱۷ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۹۰ھ واقع شد (کذا) اس کے نیچے ایک دوسرا نوٹ ہے جو بعد میں لکھا گیا۔ اس کی عبارت یہ ہے: بتاریخ ۲۴ ماہ شہریور الٰہی سنہ ۲۷ھ از

وجوہ تحویل شیخ فیضی تحویل مقصود شد۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخدوم الملک کی ضبط شدہ کتابیں (کُل یا بعض) شیخ فیضی کی تحویل میں رہیں اور شیخ کے فوت ہونے کے بعد کسی اور شاہی تحویل دار کے حوالے ہوئیں۔ شیخ فیضی ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ (۴۰ جلوسی) میں فوت ہوا۔ خود شیخ فیضی کے اموال بھی ضبط ہوئے مآثر الامراء ج ۲ ص ۵۸۹ پر ہے: گویند از متروکہ شیخ چہار ہزار و سہ صد کتاب صحیح نفیس بسرکار بادشاہی ضبط شد[1]۔

ملّا بدایونی (۲: ۴۰۶) نے ۹۸۸ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ حکیم ہمام اور کمالائے صدر علی الترتیب ۶ اور ۷ ربیع الاوّل کو فوت ہوئے۔ "و مالہائے ایں ہر دو در ساعت در حجرہا قفل گردید و بیچارہ کفن محتاج بودند" ...... یہ واقعات عہدِ اکبری کے تھے۔ عہدِ جہانگیری کی اسی قسم کی ضبطیوں کا ذکر بہارستان غیبی (ترجمہ انگریزی طبع ۱۹۳۶ء) میں بھی بعض بعض جگہ ملتا ہے[2]۔ عہدِ شاہ جہانی میں ضبطیٔ اموال آصف خاں ابوالحسن اعتماد الدولہ برادر کلاں نور جہاں بیگم کا واقعہ پیش آیا۔ بادشاہ نامہ ج ۲، حصّہ دوم ص ۲۵۹ پر اس کی تفصیل یوں دی ہے کہ آصف خاں کی علالت میں شاہ جہاں عیادت کے لیے گیا تو اس نے عرض کیا کہ "سب نقود و اجناس جو اس درگاہ کی عبودیت سے حاصل ہوئے۔ سرکارِ والا کا مال ہیں اس لیے کہ جمع اموال سے غرض صرف یہی ہوتی ہے کہ اولاد اور متعلقین کو رفاہیت اور جمعیت حاصل رہے اور وہ

---

[1] بلوخمن نے ترجمہ آئین (۱: ۴۹۱) میں اسی کو دہرایا ہے۔ دربار اکبری (ص ۳۶۰) کے بیان کا مآخذ بھی غالباً یہی ہے نہ کہ "ملّا" (عبدالقادر بدایونی) مگر دربار میں تعداد کتب چار ہزار چھ سو دی ہے جو غلط معلوم ہوتی ہے۔

[2] نیز دیکھو فنچ کا سفرنامہ انگریزی مرتبہ فاسٹر (۱۹۲۱ء) ص ۱۰۴، اور اکبر مغل اعظم (از ونسنٹ سمتھ) ص ۳۶۴

صورت مراحم پادشاہی سے کما ینبغی حاصل ہو"! آصف خاں کے مرنے کے بعد حویلیٔ لاہور کے علاوہ جو بیس لاکھ کے خرچ سے تیار ہوئی تھی اور اب دارا شکوہ کو عنایت ہوئی دو کروڑ پچاس لاکھ کی مالیت کا نقد وجنس باقی رہا (جواہرات تیس لاکھ رُپے کے، اشرفیاں بیالیس لاکھ کی، رُپیہ ایک کروڑ پچیس لاکھ، طلا آلات ونقرہ آلات تیس لاکھ رُپے کے، دیگر اجناس تئیس لاکھ کے) گو اعتماد الدولہ کی وصیت یہ تھی کہ اس کا نقد وجنس تمام داخل خزانہ پادشاہی ہو، بادشاہ نے بیس لاکھ روپیہ (نقد وجنس) متوفی کے تین بیٹوں اور پانچ بیٹیوں کو عنایت کیا اور متعلقین کو حسب لیاقت منصب دیے اور مشاہرے مقرر کیے۔ باقی سب کچھ ضبط فرمایا۔ عہدِ محمد شاہی میں زکریا خاں کے اموال ضبط ہوئے۔ اس واقعے کے متعلق جتنی تفصیل انند رام مخلص نے بدائع وقایع میں دی ہو راقم سطور نے اور کسی مصنف کے ہاں نہیں دیکھی۔ تفصیل اس واقعے کی یہ ہو کہ زکریا خاں صوبہ دارِ لاہور ۱۱۵۸ھ میں فوت ہوا تو شاہی کارندے دہلی سے ضبطیٔ جایداد کے لیے لاہور بھیجے گئے، وہ تمام سامان نقد وجنس وفیل واسپ وشتر وغیرہ وغیرہ لے کر دہلی پہنچے، زرنقد، طلا آلات، نقرہ آلات اور جواہرات داخلِ خزانہ پادشاہی ہوئے اسپ وشتر واستر کو نیلام کرکے تھوڑی سی قیمت جو وصول ہوئی وہ بھی داخلِ خزانۂ سرکار بادشاہی ہوئی۔[1] بعض جواہرات کے متعلق مصنف نے لکھا ہو کہ ان کی اصل قیمت ۱۳۵۰ رُپے تھی مقوّمانِ سرکار نے ان کی قیمت ۲۶۳ رُپے لگائی اور یہ جواہرات بادشاہ نے رکھ لیے گویا ان کی قیمت واجب الادا تھی اور باقی مال کا معاوضہ مالکوں کو بظاہر نہ دیا گیا۔ جو مال ناقابلِ قبول قرار دیا گیا وہ لاہور واپس بھیج دیا گیا۔

اب اصل اقتباس نسخۂ کلیۂ پنجاب سے درج کیا جاتا ہو جس کا مقابلہ نسخۂ علی گڑھ سے کیا گیا۔

---

[1] دیکھو صفحہ ۱۱۰ سطر ۳ و ۸ و ۱۲۔ [2] ص ۱۱۶ سطر آخر، اس سے پہلی سطر میں مصنف کے الفاظ "در ضمن ایں گونہ قیمت کردن غرضی ہر آینہ مدّ نظر دا زند" سے بھی یہ گمان گزرتا ہو کہ "غرض" شاید یہ تھی کہ قیمت وصول شدہ گویا متوفی کے ورثا کو کسی صورت میں مجرا دینا ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ربِّ یسّر و تمّم بالخیر

(۹)

چوں آبادی و معموریِ الکۂ پنجاب و آرام و آسودگیِ سکنۂ آں گلزمین در ایامِ نظامت نوابِ سیف[1] الدولہ زکریا خان بہادر دلیر جنگ مغفور مرحوم بپایۂ کمال رسیدہ مستعدِ زوال بود از نیرنگ سازیِ قضا و قدر در[2] سالِ یک ہزار [و یک صد] و پنجاہ و ہشتم [و سنہ ببیست و ہشتم[3]] جلوسی خلیفۂ دین و دولت محمد شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ [و] و از دہم جمادی الثانی سہ شنبہ یک پہر و سہ گھڑی روز بلند شدہ آفتاب عمر سیف الدولہ بہادر مبرور در مغربِ فنا فرو رفت، یعنی بلبلِ روحِ پُر فتوحش از قفسِ جسمِ عنصری بہ پرواز آمدہ بشاخِ سدرۃ المنتہی[4]

---

[1] شجرہ نواب کے خاندان کا یوں ہے:-

عالم شیخ
میر بہاء الدین
محمد امین خاں اعتماد الدولہ چین بہادر
قمر الدین خاں اعتماد الدولہ نصرت جنگ ...... بنت
(میر محمد فاضل) م - ۱۱۶۱
انتظام الدولہ خان خاناں (م - ۱۱۶۷) — فخر الدولہ
میر معین الملک (میر منّو) رستم ہند (م - ۱۱۶۷) — امین الدین خان

خواجہ زکریا
عبد الصمد خاں دلیر جنگ (م ۱۱۵۰) ...... ز ...... بنت بنت ...... ز ......
عبد اللہ — عضد الدولہ زکریا خان بہادر ...... ز ...... بنت
یحییٰ خان — حیات اللہ خان (شاہ نواز خاں)

(دیکھیں مآثر الامرا مواضع متفرقہ و تاریخ پنجاب از سید عبد اللطیف ص ۲۱۳)

[2] ایضاً ۱۲ جولائی ۱۷۴۵ء

[3] از روے نسخۂ کتابخانۂ علیگڑھ کہ علامتش در حواشی "ع" است

[4] اصل، المنتہای

آشیاں بست، قیامتی سرتاسر پنجاب تخصیص در شہر لاہور گذشت، کہ تا سر شب در ہیچ خانہ چراغے روشن نگشت، ہرگاہ جنازۂ آں مغفور از حویلی برآمد سوائے نوع مغل کہ ہمگی گریبانہا تا دامان چاک زدہ خاک بر فرق ریزاں و تبالش[1] بودند ہزاران ہزار مردم (۲۳۰) شہر لباس سیاہ پوشیدہ درکمال شور و شغب نالۂ وامصیبتاہ واحسرتاہ[ہ] برلب ہمراہِ جنازہ راہ می پیمودند والہ ہر جانب بارشِ گل بر جنازہ بآں افراط گردید کہ دستِ آخر[2] گلی بمشت زدی بہم نمی رسید اگرچہ مانندِ گل شیرازۂ اوراقِ عمرش زود ازہم گسیخت لیکن تا در قیدِ حیات بود بنا بر جود و سخا و خُلقِ خوشی کہ داشت رنگِ تسخیرِ دلِ جہانے ریخت، در واقع ؎

چوں صبح زندگانی روشن دلاں دمے ست
آنا دمے کہ باعث احیاے عالمے است

جنازہ لامکانِ حضرت ایشاں کہ بنا گزاشتہ معمار ہمتِ آں مغفور ست در سوادِ شہر واقع بردہ پہلوی مزار فایز الانوار سیف الدولہ عبدالصمد خان بہادر مرحوم والدِ بزرگوارش بسانِ گنج بخاک سپردند و جمعے کثیر جہتِ خدمت مرقدِ مطہر سوائے آں مردمے کہ بمقتضائے حقِ نمک و وفا رخت فقر و فنا پوشیدہ مجاور گردیدہ بودند مقرر نمودند۔

راقم حروف دو تاریخ متضمن ایں سانحِ غم افزا کہ یکے موزون ست و دوم در نثر یافتہ چنانچہ مرقوم می شود[3] ؎

حضرتِ خان بہادر نوابا
آں کہ او دادِ عدالت میداد
آں کہ او ساختہ از بس ہمت
اکثر آئین سخاوت ایجاد

---

[1] اصل: نیالیش، متن: تبالش، لفظی قیاسی است۔ [2] یعنی نوبت آخر
[3] متن: دیگرے

ناگہاں کرد ز عالم رحلت / بجہاں شور و قیامت افتاد
شد بلند از دلِ خلقِ پنجاب / نالہ و شیون و داد و بیداد
رونق الکۂ لاہور افسوس / رفت چوں باد خزاں دیدہ بباد
سال (۲۳۰ ب) این ماتم جانکاہ قلم / زد رقم "خانِ[1] بہادر فریاد"
۱۱۵۸ھ
این چنیں بود مقدر اکنوں / گلشنِ خلد مقامِ او باد

"تاریخ دوم کہ در نثر یافتہ شدہ این ست: مادۂ[2] تاریخ ہائے "زکریا خاں کوچ کرد"
۱۱۵۸

عزیمت اعزّ الدولہ بہادر و حیات اللہ خان بہادر جانب پنجاب از حضورِ پُر نور و متوقّف شدنِ حیات اللہ خان بہادر در دوآبہ و رسیدنِ اعزّ الدولہ بہادر بہ لاہور

از اتفاقات اعزّ الدولہ یحیٰی خان بہادر و حیات اللہ خان بہادر[3] ہر دو جناب کہ از دولتِ نادریہ بخطاب شاہ نواز خان مخاطب و اوّلین گلِ اوّلِ حدیقۂ آرزو و دومی غنچۂ دومِ[4] گلبنِ امیدِ آں عالی جاہ مرحوم ست در حضورِ پُر نور و میر مومن خان و میر منعم[5] خان بمہم کوہستان جموں مامور بودند، میر مومن خان
10
روز سوم از رحلت بشہر رسیدہ بمراسم تعزیت پرداخت وآں ہر دو گل

---

[1] ع میں اس کے نیچے لکھا ہے: الـ ١ ـھ یعنی ۱۱۵۸ ھ، [2] درع ندارد، [3] یعنی یحیٰی خان زکریا خان کا بڑا بیٹا اور حیات اللہ خان چھوٹا بیٹا تھا، [4] درع ندارد، [5] ع: نعمت،

گلشنِ اقبال کہ باطلاعِ مرضِ آں مغفور در عین موسمِ برشکال ہژدہم جمادی الثانی سنہ صدر از حضورِ فیض گنجور دستوری حاصل کردہ جریدہ و ملیغرا حرام دریافت سعادتِ ملازمت پدرِ عالی قدر لبستہ بودند در اثنائے راہ خبرِ رحلت شنیدہ ہزبر جنگ بہادر در دوآبہ تعلقۂ فوج داری خود متوقف گردیدند و اعزّ الدولہ بہادر بعد کشیدنِ اقسامِ شدایدِ سفر بہ بلدۂ لاہور رسیدند۔

احوالِ کشتی

ہنگامِ عبور از آب بیاہ بر کشتی کہ اعزّ الدولہ بہادر سوار بودند طرفہ حادثہ گزشت، چہ از آں جا کہ بنا بر اضطرابِ خاطر [۲۳۱ ل] سررشتۂ احتیاط بکلی از دست رفتہ بود در کمالِ شتاب زدگی و سراسیمگی بے اسباب و لوازمِ امارت سپاہیانہ و [ترکانہ] قطعِ [راہ][1] مے شد، ہرگاہ پنجم رجب سنہ مرقوم براہ غیر متعارف بر دریاے بیاہ کہ در نہایت طغیان بود رسیدند کشتیِ ناکارہ با یک دو ملّاح بیچارہ بدست افتاد، باوجودِ ممانعتِ خیر خواہان با بعض مصاحب بر آں سوار شدند و بمقتضاے آں کہ [ع]

ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

ارادۂ عبور از دریا نمودند، ہرگاہ کشتی در وسط دریا رسید از ناتجربہ کاریِ ملّاحان و آشوبِ باد و باراں کہ آب را بتلاطم داشت اجزایش متزلزل گردید، اعزّ الدولہ بہادر کہ پیش ازیں رخت از بدن برکندہ و لنگی در کمر پیچیدہ نشستہ حقّہ می کشیدند احوالِ کشتی را دیگر گوں یافتہ خود را بر آب زدند و چوں از طفلی مشقِ شنا رسانیدہ اند شروع بدست و پا زدن در آب کردند از آں جا کہ او

---

[1] از روی ع

تعالی شانہ در ہمہ حال معین و یاورِ اہلِ اقبال ست دراں حالت پیرے
نورانی جبہ دو کدو بایشاں دادہ گفت کہ ایں ہارا زیرِ سینہ گزاشتہ شنا نمایند،
حق تعالی بسلامت بساحل خواہد رسانید، ایشاں ہر دو کدو از دستش گرفتہ
موجبِ اشارت پُر بشارتش بعمل آوردند و دراندک سعی بفضلِ بیکرانِ او تعالی
شانہ بخیریت بساحل رسیدند، بیایم بر سرِ احوال [۲۳۱ ب] کشتی بمجرد آں کہ (۲۳۱ب)
ایشاں خود را برآب زدند کشتی درآب فرونشست و قریب چہل و پنجاہ کس از
مقربان و نزدیکاں کہ دراں جا گزیں بودند غریقِ بحرِ فنا گشتند[1] آرے ؎

دریں ورطہ کشتی فروشد ہزار
کہ پیدا نشد تختہ بر کنار

سخن مختصر ایشاں یک دو مقام در پرگنۂ بٹالا نمودہ بعد ازاں کہ فوج و کارخانجات
رسیدند ازاں جا کوچیدند، و بعد رسیدن بنواحِ لاہور از گردِ راہ بزیارتِ مرقد
منوّر مطہر پدرِ عالی قدر و جدّ بزرگوار پرداختہ نہم رجب المرجب سنہ صدر
داخل شہر گردیدند، لمصنّفہ ؎

می رسد فخر قوم مجنون را
وارثِ شہر سبز ہا موند[2]

بعد فراغ از رسمیاتِ تعزیت بانتظامِ مہام آں ضلع پرداختند و موجب[3] 10
رسم دودمانِ خود دامِ جود و سخا گستردہ طرحِ صیدِ دلہا انداختند، حالا خامۂ
بدایع نگار ایں ماجرا راہمیں جا مے گزارد و احوالِ حضورِ پُر نور رمی نگارد۔

سعی خامۂ بدائع نگار در تحریر ماجرائے دربارِ جہاں مدار

چوں از روئے نوشتہ جاتِ اربابِ تحریرِ لاہور خبرِ رحلتِ سیف الدولہ
بہادر مغفور بشاہ جہان آباد رسید نواب صاحب وزیر الممالک اعتماد الدولہ

---

[1] اصل: کشیدند [2] اصل: ہاموبند، ع: ہاموند۔ شعر کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا [3] اصل: موحم

بہادر دام اقبالہ در تعزیت نشستند و تا سہ روز جمیع ارکانِ سلطنت و
برگزیدہ ہاے خلافت بتقریب فاتحہ آمد شد می داشتند۔ من بعد بموجب حکم والا
عمدۃ الملک امیر خاں بہادر نواب صاحب را از ماتم بر داشتہ بحضور بردند و از
جناب اقدس [۲۳۲ ا] بعد ارشادِ کلماتِ متضمن بہ فضلِ دل جوئی جیغۂ پیچیدہ
بدستِ مبارک مرحمت شد و نیز دو دست خلعتِ تعزیہ باد و منشور لامع النور
مشعرِ تفضلاتِ بادشاہانہ حوالہ گرز داران شد کہ باعز الدولہ بہادر و ہزبر جنگ
برسانند۔ ببیت و ششم جمادی الثانی سنہ مذکور از پیشگاہِ خلافت و جہاں ثانی
محی الدین علی خاں بہادر دیوانِ بیوتات براے ضبطِ اموال سیف الدولہ
بہادر مرحوم بہ لاہور دستوری یافت۔

اگرچہ فدویت و بندگی سیف الدولہ مبرور مقتضی ایں معنی بود کہ لاہور
وملتان از انتقال آں مغفور باعز الدولہ بہادر و حیات اللہ خان بہادر مرحمت
می گردید لیکن ازآں جا کہ ع

رموزِ مصلحتِ ملک خسرواں دانند

۱۰ بخاطر اقدس گزشت کہ صوبہ جات را بہ بندہاے دگر مرحمت باید فرمود۔
نواب صاحب وزیر الممالک بہادر نظر بایں معنی کہ چوں از مدتے ممتد صوبۂ
لاہور بسیف الدولہ عبد الصمد خان بہادر مرحوم و سیف الدولہ زکریا خان
بہادر مغفور تعلق داشتہ از یں ممر مانندِ بلخ و بخارا وطن مغایبہ گردیدہ و
ایں ہا عمارات و باغات و مقابر در آں جا دارند و در صورتِ مقرر شدن
بدیگرے ویرانی و خرابی آں ہاست لہٰذا دریں باب استادگی تمام کردہ جہت
تقرر صوبجات بنام اعز الدولہ بہادر و ہزبر جنگ بہادر بعرضِ اشرف

۱؎ دیکھیں مآثر الامرا، ج ۲، ۴۱۲ ۸۳۔ آئینِ رفوحِ مغولانِ ہند) ص ۲۹۱ ۲؎ ع: بفضل

رسانیدند، واکتفا بریں معنی نکردہ مبالغہ را کہ منافیِ عالمِ بندگی ست از حد گزرانیدند لیکن (۳۳۲ ب) : بہ بعض جہات کہ قابلِ تحریر نیست اصلا مزاجِ اشرف (۲۴) بریں پلّہ نیامد، از بوالعجبی ہاے تقدیر است کہ راجا ابیسر سنگھ[1] پسرِ راجا دہیراج بعد فوتِ پدر خود بعطاے زمینداریِ آنبیر[2] ونظامتِ اکبرآباد وجاگیرامے[3] کہ پدرش داشت سربلند شود واعزّ الدولہ بہادر وہنر برجنگ بہادر با وصف سررشتۂ بندگیِ درگاہِ آسمان جاہ ونسبتِ ہمشیرہ زادگیِ نواب صاحب جمدۃ[4] الملک مدار المہام یک قلم از ارث محروم باشد، بارے جاے دم زدن نیست رُباعی

ہرگز در مدح وذم نمی باید زد — از حد بیرون قدم نمی باید زد

دنیا ہمہ مرآتِ جمالِ ازلی ست — می باید دید ودم نمی باید زد

بیاییم بر سرِ حرفِ مطلب، ہر کہ نواب صاحب وزیر الممالک بہادر دریں امر مبالغہ را بسر حدِ نہایت رسانیدند، تجویز دیگراں موقوف ماندہ مرضیِ اقدس بریں معنی آمد کہ ہر دو صوبۂ مسطور بہ نواب صاحب وزیر الممالک بہادر مرحمت فرمایند، ناچار[5] نظر برانیکہ تارک ورشیۂ تصرفِ مغلیہ از آں سرزمین پراگندہ نشود[6] دباییں جانب کہ منفرد شد حقیقتاً براے اعزّ الدولہ بہادر وہنر برجنگ بہادر دست قبول نمودند واز پیشگاہِ خلافت نہم شعبان المعظم سنہ مذکور روز سہ شنبہ خلعتِ خاصہ وجیغۂ پیچیدہ بدستِ خاص باطرّہ واسپ[7] وفیل باطلا[8] بابتِ تقرر نظامتِ لاہور وملتان بایشاں مرحمت شد وبرسالہ بخشی[9] سوم عمدۃ الملک

---

[1] ع: ابیسر سنگھ، براے ابیشور سنگھ پسر دھیراج جےسنگھ رک بہ مآثر الامرا ۲: ۸۳
[2] اصل: انبیر [3] اصل: کہ جاگرانی، تصحیح از روے ع [4] جمدہ بمعنی بزرگ، زبلند
[5] ع: نواب صاحب ناچار (بجاے ناچار) [6] اصل: تا پنجاب، تصحیح از روے ع [7] ع: تعلق
[8] ع: طلا بہ رطلا لی [9] بخشی سوم کے فرائض کے متعلق دیکھیے اورنگ زیب کی کتاب دی آرمی آف دی مغلز از ولیم ارون ص ۳۹

بہادر، آداب بجا آورند، و ہماں روز باوصفِ شدّتِ بارش پیش خیمہ [۲۴۳ ا] را جانب لاہور برآوردہ مقرر کردند کہ عنقریب بآں سمت متوجہ شوند تا یک چند درآں ضلع بودہ و از نظم و نسقِ آں جا خاطر جمع نمودہ باز مراجعت بحضور نمایند سہ تاریخ متضمن ایں معنی راقم حروف یافتہ، مرقوم قلم بدایع رقم می شود لمصنّفہ

[(۱)] اعتمادالدولہ[1] نواب وزیر — آں محیطِ فضل و دریاے کرم
از جنابِ اقدسِ گیتی خدیو — سایۂ حق مظہرِ فیضِ اتم
یافت از راہ تفضّل در تیول — صوبۂ لاہور و ملتاں نیز ہم
زیں جہت تشریفِ خاصی شد عطا — از پے آں صاحبِ سیف و قلم
خامہ ام سالِ مبارک فالِ آں — "خلعتِ پنجاب" کرد امشب رقم
۱۱۶۸

[(۲)] وزیر الممالک مدار المہام — کہ اقبالِ او بادہ ایم فزوں
بحکمِ شہنشاہِ[2] گیتی خدیو — کہ یک بندۂ اوست گردوں دوں
کہ لاہور و ملتاں بجاگیر یافت — بصد میمنت ہم بچندیں شگوں
پے سالِ فرخندہ فالش سحر — نمودم سوال از دلِ ذوفنوں
بفرمود ناگاہ ہاتف بگو — کہ "لاہور و ملتاں مبارک کنوں"
۱۱۶۸

[(۳)] وہ نثر جنہیں یافتہ شد:

"بندہ نوازا! لاہور و ملتان مبارک!"

ایجازِ سخن، نیابتِ نظامتِ لاہور بمیر مومن خاں دیوانی بہ لکھپت راے مقرر شد، و نیابتِ نظامت ملتان بخواجہ اسحٰق خاں، بدستورِ سابق بحال ماند، باآں کہ حرکتِ نواب سمتِ پنجاب مقرر و پیش خیمہ ہم برآمدہ بود لیکن تقدیر

---

[1] اصل و ع: خان بہادر اعتماد الدولہ (بجاے اعتماد الدولہ). [2] اصل میں اس سے پہلے ایک مصرع دیا ہے: گدا از نہیبش خود پیرن جیر مگر دوسرا مصرع نہیں دیا۔

کہ بر تدبیر غالب ست ورقِ ارادہ را برگرداند ے

(۱۴۳) اگر محوّلِ [1] حالِ جہانیاں نہ قضاست | چرا مجاریِ احوال برخلاف رضاست
بلے قضاست بہر نیک و بد عنانکش خلق | بداں دلیل کہ تدبیرہائے جملہ خطاست

از نیرنگیہائے ایں قصر مینا فام پائے [2] لغزیدنِ* نواب صاحب وزیر الممالک بہادر از سرِ زینۂ پُشتِ بام

بہ بیست و ہشتم [3] شعبان سنہ مذکور نواب صاحب وزیر الممالک بہادر بقاعدۂ قدیم سرِ شام از حویلیٔ اجمیری دروازہ سوار شدہ در حویلیٔ نو کہ آں نیز قریب بدروازۂ مذکور و محاذیِ حویلیٔ مسطورہ ست تشریف فرمودند و چوں ذوق مفرطے بتماشائے تعمیرِ [4] تازہ دارند بروشنیِ مشعل سیرِ عمارت می نمودند، از آں جاکہ بامیرِ عمارت متوجہ بحرف بودند پا از سرِ زینۂ اوّلِ پشت بام لغزید و چوں ہیچ جا نتوانست قایم شد آسیبی سخت و صدمۂ قوی در سر بنا بسرِ [5] چپ رسید، درآں حالتِ غش اشارہ بفصد کردند چنانچہ ہماں وقت لعمل آمد، آخر ۱۰ شدتِ وجع و الم باعثِ حرارت شد، فرمایش معتبر الملوک [6] علوی خاں و علی نقی خاں و معالج [7] خاں وغیرہ حکمائے پادشاہی حسب الحکم والا حاضر شدہ باقسامِ تدبیر و معالجہ پرداختند تا بعدِ مدتے طاقتِ حرکت پیدا کردند، لیکن ہنوز

---

[1] ع: لغزیدن پائے [2] ع: ہشتم [3] اصل: سیر؛ تصحیح از روئے ع [4] ع: [5] ع: ران [6] اصل: المملوک [7] ع: معالجان

اثرے ازآں باقیست زیراکہ ہنگام راہ رفتن محتاج بعصا اند، امید کہ از فضلِ الٰہی آں نیز رفع شود و شفائے کلّی حاصل گردد

دلا معاش چناں کن کہ گر بلغزد پائے
فرشتہ[1] ات بدو دست دعا نگہ دارد

درواقع کہ اثر دعاہائے سحری و نیم شبیِ خلق اللہ بود کہ حق تعالیٰ (از) ایں گونہ بلائے ناگہانی حفظ [۴۲۳ الف] ذاتِ حمیدہ صفاتش نمود، تاریخ کہ متضمن ایں معنی یافتہ شد بہ قلم می آید لمصنفہ

عُمدۃ الملک، وزیرِ اعظم	کہ خدایش بسلامت دارادا
شب کہ گلگشتِ عمارت می کرد	بادلِ خرّم و از غم آزاد
گل بدانساں کہ فتند از گلبن	از سرِ بام بناگاہ افتاد
سالِ ایں سانحہ دل جست از من	گفتمش حق ہمہ جا حافظ بادا

بارے بنا بر رحلتِ سیف الدولہ بہادر مغفور و عدم تقرر نیابتِ نظامت[۵۸] بنام اعز الدولہ[2] بہادر و بہم ناخوشی ہر دو والا گہر باہم دگر و تاخیر کوچ نواب صاحب و ہمچنیں بسبب بعض مہماتِ دیگر سر تا سر پنجاب دارِ آشوب و فساد شد، و ہر طرف فتنہ پیرایان غارت پیشہ و ہنگامہ آرایانِ کوتاہ اندیشہ کہ از روزگارِ دراز در کنجِ خمول و گمنامی خزیدہ بودند سر از رخنۂ فساد برآوردہ در خرابی و ویرانیٔ آں مملکت بمقدور قصور ننمودند، شہرہا بغارت[3] رفت و قصبہ ہا تاراج[4] کردند تا خاندان ہا پامالِ حوادث گشت و بدولتہا آفت رسید، غرضکہ زمانہ از مردم آں جا کہ بنا بر عدالت و کرمِ نواب ناظم مرحوم در کمالِ آرام و آسودگی زندگانی می کردند طرفہ انتقامی کشید، چنانچہ تا ساعتِ تحریر کہ پنجم[5] رجب سنہ بیست و نہم

---

[1] اصل: فرشتہ، تصحیح از دیوان ع [2] یعنی یحییٰ خان [3] ع: بتاراج [4] ع: غارت، [5] یعنی ۵ رجب ۱۱۵۹ھ = ۲۴ جولائی ۱۷۴۶ء

جلوسی است و یک سال و یک ماہ و بیست و سہ روز از رحلتِ نواب ناظم مغفور گزشتہ ہنوز آں مملکت محلِ فتنہ و فساد ست [۱]

جہاں دار و جہاں را خراب بہانہ است کاؤس و افراسیاب

بعد یک چند از رسیدنِ اعزالدولہ بہادر بلاہور ہزبر جنگ [۳۴۳ ب] بہادر از (۳۴۴) دوآبہ جانب لاہور بحرکت آمدہ در مکانِ حضرتِ ایشاں اقامت گرفتند و باعزالدولہ بہادر درباب تقسیم ملک و مال پیغام کردند، آخر کار حرف بطول کشید و عاید بنا خوشی ہا شدہ، در افواجِ طرفین گونہ زد و خوردی واقع گردید، من بعد پاے مصالحہ درمیان آمد و با ہمدگر بسواری کشتی درمیان دریاے راوی ملاقاتی نیز دست بہم داد و یک پارۂ نقد و جنس از جملہ ترکہ بطریق علی الحساب بشرط کوچیدن سمت دوآبہ از پنجاب حوالہ متصدیان سرکار ہزبر جنگ بہادر شد و ایشاں بدوآبہ کوچیدند۔

رسیدن محی الدین علی خان بہادر با اموال از لاہور بحضور و حوالہ گردیدن اموال لمستود اوراق بہ علاقۂ وکالتِ نواب سیف الدولہ بہادر مغفور

محی الدین علی خان بہادر دیوان بیوتات کہ براے ضبطِ اموال از حضور مامور شدہ بود نُہ لک روپیہ نقد و یک پارۂ جواہر و طلا آلات و نقرہ آلات و پنج زنجیر فیل و یک صد و چہل و شش اسپ و دو صد و سی و یک شتر و

[۱] اصل: فرشتہ، تصحیح از ردیف ع

وبیست استر و توشک خانہ و فراش خانہ وغیرہ کارخانہ جات کہ تفصیل آں طول می خواہد بضبط در آوردہ شہر دہم ربیع الاوّل سنہ مذکور روانۂ حضور شدہ، و ہفدہم ربیع الثانی بشاہ جہاں آباد رسیدہ برسالت عمدۃ الملک[1] بہادر شرف اندوزِ سعادت ملازمتِ اقدس گشت، و بعطاے خلعت شش پارچہ و علَم و نقّارہ نوازش یافت و در بابِ اموال بسعدالدین خان[2] بہادر* (۲۳۵ ل) (۲۱ ا) خانساماں حکم شد کہ تحویلِ تحویلداران کارخانہ جات سرکارِ والا نماید، چنانچہ برطبق حکم قضا شیم بظہور رسید یعنی زرِ نقد داخلِ خزانۂ عامرہ و جنس سپردِ کارخانہ داران گردید. بعد سہ روز از یں[3] بسعادت بعض* اعزّہ بیست و سوم شہر و سنہ مسطور اوّل روز کہ بندگانِ حضرت قدر قدرت در دیوان خاص تشریف آوردند بسعدالدین خان بہادر خانساماں ارشاد قدسی شد کہ چوں اموالے کہ محی الدین علی خان بہادر آوردہ قابلِ سرکارِ والا نیست سواے زرِ نقد، طلا آلات، نقرہ آلات و جواہرے کہ پسند شدہ دیگر ہر چہ ہست حوالۂ وکیل نمایند و ہمیں امروز بسید [مہرش[4]] گرفتہ از نظرِ انور بگزرانند، در واقع کہ چہ لازم کردہ کہ مشتی اسپ و فیل و شترِ دانہ خور زیادتی در سرکارِ والا باشد، آنچہ حیثیت[5] پسند طبعِ اقدس اشرف داشت و آں عبارت ست از زرِ نقد و طلا آلات و نقرہ آلات و جواہر خود بمقتضاے تفضلات پادشاہانہ در وہلۂ اوّل داخلِ خزانہ شد۔

بارے خانساماں در کچہری آمد نشست و بکار خانہ داران تاکید بلیغ کرد کہ توشک خانہ و فراش خانہ و فیل خانہ و اصطبل و آہو خانہ و قوش خانہ وغیرہ کارخانہ جاتِ اموال را از تحویلِ کارخانہ داران پادشاہی طلبیدہ ہمیں وقت

---

[1] دیکھیں ص ۳۰۱ حاشیہ ۲ [2] در اصل بعد ازیں: خان بہادر خانان ۳[3] (۱۳۱ ل): از یں صحبت؛ بسعادت بعرض، تصحیح: زسعایت بعض [4] از روے تصحیح [5] اصل: حیثت، تصحیح: بہشت؛ تتمہ تصحیح: بر ما

بخانۂ وکیل کہ عبارتست از راقم سطور برسانند و رسیدِ ہر کارخانہ بمہرش بیارند، و خود تا دو پہر شب از کچہری برنخاست (۲۳۵ ب) تا آں کہ کارخانہ جاتِ مرقوم را بخانۂ فقیر نہ فرستاد، از رنگ آمیزیہائے نقشبندانِ قضا و قدر ست کہ محی الدین علی خاں [دیوانِ] بیوتات [کہ] بنا بر ضبط اموال از جناب خلافت مامور گردیدہ و اموال بحضور آوردہ بود بعطائے اضافہ و نقارہ سرافراز شود و در حق بے چارہ وکیل کہ بعدِ رحلت سیف الدولہ بہادر مرحوم با حوالِ خود گرفتہ و معطل و بیکار است حکم شود کہ اموال را بخانہ اش رسانند و دواب پانصد روپیہ روزی[1] خرج[*] را بگردنش بہ بندند و دم نقد خود ہامی باید کہ گنجایشِ ایں ہمہ کارخانہ جات داشتہ باشد، بارے قریب بشام آمدنِ[2] اموالِ محشر[*] تمثال شد۔

بسم اللہ اول فیل خانہ کہ از آں جملہ یک فیل سیہ مست خوں خوارہ و بر پشتش فیل بانِ شورپشتے[3] سوارہ بود و دہ دوازدہ کس با چرخی و بھالہ ہمراہ داشت بر دروازۂ حویلی رسیدہ و راہِ آمد و شدِ مردم بکلی مسدود گردید، سر حلقۂ فیل بانانِ بادشاہی کہ چہرۂ کھڑکی دار بر سر پیچیدہ خود را آدم تراشیدہ بودا آمدہ[4] نشست و متاعی رسید گشت، گفتم کہ منشی را بطلبید کہ رسید نوشتہ بدہد، منشی از خانۂ خود پیشِ فقیر می آمد[5]، فیل مست اندکی اشارتِ خرطوم طرفِ مخدوم کرد، آں بیچارہ برہمنِ ناتواں کہ مشتِ استخوانی بیش نیست: ہائے پرمیسر کیسی [کی][6] گفت و بر زمیں غلطید و در آں مرتبہ حس و حرکتش مفقود شد کہ گوئی بدلہ لوک رسید بارے (۲۳۶ ا) کسانِ فقیر بسرِ وقتش رسیدہ از آں مہلکہ بر آوردند۔ و برزاں در ترسانش برائے دیگر پیش فقیر رسانیدند، رسیدِ افیال نوشتہ حوالۂ آں عزیز

[1] اصل: روزی خور، تصحیح از روے ع [2] اصل: آمدے اموال المحشر تمثال، ع: آمدنی اموال محشر تمثال [3] یعنی شورپشت بمعنی شورہ پشت ہے [4] اصل: وآمدہ۔ ع مثل متن [5] اصل: آید [6] از روی ع

چیرۂ کھڑکی بند کردہ رخصت نمودہ شد و بجمد اعظم کہ اہتمام دو اسپ خانۂ فقیر بعہدۂ اوست گفتم ای یار عزیز! ہرچند بلائے نازل شدہ است لیکن استقلال از دست نباید داد و کمر سعی بمیانِ ہمت بربند، بالفعل احاطۂ زمینی کہ بر پشتِ اصطبل ست فیل و اسپ و شتر را و دیگر ہرچہ بیاید درآں جا دہ او تعالیٰ شانہٗ آسان خواہد کرد۔

پہر شب گزشتہ اصطبل و شتر خانہ و استر خانہ رسید و از شور و شر سائیسان آب بے لجامی خوردہ و از شیہۂ اسپاں از گرسنگی نیم مُردہ طرفہ زلزلہ در محلّہ برپا کردند، مردم دروازہ ہائے حویلی و اہل حرفہ دکان ہائے راستہ بازار بند کردہ دم درنمی کشیدند و کلمۂ نستعل[1] یا الٰہی کل صعب برزبان مثل بید برخود می لرزیدند بلکہ دو سہ دکان شیر بنی فروشاں بسببِ شیطنت و شلتاق مردم بادشاہی بتاراج ہم رفت، شب تا روز آمد آمدِ کارخانہ جات محشر آثار و ہجومِ مردم سرکار والا و تنگی جا عجب صحبتے و طرفہ حالتے بودہ است، شب ہمہ شب و فردا ہش تا آں کہ آفتاب غروب نمود ایں ہنگامہ بلند بود، طرفے افیال و اسپ و شتر ایستادہ و سمتے یوزو شیر بچہ ہا[2] و پارہر[پاڑھا] و آہو دادِ ہنگامہ آرائی دادہ، جائے قفس طوطی و بلبل و کوکلا و مُرغ کوہی چیدہ، و بگوشۂ باز و جرّہ و شاہین صید (۲۳۶ ب) عقاب بے طعمگی گردیدہ۔ غرض کہ خانہ از ہجومِ مردم و کثرت از ہر نوع جانور حکمِ احاطۂ شکار قمرغہ پیدا کردہ بود، و صحنِ خانہ لعینہٖ صفحۂ تصویرِ فیل جادو می نمود۔

مردمِ خود را چوں مضطرب و سراسیمہ یافتم، گفتم چہ واقع شدہ است

---

[1] اصل: احتیاط، تصحیح از روسے نخ کلد دست برد عیارانہ: زندانہ (مرآۃ الاصطلاح)

[2] اصل: شتر بچہ ہا، نخ مثل متن کلد در نخ

کہ حواس را بر باد دادہ اید، جائے شکایت نیست بلکہ مقامِ شکر ست زیرا کہ حرف دیروز ست کہ چوں تقریبِ سیرِ چھپڑی مدار درمیان بود نوکر کرایہ نہ دہ شتر داشتم امروز بفضلِ الٰہی دو صد و سی و یک شتر یکے از دیگرے بہتر دارم، پری شب شخصے کہ بقفسِ بلبلے از سرِ کوچہ می گزشت جہتِ فروختنش بچار بودم امروز نام خدا صاحبِ ہزاراں بلبل وغیرہ مرغانِ رنگیں گفتارم، با آں کہ عاجزترم از مور، مخاطب پادشاہ سلیمان جاہ ہندستانم، و با ضعفے کہ گوشہ گزیں و خانہ نشینم کلہ بکلہ با امرائے عالیشانم، از بوالعجیبہائے تقدیر ست کہ درحالتِ احتیاج مالکِ سروسامانِ امیرانہ ام و درصورتِ قلندرمشگی خداوندی و ششِ کارخانہ، اگر خروج کنم بجاست کہ سواری فیل و اسپ و شتر و خیمہ چندیں چھکرہ زرہ[۱] و بکتر وغیرہ و شمشیر و سرب و باروت مہیّا ست، اگر بسیر و شکار پردازم رواست کہ ہمگی لوازم آں آمادہ بر وفق تمناست، آمدم برفکرِ خوراکِ دواب و محافظانش ظاہر ست کہ کفیلِ روزی ہر ذی حیات رازقِ حقیقی است، او تعالیٰ شانہ بہر وضع خواہد [۲۳۷ الف] رساند، اگر ایں معنی زیادہ بر مقدور م خواہد بود دیگرے[۲] را بر احوال ایں مشتی بے زباں [مہربان[۳]] خواہد گردانید بلبیت

رزق را روزی رساں مقدار ہر پیمانہ داد
خوشہ را چندیں شکم داد و بہریک دانہ داد

بارے چوں دفعتاً بہم رسیدنِ قریب سی صد چہار صد کس سائیس و ساربان و بکسریہ[۴] وغیرہ برائے نوکری امر محال بود دعملہ و فعلہ بے رحم پادشاہی، خود از سروا کردہ بدر زدند، نوبتے ہماں فیلِ مست مسمی بجہاں شکوہ از بے مہابتی

---

[۱] دیکھو ارون (دی آرمی آف دی انڈین مغلز ص ۶۷)، [۲] اصل: او [۳] از روے ع
[۴] بکسر پرگنہ بھوج پور، سرکار رہتاس، صوبہ بہار کا ایک قصبہ (چہار گلشن) "بکسریہ" کے متعلق دیکھو ارون کتاب مذکور ص ۱۶۸

زنجیرہا از بیم گسلاندہ بمرتبۂ بر سرِ شورش آمد کہ در تمام محلہ قیامت برپا گشت، اسپ و شتر رم کردہ ہر یکیں آوارۂ دشت بلہ گردی شد، بلکہ بعضے اسپ خود مانند اسپ اسمید جگ[۱] راجہ ہائے ہندستان سرتا سرِ شہر گرد دیدند، و بعد از سہ روز بجسن سعی مردم کوتوالی بہم رسیدند دیوانِ حافظ شیراز قدس اللہ سرہ العزیز، بہ نیت ایں کہ مآلِ ایں مقدمہ چیست بفال کشادم، ایں غزل برآمد۔ غزل

ہاتفی از گوشۂ میخانہ دوش	گفت ببخشند گنہ، می بنوش
لطفِ الٰہی بکند کارِ خویش	مژدۂ رحمت برساند سروش
فضلِ خدا بیشتر از جرمِ ماست	نکتۂ سر بستہ چہ دانی خموش
گوشِ من و حلقۂ گیسوے یار	روے من و خاکِ درِ می فروش
داورِ دیں شاہ شجاع آنکہ کرد	روحِ قدس حلقۂ امرش بگوش
ای ملک العرش مرادش بدہ	وز خطرِ چشم بدش دار گوش
گرچہ وصالش نہ بکوشش دہند	آں قدر ای دل کہ توانی بکوش
رندیِ حافظ نہ گناہی است صعب	باکرمِ بادشہی [۲۴۷ ب] عیب پوش

۱۰ (۲۴۷ ب)

مذکور فیلِ مُردہ

بعد از یک ہفتہ ازیں صحبت در حویلی قدیم در بنگلۂ انگوری[۲] کہ بر پشتِ بام است فقیر و مرزا صلاح بیگ متخلص بہ آگاہ کہ مدارِ مہمات خانۂ محی الدین علی خاں دیوان بہ توانست براو ست نشستہ بودیم، دریں ضمن چودبدار سعدالدین خان بہادر

---

[۱] یعنی اشومیدھ یگ = جشن قربانی اسپ، اس کے متعلق دیکھو ہیسٹنگز کا دائرۂ معارف مذہب واخلاق ج ۲ ص ۱۶۰؛ [۲] مصنف کو انگوری بیلوں سے بہت دل بستگی تھی، دیکھو مرآۃ الاصطلاح بذیل دار بست

خانسامان با چارپائی کہ بر سر مزدوران بود رسیدہ ادائے پیغام کرد کہ دو فیل نر و سہ مادہ فیل بابت سرکار سیف الدولہ بہادر مرحوم بضبط آمدہ بود، ازآں جملہ چہار مانخود پیش ازیں رسانیدہ و رسید حاصل کردہ شد یک فیل کہ بسبب بیماری در شہر بند ماندہ بود سقط گردیدہ چنانچہ ہر دو دندان ورزخوت[1] (؟) آں بریں چارپائی است ملاحظہ کردہ باید گرفت، و رسید باید داد، گفتم ای خانہ خرابان! شاید از گرفتن رسید زندہ ہا تسلی نشدہ آید کہ حالا رسید جنازہ ہا می خواہید بروید و ببرید، من چہ دانم کہ دندان ورزخوت[2] کہ آوردہ اید از ہماں فیل ست یا از فیل دیگر ازآں قبیل۔

کیفیت دیوان مرزا صایب علیہ الرحمۃ

شاید کہ یک ماہ پیش ازیں ہنگامہ از شخصے خبر یافتم کہ رائے نوندہ رائے پیشکار خالصہ دیوانِ مرزا صایب علیہ الرحمۃ دارد کہ قریب یک لک بیت ست چوں از مدتے تلاش ایں قسم دیوان داشتم از پیش رائے مذکور طلبیدہ شیرازۂ اجزایش واکردم و مسطر چہار مصرعی موافق صفحۂ اصل ترتیب دادہ بنابر برداشتنِ نقل بہ نہ کاتب حوالہ نمودم، در عرصہ سہ ماہ و پنج روز ہشتاد و دو جز کہ شصت و ۱۰ نہ ہزار و پنجاہ و ہشت [۶۹۰۵۸] بیت دارد باتمام رسید و مبلغ یک صد و ہفدہ (۲۳۸ ال) روپیہ و پنج آنہ صرف کاغذ و کتابت و جداول و جلدش کردند، حاصلِ ایں گفتگو روزے کہ ہنگامۂ اموال بمیان آمد فردایش کاتبی از جملۂ کاتبانش جزوے تمام کردہ پیش فقیر آورد، بر سرِ ورق جزو کہ نظر کردم ایں بیت مرقوم بود: بیت

در خطرہ گاہی کہ سر باید گرفتن با دو دست
می کنند ایں غافلاں اسباب را گرد آوری

---

[1] اصل: درحوت، نع: وزخوت [2] اصل: درحوت، نع: وزخوت

غریب رقّتی حاصل شد، درسال یک ہزار و یک صد و پنجاہ و یک ہجری کہ شاہ آسمان جاہ نادرشاہ فرماں روائے قلم رو ایران بہ ہندوستان مسلّط شد، برای العین دیدہ شد کہ ہر کہ مال و منال بیشتر[1] داشت او را آفت بیشتر رسید۔

اسبابِ جہاں کہ اکثرش ناچار لیست	در صورتِ افراط سراسر[2] خوار لیست
برقصرِ ہوسہا ست بنائے آرام	تشویشِ دلے بقدرِ دنیا دار لیست

بیایم بر مطلب

چار ہزار روپیہ معرفت راجا قابل رام متصدیٔ سرکار نواب صاحب وزیر الممالک بہادر از برکت[3] بھان ساہو بحساب دو[4] روپیہ سود سر صد[*] بموجب تمسک قرض گرفتم و مبلغ مرقوم را برائے اخراجات کارخانہ جات تحویل سیام صراف[5] نمودم، حالا منم کہ ملک التجار ہندوستانم چنانچہ[6] [آں چنا] در جہاں خلق شدہ گو بالقوہ نباشد بالفعل خود مالکِ آنم، روزہا خانہ ام را ہر کہ می دید کاروان سرا می پنداشت و شبہا ہر کہ تماشا می کردش خیمۂ شب بازی می انگاشت، چوں مامور بودم بفروختن گلہ گلہ اسپانِ رفتہ از کار [۲۳۸ ب] و قطار قطار شترانِ بے مہار درسانیدن وجہ قیمتش بخزانۂ سرکار دو سہ تا خیمہ لشکو ہی درمیانِ چار باغ زدم و حسب الارشادِ خداوندانِ دولت درباب فروخت اسپ و شتر و استر اجازت دادم، مقوّمانِ مقیم سر کوچہ غرض آمدہ نشستند و مال یک روپیہ را پچہا آنہ قیمت کردند، کیست کہ متعرض احوال آں ہا شود زیرا کہ مقوّمانِ سرکار اند و در ضمن[7*] ایں گونہ

[1] اصل: بسیار [2] اصل: دلیل [3] اصل: برکیہان، ع: برکتبھان
[4] ع: سود سر صد دو روپیہ [5] اصل: طرف [6] کذا
[7] اصل: دریں ضمن

قیمت کردن غرضی[1] ہر آئینہ* مدنظر دارند، بارے اسپ و شتر و استر و غیرہ بچہار
دہ ہزار و یک صد و پنجاہ و شش روپیہ و دوازدہ آنہ فروخت[2] گردید* وآں چہ بعد
اخراجات واداے قرض ساہو باقی ماندہ جاے کہ مامور شد رسانید، چنانچہ مفصل
در جمع خرچ مرقوم ست۔

قریب ہفتاد و ہشتاد چھکڑۂ توشک خانہ و قور[3] خانہ و فراش خانہ و غیرہ
کارخانہ جات از عدم دادنِ رسید ہنوز باہتمام مردم بیوتاتی بود، چہ آں ہا رسید
تقید می خواستند و حال آں کہ بدون عرض گرفتن جنس ایں معنی نمی توانست صورت
بست، لہٰذا قرار یافت کہ نویسندہاے راست قلم ہر دو طرف بنشینند و بار چھکڑہا
کشودہ صندوقہاے توشک خانہ کہ سر بمہر ست بر شمار عددے آں اکتفا نمایند
و جنسی کہ زیرِ مہر نیست تفصیلش برنگارند، ششم جمادی الاول سنہ صدر مرزا
صلاح بیگ کہ در اوراق گزشتہ احوالش مرقوم ست با نویسندۂ چند از جانب
محی الدین علی خاں دیوانِ بیوتات و گڑھ پت راے پیشکار مشرفِ ابتیاع خانۂ ۱۰
[۲۳۹ ر] سرکار والا رسیدہ بعض اربابِ تحریر از طرف فقیر در خیمہ ہاے کہ بہ گلزمین[4] (۲۳۹ ر)
نواح چہار باغ زدہ شدہ بود بعرض گرفتنِ جنس کارخانہ جات پرداختند، و چہارم
شہر صدر فارغ حاصل ساختند، پانزدہم، شانزدہم و ہفدہم سہ روز دیگر در مقابلہ کاغذ گزاشتند[5]
من بعد مردم بیوتات پادشاہی رسید بمہرِ فقیر گرفتہ چھکڑہاے اموال یعنی امانتے را کہ
زمین و زمان و دشت و جبال نیا[6]ست متحمل آں شد، تحویل راقم سطور نمودند، شور ظہوراً
وجہولاً از شش جہت بلند تا سما، فقیر تماشائی نقش پردازیہاے قضا۔ شعر

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

---

[1] اصل: فروختہ کردند، ع مش لمن [2] اصل: تودخانہ، تصحیح از روے ع [3] در ع
افزادہ، بودکہ [4] اصل: نداشت، تصحیح قیاسی است۔

بہر تقدیر چوں آمد آمدِ ایام برسات بود ارادہ مصمّم شد کہ زود کارخانہ جات روانۂ لاہور گردد، تدبیرایں معنی درمیان بود کہ دریں ضمن از ڈیوڑھی خدمۂ عالیہ بیگم صاحب محلّ نوابِ سیف الدولہ مغفور پیغام رسید کہ بعضے جنس از توشک خانہ وفرّاش خانہ درکار ست، تعجیل در روانہ ساختنِ کارخانہ جات بوقوع نیاید، ہرچند نظر بعضے جہات مصلحت در روانہ شدنش[1] بود لیکن چوں خداوندانِ دولت چنیں فرمایند غیر از قبول [علاج[2]] نداشت، صورت اینست: جواہرے کہ از لاہور ارسالِ حضور شدہ بود بندگانِ حضرت خلیفۂ دین ودولت روبرو وا فرمودہ وہمگی ملاحظہ نمودہ بعضے رقم کہ سی ویک ہزار وسی صد وپنجاہ روپیہ اصل قیمتش بودنیست ساختہ بہ [۲۳۹ ب] قیمت ہفت ہزار دوصد وشصت وسہ روپیہ (۲۳۹ب) کہ مقومانِ حضور مقرر کردہ بودند نگہ داشتند وبقیہ سربمہر[3] سعدالدین خان بہادر خانسامان وجواہرخاں داروغۂ جواہر خانہ حوالۂ راقم حروف شد، فقیر بجناب نواب صاحب وزیر الممالک بہادر رو) خدمۂ عالیہ التماس کردم: "کارخانہ جاتے کہ در محلہ گنجایش نداشت تحویلِ بندہ شدن مضایقہ ندارد لیکن متحمل بارِ سنگینِ جواہر ہرچند بیش از یک صندوق ویک صندوقچہ نیست عاجز نمی تواند شد، درسرکار نگاہ باید داشت" حق تعالیٰ درعمر ودولت خدمۂ عالیہ بیفزاید کہ درسرکارِ خود نگاہ داشتند درسید بمہر ودستخط خود عنایت نمودند، وہمچنیں توشک خانہ وچینی خانہ وبھنڈہ[4] خانہ وظروف، باورچی خانہ وآبدارخانہ وغیرہ کارخانہ جات را درسرکار خود نگہ داشتہ رسید[5] مرحمت ساختند، واز جنس فرّاش خانہ آنچہ درکار بود بابا بختاور را کہ پرستارِ مزاجدان وجواب وسوال ڈیوڑھی باہتمام آنست درچار

---

[1] : ساختنش [2] : از روست [3] اصل: نمیہ، تصحیح قیاسی است [4] یعنی تمباکو کے متعلقات [5] اصل: نرسید

باغ فرستادہ طلبیدند و رسیدِ آں نیز لطف نمودہ در روانہ ساختن کارخانہ جات مختار نمودند۔

روانہ شدنِ اموال از شاہ جہاں آباد بہ لاہور بموجب حکمِ والا بہ اہتمامِ راقمِ سطور

چوں از جناب خداوندانِ دولت ارشاد شدہ بود کہ چھکڑۂ اموال و افیال را ہمراہ بیگ[1] نظر خان عرف حاجی نذیر و خواجہ بدیع ملازمان اعز الدولہ بہادر کہ یک چند پیش ازیں بتقریب مہمان داری بیگ علی وغیرہ جلوہ دار سرکارِ عظمت مدار [۲۴۰ا] شاہ فلک بارگاہ نادرشاہ فرماں روائے ایران (۲۴۰ا) بشاہ جہاں آباد رسیدہ بودند روانہ کردہ شود و از سرکارِ عالی تعین بسبب بعض جہات قرینِ مصلحتِ وقت[2] نبود، لہٰذا یک صد و یک کس را نوکر کردہ لچھمی رام خدمتگار قدیم الخدمت و حکومت رام محرر را نیز ہمراہ دادہ بیست و دوم جمادی الاول سنہ صدر روانہ لاہور کردہ شد و روز اول متصل کٹرۂ محل دارخان منزل گردید۔ ۱۰

و بعد دو روز بیگ[3] نظر خان و خواجہ بدیع نیز از ڈیوڑھی عالیہ خلعت و دو صد روپیہ یافتہ رخصت گردیدند، و از شہر کوچیدہ در کارخانہ رسیدند و حاجی کہ خالی از بلاہتے[4] نیست یکے بنا بر آں[5] تا فتن[6] در حضور کہ این معنی سببے داشت و دوم جہت گرفتن ایاز نام غلام محمود خود کہ ظاہراً مال تقریب بہ پنج ہزار روپیہ

---

[1] نیکچیر، [ع] تنکچر از روئے تصحیح مرآۃ الاصطلاح (بذیل تنخواہ) [2] اصل: و وقت، [ع] مثل متن

[3] اصل: خواہاں [4] اصل: درساختن، [ع] مثل متن

برده از فلک و ملک بے مزه و ناخوش بود شروع بفرمایشها نمود، گاہے پیغام می کند که این ہمان اموال ست که (دیوان ـ ظ) بیوتات با پانصد سوار و پیاده آورده بود حالا کے توانم با این مردم قلیل برد، لازم که فوجی از سرِ د نواب صاحب متفرق شود، و گاه گفته می فرستد که اگر تعیین فوج از سرکار دشوار باشد خود دو صد سوار و پانصد پیاده نوکر کرده ہمراه باید داد و مبلغی برائے خرچ من نیز باید فرستاد، ہر چند گفته شد که حالا در اموال چه مانده است غیر از چند چھکڑه فراش خانه نیست و معہذا از تعیین مردم از سرکار عالی می توانست صورت بست (۲۴۰ب) چرا این ہمه مردم نوکر [۲۴۰ ب] گرفته می شد؟ و نیز غلامِ شما را من نگریزانده ام که از من بے دماغ باید بود. و باعثِ کم توجہیٔ خداوندانِ دولت فقیر نشده ام که چشم از خدمت گزاریہائے سابق پوشیده ہزار تکلیف مالا یطاق باید نمود، با آن که می دانند که روزے دو صد روپیه کم و زیاده خرچ کارخانه است از آئینِ دولت خواہیٔ خداوند بعید ست که مقام باید کرد، روزی که جہتِ خرچِ راه کارخانه بتکلیف سرانجام یافته در مقامات کثره محل دار خاں تمام باید کرد، قطع نظر ازیں ہا ہمگی پانزده روز در شروعِ برسات که آں عبارت ست از ماه ساون ہندی باقیست، و در راه از دو دریا می باید گزشت، نظر باین مراتب بہتر این ست که دست ازیں ہرزه خیالیہا باید کشید، و بسرعت ہر چه تمام تر باید کوچید، اصلا این حرفہا بخاطرِ حاجی جانکند و بیدار و مدار شبی بروزی آورد و چوں دریافته شد که تاکید و تہدیدش فایده نمی کند احوال بجناب عالیه گزارش کرده شد و از جناب عالیه سزاولان مامور شدند که حاجی را بگویانند و بگویند که اگر زیاده برین توقف کردی بعزلِ جاگیر معاتب خواہی شد، چنانچه سلخ جمادی الاول سنه مذکور

ا؎ اصل: حالانکه، تغ مثل متن ؎ اصل: مقدمات، تغ مثل متن

نورِ چشم کامگار رائے کرپا رام و فرزند ستودہ اطوار رائے فتح سنگھ و برادر مہربان لالہ لچھمی[1] رام و عزیز القدر کشمیری مل وغیرہ یاران را فرستادم کہ شما نیز رفتہ بجاجی درباب کوچ تقیّدِ بلیغ نمایند، واگر با وصف ایں در کوچ استادگی کند دیگر معترض احوالش [۲۴۱ ل] نبودہ کارخانہ را روانہ کنند[2]، یارانِ مذکور در کٹرہ (۲۴۱ ل) محل دار خاں رسیدہ و بجاجی موکّد گردیدہ سہ پہر ہماں روز پیشتر کوچانیدند و خود در باغ مشفق مہربان رائے مجلس رائے پیشکارِ خالصہ کہ متصل بکٹرۂ محل دارخان و بنا بر آبِ نہر در کمالِ طراوت و لطافت ست رسیدہ حاضری خوردند، می گفتند بادنجان باغ کہ دست پختہ شدہ بود خیلے لذّت داد، چوں خبرِ روانہ شدنِ کارخانہ جات یافتم، شکر بجناب اقدس الٰہی بجا آوردم، چہ از روزے کہ اموال تحویلِ راقم سطور شدہ تا ردانہ شدنش تصدیعے کشیدہ شد کہ نصیب ہیچ آفریدہ مباد! وایں ہرج و دردِ سر ہر روزہ منجر بضعفِ دماغے گردیدہ و مدتے خون از دماغ می آمد، تدبیرہا بکار رفت تا مزاج باصلاح آمد ع

دانۂ اشکیم مارا گردشِ چشم آسیا بست

آنچہ دریافتہ شد حاجی کہ از چاشنی خوارانِ لذتِ تجارتست بعضے جنس سوداگری باخود داشت، چوں تقریبِ کوچ جلودار باشیاں درمیانِ فوجِ سنگینی ہمراہ شاں بود لہٰذا در کوچ توقف می نمود، چنانچہ از دوسہ منزلے دارالخلافہ بیشتر نکوچید تا آں کہ قافلہ جلودار باشیاں نرسیدہ و کیفیت جلودار باشیاں بدیں موجب ست۔

---

[1] اصل: بچرام ع: بچھی رام

[2] اصل: روا، تصحیح از روے ع،

احوالِ جلوداربا شیانِ سرکارِ عظمت مدارِ شہنشاہ فلک بارگاہ

شاہِ جم جاہ نادرشاہ فرماں روائے قلمرو ایران ہشتاد و یک راس اسپ با نامۂ
(۲۴۱ب) نامی برائے بندگان حضرت قدر قدرت ظل اللہ [۲۴۱ ب] محمد شاہ بادشاہ غازی
دہ راس اسپ جہت نواب صاحب وزیر الممالک بہادر و ہمچنیں حصہ رسد برائے
۱۰ بعضے امرائے اعز الدولہ بہادر و ہمیں قدر ہزبر جنگ بہادر و ہمچنیں حصہ رسد برائے
بعض امرائے دیگر مصحوب بیگ علی بیگ و کتاب اللہ بیگ جلودار[۱] باشیان ہندوستان
فرستادہ بودند، چوں بہ لاہور رسیدند و اسپان حصہ اعز الدولہ بہادر و ہزبر جنگ بہادر
بایشاں رسانیدند ایشاں چند روز جلودار باشیان[۲] را درآں جا متوقف ساختند
و بسلوک و مدارا پرداختہ حاجی بیگ نظر خان[۳] و خواجہ بدیع را بعلاقہ مہمان داری
باسی صد سوار بہ رفاقت آں ہا مقرر کردہ روانۂ حضور ساختند، و آنہا بشاہ جہاں
آباد رسیدہ بیست و یکم ربیع الثانی سنہ [۲۹] ۱۱[۴] ملازمت اقدس حاصل نمودند،
نامہ و اسپان از نظرِ انور گزرانیدند، خلیفۂ دین و دولت نامہ را بدست خاص
از آنہا گرفتہ حوالۂ یحییٰ خان میر بخشی نمودند، و بعد استفسارِ احوالِ شاہِ جم جاہ
نیلے تعریفِ اسپاں فرمودند، بجلودار باشیان خلعت مرحمت شد و باغ محل دار خاں
برائے بودنِ شان معین گشتہ، اخراجات ہر روزہ از سرکار روالاقرار یافت،
بیست و دوم جمادی الاوّل سنہ مذکور آنہا از پیشگاہِ خلافت بعطائے

۱؎ اصل: جلودار بادشاہ نج مثل متن ۲؎ اصل: سکرخاں، تصحیح از روے مرآۃ الاصطلاح

۳؎ از روے نج

خلاع و بیست ہزار روپیہ نقد کامیاب گردیدہ دستوریِ انصراف یافتند و یک ہزار و دو صد تولچہ عطریات از ہر قسم علیحدہ شدہ [۲۴۲ ا] قرار یافت کہ پنجاہ و یک زنجیرِ فیلِ جواں کہ بہندی زبان پاٹھہ گویند نیز بر سبیلِ ارمغان جہتِ شاہ جم جاہ فلک بارگاہ مصحوب جلو داران باشیاں مرسل شود۔

کیفیتِ ارسالِ افیال جہتِ شہنشاہِ بلند اقبال

چوں افیالِ جواں در فیل خانۂ سرکار والا نبود بہ عمدہ ہائے خلافت ارشاد قدسی شد کہ ہر قدر افیالِ جوان دانستہ باشند از نظرِ انور بگذرانند، و ہم با ہادی علی خاں داروغہ فیل خانہ حکم شد کہ در شہر پیش ہر کس از نوعِ مذکور فیل باشد طلبیدہ از نظرِ جہاں پرور بگذراند، ہر یکے از عمدہ ہائے سلطنت سہ فیل پیشکش کرد، دیگر ہم می گذرانیدند و سعادت می پنداشتند لیکن چہ کنند کہ برالستند[۱]..... چوں داروغہ مردم برائے تفحصِ افیال تعین نمود، ہر طرف در شہر فتنہ سر کشید، و کہن ہنگامۂ فیل و ابابیل کہ آیۂ بلند پایۂ اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحَابِ الْفِیْلِ دلیلِ آن است تازہ گردید، ہر چند از جناب عالمیاں مآب در بابِ تلاشِ افیال جواں حکم بود ایں مشتے شرارت پیشہ در خانۂ کہ سراغِ تصویرِ فیل ہم یافتند بے تحاشا سوئش چوں فیلِ مست بشور و شدّتِ تمام شتافتند بعضے زرکی دادہ خود را از دستِ شاں رہائی دادند و بعضے افیال را در پردۂ شب برونِ شہر فرستادند، و از بعضے در سرکارِ والا ضبط شد، غرضیکہ یک چند در شہر دورِ دورِ فیل بانان بود و ہر فیل بان فیل ہا[۲] سے زر ہائے خطیر از اہلِ افیال ربود، از اتفاقات راقمِ سطور نیز از نوعِ مذکور فیلے داشتم لیکن در شہر نبود، در

[۱] کذا، جملہ میں اضطراب ہے غالباً کچھ عبارت اس کے بعد کی نسخۂ اصل سے حذف ہو گئی ہے۔

ہماں ایام دارو گیر [۲۴۲ ب] روزے چو بدار داروغہ باچند فیل بانان بطلب آں آمدہ ابلاغِ حکم والا نمود۔ بخاطر گذشت کہ ہر گاہ مرضیِ اشرف بادشاہ ہندستان بریں پایہ باشد چہ بہ ازیں است کہ پیشکش کردہ شود۔ باز بخاطر رسید کہ خوب تدبیرے خود باید کرد، چوں با داروغہ از قدیم ربطی داشتم پیغام کردم، فیلے کہ مردمِ سرکار برآں چشم سیاہ کردہ اند اگر مروّت و فتوّت ہمیں اقتضا می نماید حاضر است لیکن چوں زمانہ ہموارہ بیک وتیرہ نمی باشد آخر رنگی خواہد گرداند و صورت ایں ماجراے غریب مانندِ تصویرِ فیل نقشِ صفحۂ روزگار خواہد ماند، و از ڈیوڑھیِ خادمۂ عالیہ نیز درباب عدم مزاحمت زبانیِ محمد سعید خدمتگار پیغام شد، حق تعالیٰ آں مردِ بزرگ را جزاے خیر دہاد کہ بکلّی دست از مزاحمت برداشت و من بعد احدے را بنا بر جواب و سوالِ ایں مقدمہ نگماشت، بارے چوں از سرکارِ بعض امراے عظام و از بیشِ بعضے اہلِ شہر مثل راجا جگل کشور وکیل ناظمِ بنگالہ و دیپی دت[۱] پسرِ سیتا رام اقبال در سرکارِ والا ضبط گردید و تعدادش بہ پنجاہ و یک رسید براے آنہا سازِ دیراقِ نقرہ و رختِ سقرلاطِ زر دوز ترتیب یافتہ مرسل گردید۔

حاصل کلام چوں جلوداریاشیان کہ جمعیّتِ سوار و پیادۂ سرکار نواب صاحب وزیر الممالک بہادر و امارت مرتبت صفدر جنگ بہادر بہمراہِ آنہا تعیّن بود با تحف و ہدایاے صدر روانہ گردیدند، و جائے کہ حاجی بیگ نظر خان[۲] انتظار می کشید رسیدند، حاجی برفاقتِ شان [۲۴۳ ا] پیشتر روانہ شد و بیست و دوم جمادی الثانی سنہ مذکور حاجی با چھکڑہاے اموال و اقبال بخیریت بہ لاہور رسید۔

۱ اصل: ودیتی دت۔ اس شخص کا ذکر چمنستان طبع لکھنؤ ۱۲۹۶ھ ص ۶۶ پر دیکھیں

۲ اصل: نبیگخان، تصحیح از روے مرآۃ الاصطلاح

ختم شد

مفید عام پریس لاہور میں باہتمام لالہ موتی رام مہتمم چھپی اور سید صلاح الدین جمالی مہتمم انجمن ترقی ...

حواشی

صفحہ ۴ - س ۶ - محمود اور البیرونی - البیرونی سنہ ۴۰۸ھ میں خوارزم کے چند امرا کے ساتھ اسیر ہو کر غزنی پہنچا۔ سنہ ۴۰۸ھ اور سنہ ۴۲۰ھ کے درمیان اس نے ہندستان کی سیاحت کی اور سنہ ۴۴۰ھ (۱۰۴۸ء) میں انتقال ہوا۔ (مگر بعض اقوال اور شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنہ ۱۰۵۰ء میں زندہ تھا) محمود کے دربار سے اس کا کوئی تعلق تھا یا نہ تھا؟ اس کے متعلق قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ چہار مقالے کی ایک حکایت سے اس کی تائید ہوتی ہے لیکن البیرونی کی اپنی تصانیف سے اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ اس کی کتاب تحقیق ما للہند سنہ ۴۲۱ھ اور سنہ ۴۲۳ھ کے درمیان لکھی جاتی ہے۔ سنہ ۴۲۰ھ تک وہ سیاحتِ ہندستان سے واپس آچکا تھا سلطان محمود کا انتقال سنہ ۴۲۳ھ میں ہوتا ہے۔ اس تمام عرصے میں البیرونی بادشاہِ وقت کے ساتھ اپنے تعلق کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ البیرونی نے محمودی فوجوں کے ساتھ ہندستان کا سفر کیا۔ لیکن اس کے لیے کوئی قطعی شواہد موجود نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ محمود کے دربار کے ساتھ البیرونی کے تعلق کے متعلق ہماری معلومات ناقص ہیں۔ پس ان حالات کی روشنی میں اس کتاب کے صفحہ ۴ (س ۱) کی یہ عبارت "لیکن محمود ان کی سرپرستی سے دریغ نہیں کرتا" قابلِ ترمیم ہے۔ البتہ اس حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کہ محمود کے زمانے میں ایک شخص غزنی میں بیٹھ کر ہندو علوم و فنون پر کتابیں لکھ رہا ہے۔ اگر عام خیال کے مطابق محمود کو ہندو علوم اور مذہب کے خلاف تعصب ہوتا تو وہ البیرونی کو ایسی کتابیں لکھنے کی اجازت نہ دیتا۔

محمود کے انتقال کے بعد مسعود اور مودود کے ساتھ البیرُونی کا تعلق ثابت ہی چناں چہ قانونِ مسعودی اور کتاب الصیدنہ کے انتساب سے ظاہر ہی [تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میرا مضمون "قدیم عربی تصانیف میں ہندستانی الفاظ" اورنٹیل کالج میگزین۔ مئی ۱۹۴۳ء]

صفحہ ۱۲۳۔ س ۱۴۔ بدائع وقائع۔ یہ ایک طرح کی خود نوشت سوانح عمری ہی اور علاوہ دل چسپ ہونے کے اہم اور نادر بھی ہی۔ ایلیٹ نے اپنی تاریخ میں اس کو "تذکرہ" کے نام سے یاد کیا ہی۔ اس پر مخدومی پرنسپل محمد شفیع صاحب نے جو مضمون لکھا ہی اس کو ان کی اجازت سے اس کتاب کے ساتھ بطورِ ضمیمہ شائع کیا جاتا ہی۔

صفحہ ۱۵۵۔ س ۶۔ وارستہ اور خان آرزو۔ خوش قسمتی سے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں چراغِ ہدایت کا ایک قلمی نسخہ موجود ہی جس کے حاشیے پر وارستہ کے حواشی اس کے اپنے قلم سے موجود ہیں۔ [ملاحظہ ہو کتاب نمبر______] اس کے ایک صفحے کا عکس اس کتاب کے صفحہ ۱۵۴ اور صفحہ ۱۵۵ کے درمیان موجود ہی۔ خانِ آرزو کی بعض اور کتابوں پر بھی وارستہ کے تحریر کردہ حاشیے میری نظر سے گزرے ہیں۔

مآخذ کی فہرست

[مآخذ کی یہ فہرست مکمل نہیں۔ میں نے بغرضِ اختصار غیر اہم مآخذ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ جس باب میں کوئی کتاب استعمال کی گئی ہے۔ قوسین میں اس کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ جہاں کوئی حوالہ نہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کتاب سے ہر باب میں فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ انگریزی کتابوں کے نام بعض جگہ باختصار دیے گئے ہیں۔ یہ اگرچہ اصولاً جائز نہیں مگر اُردو کتاب میں انگریزی ناموں کا لکھنا مشکل کام ہے۔ میری کتاب میں جن بے شمار مصنّفوں کا ذکر ہے ان کی صدہا کتابیں میرے مستقل مآخذ ہیں۔ میں نے ان سب کو پڑھ کر ان سے فائدہ اٹھایا ہے مگر اس فہرست میں ان کو شامل نہیں کیا گیا۔ فہرست کی ترتیب تہجی ہے مگر فصول میں اس کی پابندی نہیں کی گئی]

آئینِ اکبری (۱، ۲، ۳)

اقوامِ کشمیر۔ محمد دین فوق (۱)

اکبر۔ ونسنٹ سمتھ (۲)

اکبر نامہ۔ ابوالفضل (۲)

ایشیاٹک ریسرچز جلد ۱۵ (۳)

انیس الاحبا ـــــ موہن لال انیس (۴)

انیس العاشقین۔ راجا رتن سنگھ زخمی (۴، ۵)

Annals راجستھان۔ ٹاڈ (۴)

ایرین رُول۔ ہیول (۶)

امرائے ہنود (۱، ۲)

اُردوئے معلّٰی۔ غالب مبارک علی ایڈیشن (۶)

اورنٹیل کالج میگزین لاہور

انڈین انٹی کویری (۶)

اسلامک کلچر (۳، ۴)

اقبال نامہ جہانگیری۔ معتمد خان (۱)

ابنِ بطوطہ۔ عجائب الاسفار (۱)

اصطخری۔ مسالک الممالک (۱)

ابنِ حوقل۔ المسالک والممالک (۱)

ایلیٹ وڈوسن

(تاریخِ ہند ۸ جلد)

ایجوکیشنل رپورٹس آف گورنمنٹ
آف انڈیا۔ شارپ دراچی (۵)
" " پنجاب از آرنلڈ

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (۳)

انسائیکلوپیڈیا برطانیکا (۱)

ابنِ حسن۔ سنٹرل سٹرکچر آف دی مغل ایمپائر
(دیباچہ)

بلوخمن۔ ترجمہ آئینِ اکبری (۱، ۲، ۶)

" کنٹری بیوشنز ٹو پرشین لغت (۴، ۶)

بابر نامہ (= تزکِ بابری) (۱)

بیہقی (= تاریخ بیہقی) (۱)

البیرونی (تحقیق ماللہند) (۱)

برنی (ضیا برنی = تاریخ فیروز شاہی) (۱)

بساتین السلاطین۔ ابراہیم زبیری (۱)

بدایونی۔ منتخب التواریخ (۲)

بیل۔ اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری (۳)

براؤن۔ تاریخ ادبیاتِ ایران (۶)

پنجاب میں اردو

. پروفیسر شیرانی (۱)

تاریخ شیر شاہی۔ ارادت خان
راز ایلیٹ۔ ج ۷) (۲)

تذکرہ خوش نویساں۔ غلام محمد

تاراچند (ڈاکٹر) انفلوئنس آف اسلام
آن انڈین کلچر (۶)

تفریح العبارات۔ سیل چند (قلمی شیرانی) (۲)

تزکِ جہاں گیری (۲)

تذکرہ حسینی (قلمی پنجاب یونیورسٹی) (۳)

تذکرہ میر حسن (۴، ۵)

تذکرہ سرخوش (قلمی پنجاب یونیورسٹی) (۴)

تذکرہ کریم الدین (۵)

تذکرہ عشقی (از سپرنگر صفحہ ۱۸۳) (۵)

تذکرہ غلام حسین شورش (از سپرنگر صفحہ ۱۸۲) (۵)

تذکرۃ النسا درگا پرشاد نادر (۶)

جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۹۴ (۱)

جہاں گیر از بینی پرشاد (۳)

جرنل آف انڈین ہسٹری (۶)

چہار چمن۔ چندر بھان برہمن
(قلمی پنجاب یونیورسٹی) (۲، ۳)

چمنستانِ شعرا شفیق اورنگ آبادی
(مطبوعہ) (۴، ۶)

خزانہ عامرہ۔ آزاد بلگرامی (۱، ۴، ۵)

خلاصۃ التواریخ سجان رائے
(مطبوعہ ظفر حسن) (۳، ۴)

خافی خان منتخب اللباب (۳)
خمخانۂ جاوید۔ سری رام (۴)
خورشیدِ جہاں نما (تاریخ بنگال) (۶)
خلاصۃ المکاتیب۔ سجان رائے (قلمی پنجاب یونیورسٹی) (۶)
دربارِ اکبری۔ محمد حسین آزاد (۲)
دستور العمل۔ یوسف میرک (قلمی پنجاب یونیورسٹی) شاہجہاں کے زمانے میں ۱۰۴۲ھ میں لکھی گئی (۶،۳)
ذکاء اللہ۔ تاریخ ہندستان (۱)
رزلے۔ پیپل آف انڈیا (۶)
روزِ روشن۔ صبا (مطبوعہ)
ریاض الشعرا۔ والہ داغستانی قلمی (پنجاب یونیورسٹی) (۶،۴)
ریاض الوفاق۔ ستن۔ رازسپرنگر فہرستِ اودھ) (۵،۱)
سفینۂ خوش گو۔ قلمی (پنجاب یونیورسٹی دیانکی پور لائبریری)
سرکار (سرجادوناتھ) شیواجی (۴،۶)
〃 ۔ مغل ایڈمنسٹریشن (۶)
〃 ۔ ہسٹری آف اورنگ زیب (۳)
سیر المصنفین۔ تنہا (۵)
سخن دانِ پارس۔ آزاد (۶)
شبلی (مولانا) عالمگیر پر ایک نظر (۳)
شیرنگر۔ کاسٹز اینڈ ٹرائبز آف انڈیا (۶)
شعر الہند۔ عبدالسلام ندوی (۴)
شمشیرِ تیز تر۔ مرزا غالب (۶)
طبقاتِ اکبری۔ نظام الدین (۲)
ظفر نامہ رنجیت سنگھ امرناتھ اکبری (کوہلی ایڈیشن) (۵)
عبد الحق (مولانا) مرحوم دہلی کالج (۵)
〃 〃 ۔ مرہٹی پر فارسی کا اثر (۴)
عبد الغنی (پروفیسر) پرشین لٹریچر (مغلوں سے پہلے)
عملِ صالح۔ محمد صالح (قلمی پنجاب یونیورسٹی) (۳)
عماد السعادت۔ آزاد بلگرامی (قلمی پنجاب یونیورسٹی) (۴)
فرشتہ۔ گلِ نارا براہیمی (۱)
فال آف دی مغل ایمپائر۔ کین (۳)
فتوحاتِ فیروز شاہی۔ فیروز شاہ تغلق (۶)
فرینکلن۔ تاریخِ شاہ عالم (۴)

فہرستِ قلمیات عجائب خانہ لندن (مرتبہ ڈاکٹر ریو)
فہرستِ قلمیات انڈیا آفس لائبریری
فہرستِ بیکانیر سنسکرت لائبریری (۱۱)
" قلمیات بانکی پور لائبریری
" " باڈولین لائبریری
" " - براؤن
" " پیرس - بلوشے
" " عجائب خانہ لندن - ریو
" آصفیہ لائبریری حیدرآباد
" کپورتھلہ سٹیٹ لائبریری
" پنجاب پبلک لائبریری
" اودھ لائبریریز - سپرنگر
قاموس المشاہیر (اُردو) (۴، ۵)
کایستھ درپن (ہندی) (۶)
کلکتہ ریویو (۱)
گلِ رعنا - لچھمی نراین شفیق (۱۲۰۲ھ) (قلمی پنجاب یونیورسٹی : شیرانی)
گلزار ابراہیم (تذکرہ) نواب علی ابراہیم خان (۴)
گڈ اولڈ ڈیز آف جان کمپنی - کیری (۵)
گلزارِ حال - ولی (قلمی پنجاب یونیورسٹی) (۶)

گربل - تاریخِ دکن (۱)
گریرسن - لٹریچر آف ہندستان (۲)
لی سٹرینج - لینڈز آف دی ایسٹرن کیلیفیٹ (۱)
لباب الالباب - عوفی (۱)
لارنس - ویلی آف کشمیر (۱)
لا - نرندرا ناتھ - پروموشن آف لرننگ ان انڈیا (عہدِ اسلامی) (۱، ۲، ۴، ۶)
" " " (برٹش) (۶)
لین پول - میڈیوِل انڈیا (۱)
مجمع التواریخ - پنڈت کاچرو (قلمی یونیورسٹی لائبریری) (۱)
مہاتمنی کشمیرہ منڈل گوبند رام (قلمی شیرانی) (۱)
مآثر الامرا - شاہ نواز خان (۱، ۴)
مغل پینٹنگز - پرسی براؤن (۲)
مصر بندھو ونود تاریخِ ادبِ ہندی (۲)
مجمع البحرین داراشکوہ (محفوظ الحق ایڈیشن) (۳)
مآثرِ عالمگیری (۳، ۴)
مرآۃ الخیال شیرخان (۳)

منشآتِ برہمن (۳)

ماڈرن ریویو جلد ۲۷ (۳)

مجمع النفائس۔ خانِ آرزو
(قلمی پنجاب یونیورسٹی)

مؤیّد برہان۔ آغا احمد علی (۴)

مخزن الغرائب۔ احمد علی سندیلوی
(قلمی شیرانی)

مقالات الشعرا۔ قیام الدین حیرت
راز سپر نگر فہرست اودھ صفحہ ۱۵۲ (۴، ۹)

محمڈن ایجوکیشن ان انڈیا
سید محمود، معارف اعظم گڑھ (۵)

مسلم ریویو ۱۹۲۹ (۵)

مجموعۂ نغز۔ قدرت اللہ قاسم
(شیرانی ایڈیشن) (۵)

معلومات الآفاق۔ امین الدین (۱۱۱۹ھ)
قلمی پنجاب یونیورسٹی (۶)

مثمر۔ خانِ آرزو (قلمی پنجاب یونیورسٹی) (۶)

مخزن الفوائد و قواعدِ فارسی
قلمی پنجاب یونیورسٹی (۶)

مٹھائی (جارج)، ویلیج گورنمنٹ
ان برٹش انڈیا (۱)

مرآۃ آفتاب نما۔ شاہ نواز خان
(قلمی پنجاب یونیورسٹی)

مرآۃ العالم۔ بختاور خان
(قلمی پنجاب یونیورسٹی)

نشترِ عشق، تذکرہ۔ حسین قلی خاں عشق
(قلمی پنجاب یونیورسٹی)

نہر الفصاحت قتیل (۶)

نکات الشعرا، میر تقی میر (۴، ۵)

نارنگ (سر گوکل چند)
ٹرانسفارمیشن آف دی سکھز (۵)

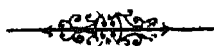
نگارنامہ منشی (قلمی پنجاب یونیورسٹی)

ہمیشہ بہار (قلمی)

ہنٹر۔ انڈین ایمپائر (۶)

ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن (رپورٹ) (۵)
۱۹۲۷

فہارس اسماء الرّجال و اسماء الکتب



اسماء الرّجال

اسمار الکتب

خاتمہ

اصلاح اور تصحیح کی پوری کوشش کے باوجود، اس کتاب میں زبان و بیان اور طباعت و کتابت کی غلطیاں باقی رہ گئی ہیں۔ غلط نامہ مرتب کرنے سے اس نقص کی تلافی کی جاتی لیکن کتاب کی نوعیت ایسی ہے کہ غلطیاں پھر بھی باقی رہ جاتیں۔ اس لئے غلط نامے کو محض تکلّف خیال کرتے ہوئے، ہنر پسندانِ عیب پوش سے استدعا کرتا ہوں کہ غلطیوں کو خود درست کرلیں اور میرے لئے دُعا فرمائیں ؎

مرا بہ سادہ دلی ہائے من تواں بخشید
خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم

تصویریں اور عکس چیئرمین لائبریری کمیٹی خان بہادر مولوی محمد شفیع صاحب کی عنایتِ خاص سے، پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی مملوکہ قلمی کتابوں سے حاصل کیے گئے ہیں۔ اس کے لئے میں اُن کا ممنون ہوں۔

کارپردازانِ انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) دہلی اور کارکنانِ مطبع مفید عام لاہور بھی میرے دلی شکریے کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے اس کتاب کی طباعت کی تکمیل میں میرا ہاتھ بٹایا۔

دامنِ کوہ۔ مانسہرہ ضلع ہزارہ
۱۰ ستمبر ۱۹۴۳ء

ہیچ مدان
سیّد عبداللہ